قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in
مئی 2022 قیمت ₹15
ماہنامہ
اُردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچوں کا کتب خانہ

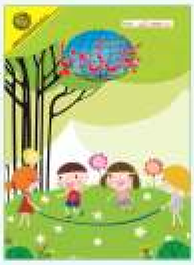

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

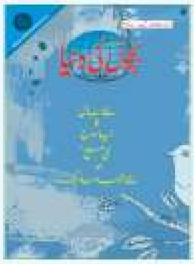

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:24، شمارہ:05، مئی 2022

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages: 100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجدیار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط والتفات قارئین کے خطوط 5

زبان و تعلیم
ابتدائی مرحلے میں اردو زبان کی تدریس
مقاصد، مسائل اور امکانات مظفر اسلام 7

ادب: زاویے اور جہات
عشق... کل اور آج محمود شیخ 9
سنت شاعرہ: بہینا بائی بانو سرتاج 14

مقدمۂ دیوان فانی گورکھپوری
ایک تجزیاتی مطالعہ محسن علی 16
منظر کاظمی کے افسانوں میں سماجی
اور سیاسی حالات کی عکاسی احسان عالم 20
1950 کے بعد اردو نظم کا رجحان محمد شاہد 23
قیصر تمکین کی افسانہ نگاری فیضان الحق 27

لسانیات
کیتھی رسم الخط کا نوحہ زبیر احمد بھاگلپوری 30

خراج عقیدت
مجروح کی غزل کے چند امتیازی پہلو غلام نبی کمار 32

شمع عرفان
گیتا کا اردو ترجمہ
انور جلالپوری کے حوالے سے سعود عالم 35

لعل و گہر
جاں نثار اختر وسیم فرحت 38

نگر نگر اردو
سمری بختیار پور کا علمی، ادبی منظرنامہ محمد خوشتر 42

سلسلہ صحافت
مشرقی علوم کے فروغ میں
منشی نول کشور کی خدمات شکیل احمد 45
اودھ کا بابائے صحافت: منشی نول کشور سفیان احمد انصاری 47

جنھیں ہم نے بھلا دیا
کیرالہ کی واحد ناول نگار زلیخا حسین کے پی شمس الدین 51

خصوصی گفتگو
زبانیں محبت کا درس دیتی ہیں سعید رحمانی 53

نیا آسماں نئے ستارے
دلیپ سنگھ بحیثیت مزاح نگار محمد امین نجار 55

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ ادارہ 57

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں ادارہ 67

ہماری بات

اردو صحافت نے دوسوسال مکمل کر لیے ہیں۔ اس موقعے پر اہل اردو کے درمیان جشن کا ماحول ہے۔ جلسے، کانفرنسیں اور سمینار منعقد ہو رہے ہیں جن میں اردو صحافت کی شاندار تاریخ، عظیم صحافیوں کے کارنامے اور اردو صحافت کی موجودہ صورتِ حال پر اہل دانش اپنے خیالات کا اظہار بھی کر رہے ہیں اور ماضی کی روشنی میں اردو صحافت نے جو سفر طے کیا ہے وہ یقیناً قابل رشک ہے اور اس اعتبار سے بہت معنویت کا حامل ہے کہ عصری تقاضوں سے بھی ہماری اردو صحافت ہم آہنگ ہے۔ موضوعات کی سطح پر بھی تنوع ہے اور جن موضوعات پر قومی صحافت میں تحریریں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی اردو اخبارات میں مضامین شائع ہو رہے ہیں، خاص طور پر اقتصادیات اور تجارت کے تعلق سے بھی اردو اخبارات میں مضامین کی اشاعت ایک خوش آئند پہلو ہے۔

1822 میں 'جام جہاں نما' سے اردو صحافت کا آغاز ہوا تھا اور تب سے اب تک اس کے 200 سال پورے ہو چکے ہیں۔ ان دو صدیوں میں اردو صحافت بہت سے نشیب و فراز سے گزری اور اس صحافت نے بہت سے نئے امکانات بھی تلاش کیے۔ اب اردو صحافت تیسری صدی میں داخل ہو رہی ہے۔ اس لیے اس موقعے پر ماضی کے تجربات و مشاہدات سے فائدہ اٹھا کر مستقبل کے لیے کوئی ایسا لائحۂ عمل تیار کرنے کی ضرورت ہے جس کے تحت اردو صحافت کی تیسری صدی کا سفر بھی کامیابی کے ساتھ جاری و ساری رہے۔ یہ موقع ایک لمحۂ احتساب بھی ہے کہ فی زمانہ اردو صحافت کہاں کھڑی ہوئی ہے، معاصر زبانوں کی صحافت کے درمیان اس کا کیا مقام ہے۔ اس میں کتنی دور تک چلنے کی ہنوز توانائی موجود ہے اور اس کا مستقبل کیا ہے؟

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اردو اخبارات و رسائل خود کو جدید تکنیکی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، طباعت سے لے کر آن لائن تک اردو صحافت نے اپنے وجود کا احساس کرایا ہے، اور اپنے مواد و پیشکش کے لحاظ سے بھی اردو صحافت نے کافی ترقی کی ہے، خاص طور پر عالمی، قومی، موضوعات کے حوالے سے اردو صحافت کا رویہ نہایت منصفانہ ہے لیکن یہ عجیب سی صورت حال ہے کہ اردو کے اخبارات تو معتد بہ تعداد میں موجود ہیں مگر ان کے قارئین کا دائرہ بہت محدود ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اخبارات کی تعداد میں تو اضافہ ہو رہا ہے مگر قارئین کی شرح گھٹ رہی ہے۔ اردو والوں کے لیے یہ بھی ایک لمحۂ فکریہ ہے۔

اردو صحافت کے دوسو سالہ جشن کے موقعے پر جب ہم اردو کی ادبی صحافت یا اردو کے ادبی مجلات کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ادبی رسائل و مجلات کا دائرہ بھی دن بہ دن سکڑتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ انھیں خریدنے والے بھی کم ہیں اور پڑھنے والے بھی کم ہیں۔ حالانکہ اب سے چند دہائیوں قبل یہ صورت حال قطعی نہ تھی۔ اردو کے ادبی رسائل بڑی شان و شوکت کے ساتھ نکلتے تھے اور بڑی تعداد میں خریدے اور پڑھے جاتے تھے۔ نیا دور، شب خون، شاعر، بیسویں صدی، شمع، آجکل جیسے رسائل خوب خریدے اور پڑھے جاتے تھے، لیکن اب گزشتہ دہائیوں کے بہت سے مقبول ادبی رسائل میں سے زیادہ تر یا تو بند ہو چکے ہیں یا پھر اپنی آخری سانسیں گن رہے ہیں۔ ایسے حالات میں باقی ماندہ ادبی رسائل کے معیار پر گفتگو کرنا ہی بیکار ہے، کیونکہ معیار سے زیادہ اس وقت اہمیت اردو رسائل کے تحفظ اور بقا کی ہے کیونکہ ادبی صحافت جس تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہو رہی ہے، اسے دیکھ کر کبھی کبھی دل میں یہ ڈراؤنا خیال آنے لگتا ہے کہ کہیں اگلی چند دہائیوں میں یہ دائرہ کہیں اور بھی نہ سکڑ جائے۔ لہٰذا اس موقعے پر اردو والوں کو چاہیے کہ وہ اردو اخبارات و رسائل کے قارئین کی تعداد کو لے کر فکر مند ہوں اور اخبارات و جرائد خریدنے اور پڑھنے کی مہم چلائیں۔ ساتھ ہی ادبی رسائل کی طرف بھی دھیان دیں تاکہ ادبی رسائل کی مدھم شمع روشن رہے۔ یہ کام اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔ اگر اردو زبان جاننے والے لوگ کم از کم ایک اخبار اور رسالہ خریدنے کا عزم کر لیں تو نہ صرف یہ کہ بہت سے اخبارات و رسائل بند ہونے سے بچ جائیں گے بلکہ مزید نئے رسائل و جرائد وجود میں آجائیں گے، اس طرح اردو کی اخباری اور ادبی صحافت کو زندگی مل جائے گی۔ اس لیے آج ہی ہم خود سے عہد کریں کہ اردو کا ایک اخبار اور ایک رسالہ اپنے گھر پر جاری کروائیں گے اور فوری طور پر اس پر عمل بھی شروع کریں گے۔ دیکھیے گا کہ کتنی جلدی اس کے بہترین نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط و التفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندہی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندہی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہنامہ 'اردو دنیا' اپریل 2022 کا شمارہ پڑھنے کا موقع ملا۔ پہلے کی طرح معیاری ہونے کے علاوہ تعلیم میں نفسیاتی مسائل کی طرف غور کرنے کی تجویز کی گئی ہے، وہ قابل ستائش ہے۔ مصنوعی ذہانت کے اس دور میں انفرادی خصوصیات کو مدنظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ اب جب کہ حکومت ہند نے نئی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا ہے، تو اب یہ ضرورت بن جاتی ہے کہ ہم Diversity کو ذہن میں رکھیں۔ کچھ دنوں پہلے کی بات ہے کہ میں ایک مضمون پڑھ رہا تھا۔ مضمون Brain Drain پر لکھا گیا تھا۔ اس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ آخر طلبا ملک سے باہر پڑھنے کیوں جاتے ہیں۔ اعلیٰ قسم کے دماغ باہری ممالک کو ترقی کی راہوں پر ڈالتے ہیں اور اپنا ملک پستیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ خود ایک طالب علم ہونے کے ناطے سے جب میں نے اس پر غور کیا تو بہت ساری وجوہات سطح پر نمودار ہوئیں۔ مگر ان میں سب سے بڑی وجہ جو میرے نزدیک اس کا اصلی محرک ہے، وہ ہے انفرادی یا نفسیاتی خصوصیات کو نظرانداز کرنا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا تعلیمی نظام دنیا کی پہلی صفوں میں ہو تو ہمیں اول کلاس سے ہی اس پر عمل کرنا ہوگا۔ اساتذہ کو بھی اس ضمن میں تیار کرنا ہوگا۔ امید ہے کہ مدیر اعلیٰ اب Brain Drain کے موضوع پر کوئی مضمون لے کر آئیں گے تاکہ اس ناسور سے نجات ملے اور ہمارا بھارت ترقی کرتا رہے۔

سید مصطفی احمد: حاجی باغ، سرینگر، جموں وکشمیر، انڈیا

اردو دنیا ہر ماہ ہر سال مل رہا ہے۔ قومی اردو کونسل کی اردو خدمات قابل صد مبارکباد ہیں۔ اردو دنیا کے مطالعے سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ماہ مارچ کے خطوط میں جناب حبیب کیفی جودھپور نے جو مشورہ دیا ہے کہ اردو دنیا کے صفحات میں تخلیقی ادب کے لیے بھی گنجائش نکالنی چاہیے موصوف نے دہلی سے شائع ہونے والے علمی شہرت یافتہ جن رسائل کا تذکرہ کیا ہے ان میں ناچیز کی بھی شعری تخلیقات شائع ہوا کرتی تھیں۔ ہماری نئی نسل مطالعے سے کافی دور ہے۔ دوسری بات اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے جو ادارے کام کر رہے ہیں ان سے بھی ہماری نئی نسل متعارف نہیں ہے۔ مختلف ریاستوں میں اردو اکادمیاں اردو کی خدمات انجام دے رہی ہیں، ملک کے دور دراز علاقوں میں عوام اس سے بے خبر ہیں۔ مارچ کے شمارے میں ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کا مضمون 'املا، ہجا، ہکاری، مصمتے اور تشدید کا عمل' پسند آیا، انھیں دلی مبارکباد۔ موصوف میرے ساتھ مہاراشٹر اردو اکادمی میں رکن رہ چکے ہیں۔ محمد نوشاد کے مضمون 'خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری ایک نئی قرأت کی کوشش' میں آتش کا صفحہ 29 پر یہ شعر غالباً مصرعہ اولیٰ وثانی میں آگے پیچھے ہوا ہے۔

زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا

میرے خیال سے یہ شعر یوں ہے۔

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

مصطفیٰ جمیل: مومن پورہ، بالاپور، ضلع اکولہ، مہاراشٹر

سورکوکیلا، لتا منگیشکر کی تصویر اور دیدہ زیب ٹائٹل صفحے کے ساتھ اردو دنیا کا اپریل 2022 کا شمارہ بروقت موصول ہوا۔ یوں تو دیگر محتویات بھی معیاری اور وقیع ہیں، لیکن لتا منگیشکر کے سانحہ ارتحال پر مبنی گوشہ معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی دلچسپ ہے۔ لتا دیدی کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو پر محیط متذکرہ باب یقیناً ان کے مداحوں کے ذریعے پسند کیا جائے گا۔

زبیر احمد بھاگلپوری: پٹنہ، بہار

اردو دنیا مارچ 2022 کا شمارہ موصول ہوا۔ زبان و تعلیم کے تحت سید یحییٰ نشیط کا 'املا، ہجا، ہکاری، مصمتے اور تشدید کا عمل' مفید اور معلوماتی مضمون ہے۔ ادب کے تحت خواجہ حیدر آتش کی شاعری خوب سے خوب تر ہے۔ دیگر مضامین بھی اپنے منفرد اسلوب اور نثر پاروں کے نادر نمونوں کے باوصف بڑی اہمیت کے حامل ہیں جو ہر قاری کے لیے ایک قندیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وفیات کے تحت عظیم شخصیات کی رحلت پڑھ کر دکھ ہوا۔ ہماری بات میں عقیل احمد صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ ادبا، شعرا کو وقت کے اہم مطالعات پر کان دھرنے کی ضرورت ہے۔ جام وسبو، گل وبلبل اور زلف ورخسار یا موضوعاتی تکرار میں الجھنے کے بجائے موضوعاتی سطح پر وسعت پیدا کی جائے اور نئے موضوعات تلاش کیے جائیں تاکہ اردو زبان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو۔ اپنی زبان کی خدمت اور اس سے سچی محبت کی شاید یہی نشانیاں ہوتی ہیں۔ تعارف وتبصرہ بھی بڑا قیمتی کالم ہے، اسے برقرار رکھا جائے۔ آپ کی بے لوث خدمت کو سلام۔

معین الدین شمسی: گریڈیہ، جھارکھنڈ

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کررہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: ➢ editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in

مظفر اسلام

ابتدائی مرحلے میں اردو زبان کی تدریس

مقاصد، مسائل اور امکانات

کسی بھی زبان کا تحفظ اور اس کا فروغ کما حقہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ابتدا تا انتہا اس کی تدریس و تعلیم کا باقاعدہ نظام ہو جس سے وابستہ ہوکر نئی نسل اس زبان میں مہارت حاصل کرے۔ یہ ایک کلی ضابطہ ہے جو اردو زبان پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ اگر ہم حقیقی معنوں میں اردو کا فروغ چاہتے ہیں، تو اس زبان کی تعلیم و تعلم کا سلسلہ نہ صرف جاری رکھنا ہوگا بلکہ اسے جدید دور کے تدریسی اصولوں اور تقاضوں سے ہم آہنگ بھی کرنا ہوگا تا کہ ہمیں وہ نتیجہ حاصل ہو، جس کی آج کے زمانے میں ضرورت ہے۔ ابتدائی سطح پر اردو زبان کی تدریس کے مقاصد بہت اہم ہیں اور اگر انھیں حاصل کرلیا جائے تو اس کا فائدہ نہ صرف طلبا و طالبات کو ہوگا بلکہ زبان کے فروغ اور اس کی ترویج کے نقطۂ نظر سے یہ پہلو بہت نفع بخش ہے۔

ابتدائی سطح پر اول تا آٹھویں درجات میں اردو زبان کی تدریس ہوتی ہے۔ یوں تو ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک اور مختلف ریاستوں میں اردو زبان کی مختلف دستوری حیثیتوں کی وجہ سے اس زبان کی تدریس کے مقاصد بھی مختلف ہوسکتے ہیں، مگر شروعاتی دور میں اردو کی تدریس کے مندرجہ ذیل عام مقاصد ہوتے ہیں:

(1) مختلف آوازیں سن کر انھیں دہرانا (2) سنی ہوئی بات کو اسی طرح دہرانے کی صلاحیت پیدا کرنا (3) اردو زبان کے الفاظ کو لکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کرنا (4) مکتوبہ عبارت کو درست پڑھنا اور سمجھنا (5) اردو زبان میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرنا۔

ابتدائی سطح پر اردو زبان کی تدریس کے یہ عمومی مقاصد ہیں، یعنی طالب علم چاہے مادری زبان کے طور پر اردو کی تعلیم حاصل کر رہا ہو یا ثانوی زبان کے طور پر یا تیسری زبان کے طور پر یا طالب علم ایسا ہو جو کسی اور زبان کے ذریعے اردو زبان سیکھ رہا ہو۔ بنیادی طور پر ہر زبان سیکھنے کے ابتدائی مراحل یہی ہیں اور اسی طرح کسی بھی زبان کو سیکھنے، سمجھنے اور لکھنے کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔

ان عام مقاصد کے ساتھ کچھ اور مقاصد بھی ہیں جن کے بغیر تدریسِ اردو کا ہدف حاصل نہیں ہوسکتا۔ درجہ اول تا آٹھویں کے طلبا کے لیے درج ذیل چار مقاصد کا حاصل کرنا نہایت ضروری ہے: اردو بولنا، اردو پڑھنا، اردو لکھنا، اردو سمجھنا۔ چونکہ بچہ جب اسکول میں داخل ہوتا ہے تو وہ بولنے کی کچھ نہ کچھ صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے پاس چھوٹا سا ذخیرۂ الفاظ بھی ہوتا ہے اس لیے اردو بولنا سکھانے میں کسی خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، البتہ اس صلاحیت کو بڑھانے میں اساتذہ کو اس کی مدد اور رہنمائی کرنی ہوگی۔ بولتے وقت آواز صاف ہونی چاہیے اور الفاظ کی صحت کا خیال رکھنا چاہیے۔ صحیح تلفظ پر پوری توجہ دینی چاہیے، بچپن میں جس لفظ کو جیسے ادا کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے وہ تا عمر برقرار رہتی ہے اس لیے تلفظ کی درستگی کا اہتمام نہایت ضروری ہے، طالب علم تو یہ کرے ہی، استاذ بھی اس پہلو پر خاص توجہ دے۔ اسی طرح بولتے ہوئے جملوں اور فقروں کے اتار چڑھاؤ کو بھی ذہن میں رکھنا ہے۔ لفظوں کی ادائیگی میں تکلف اور تصنع سے اجتناب کرتے ہوئے فطری انداز میں بولنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں بولنا سکھانے کے مختلف وسائل پائے جاتے ہیں، استاذ خود بول کر سکھانے کے علاوہ دوسرے سمعی و بصری آلات کا استعمال بھی کریں۔ آج کے بچے چونکہ انٹرنیٹ، اسمارٹ فونز کے عادی ہو چکے ہیں اس لیے انھیں ان آلات کے ذریعے زبان سکھانے کا عمل کارگر ہوسکتا ہے۔

ابتدائی منزل پر زبان کی تدریس کا سب سے اہم مرحلہ پڑھنا سکھانا ہوتا ہے۔ استاد سب سے پہلے پڑھنا سکھانے کی طرف توجہ دیتا ہے۔ پڑھنا سکھانے میں شروع سے ہی تلفظ پر توجہ دینی چاہیے اور بچوں میں اس کی مہارت پیدا کرنی چاہیے کہ وہ الفاظ، فقروں اور جملوں کو درست تلفظ کے ساتھ پڑھیں۔ شروع شروع میں اعراب کے ساتھ پڑھنے کی مہارت پیدا کرنی چاہیے اور جب لفظوں کی اچھی طرح پہچان ہوجائے تو بغیر اعراب کے الفاظ اور جملے پڑھنے کا عادی بنایا جائے۔ شروع کے درجات میں بچے کی ذہنی سطح اور قوتِ نطق کا خاص خیال رکھنا چاہیے اور نہایت مناسب لب و لہجے میں الفاظ کی ہجے بتانی چاہیے تا کہ وہ آگے چل کر درست اور مناسب لب و لہجے میں بلند خوانی یا خاموش مطالعہ کرسکے۔

ابتدائی سطح پر جو سب سے مشکل مرحلہ ہوتا ہے وہ بچوں کو اردو لکھنا سکھانا ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں ضروری ہے کہ حروف کی مختلف اشکال، ان کے نقوش، نقطوں اور شوشوں کی مشق اور شناخت ہونے کے بعد باقاعدہ لکھنا سکھایا جائے۔ مدرس کو چاہیے کہ وہ بچے کو حروف کی صحیح شناخت کے ساتھ بہت توجہ اور احتیاط کے ساتھ لکھنا سکھائے، اس لیے کہ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ اگر بچے کو شروع میں کوئی لفظ غلط لکھنے کی عادت ہوگئی تو پھر وہ پوری زندگی اس لفظ کو غلط ہی لکھتا ہے اور اس کی اصلاح مشکل ہوجاتی ہے۔ طلبا کو لکھنا سکھاتے وقت خاص طور پر شوشے، دائرے اور نقطے کی صحیح جگہ کا دھیان رکھنا چاہیے۔ ایک لفظ سے دوسرے کے درمیان واضح فاصلہ ہونا چاہیے۔ جملوں میں لفظوں کی ترتیب اور سطور کی درستگی کا خیال رکھنا چاہیے۔ مرکب لفظ لکھتے وقت اس کی ملاوٹ کا خیال رکھنا چاہیے، کس مرکب لفظ کو ملا کر لکھنا ہے اور کس کو الگ کرکے اس کے بارے میں استاذ ابتدائی دور میں ہی طلبا کو بتا دے تو بہت اچھا ہوگا۔ تحریر میں صحت اور صفائی کا خاص دھیان رکھنا چاہیے اور ان ضروری امور کے ساتھ جملوں میں رموز و اوقاف کا خیال بھی لازم ہے۔

ابتدائی سطح پر بولنا، پڑھنا اور لکھنا سکھانے کے بعد مرحلہ آتا ہے سمجھنے کا یعنی طالب علم کے اندر یہ صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ عبارت کو پڑھنے کے بعد سمجھ سکے اور اس کے بعد اس میں کہی یا لکھی گئی بات کو اپنی زبان و الفاظ میں ادا کرسکے۔ پرائمری درجات میں تفہیم عبارت کا معاملہ زیادہ مشکل نہیں ہوتا کیونکہ اس مرحلے میں حروف اور پھر الفاظ کی شناخت، اس کے بعد فعل اور اسم کی پہچان، مذکر اور مؤنث کی شناخت، اسی طرح متضاد اور مترادف، واحد اور جمع، صفت اور موصوف وغیرہ سے آگاہی بخشنا مقصود ہوتا ہے، البتہ ساتویں آٹھویں کلاس تک پہنچتے پہنچتے عبارتیں تھوڑی لمبی ہونے لگتی ہیں اور انھیں سمجھنا سمجھانا اہم ہوجاتا ہے۔ پہلے تو لفظ اور جملوں کی ساخت، ان کے استعمال کی سمجھ پیدا کرانی چاہیے۔ الفاظ کو صحیح ترتیب کے ساتھ بیان کرنا چاہیے، سوالات اور ان کے جوابات کی تفہیم اور پہچان میں مہارت پیدا کرانی چاہیے۔ اظہار خیال کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب بھی اسی مرحلے میں کرانا ضروری ہے۔ نئے الفاظ، فقروں، محاورات، ضرب الامثال اور کہاوتوں کا ایک

حد تک شعور بھی اسی منزل میں ہوجانا چاہیے۔ کیونکہ ابتدائی سطح کے آخری درجات کا اثر ثانوی سطح کے اولین درجات میں بھی ہوتا ہے اور یہ زبان کے شعور کی دوسری منزل سمجھی جاتی ہے۔

شروعاتی مرحلے میں اردو زبان کی تدریس کے ان چار بنیادی عناصر کا مختصر جائزہ لینے کے بعد واضح طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان صلاحیتوں کے فروغ کے بعد طلبا میں اردو بولنے، پڑھنے لکھنے اور سمجھنے کی اتنی استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ہم جماعتوں کے درمیان بحسن وخوبی تحریر وتقریر دونوں ذریعے سے اظہار خیال کرسکتے ہیں اور ابتدائی درجات میں جو لسانی مہارتیں، مشقیں ادھوری اور نامکمل رہ گئی ہوں، انھیں آخری درجات تک پختہ کرسکتے ہیں۔

اگر طالب علم کو اس انداز سے پڑھنا، لکھنا اور سمجھنا سکھایا جائے تو یقیناً اس طرح اسے ابتدائی سطح پر ہی اردو زبان میں مہارت حاصل ہوجائے گی، پھر آئندہ کے تعلیمی مراحل میں وہ نہ صرف اس زبان میں اپنی استعداد کو مزید مضبوط کرسکتا ہے بلکہ وہ اس زبان کے ذریعے دوسرے بہت سے علوم بھی بہ آسان حاصل کرسکتا ہے۔ اس طرح تعلیم حاصل کرنے سے بچے کا ذہن اتنا تیز ہوجاتا ہے اور قوتِ اخذ و اکتساب اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ دوسری زبانیں بھی بہت جلدی سیکھ سکتا ہے اور اس طرح وہ بہ تدریج متعدد زبانوں کا ماہر بن سکتا ہے۔

یہ تو بات ہوئی اردو زبان کی تدریس کے طریقے اور مقاصد کے حوالے سے، لیکن اگر ہم اردو زبان کی تعلیم کے حوالے سے موجودہ زمینی صورت حال کا جائزہ لیں تو ہمیں افسوسناک حقائق کا علم ہوتا ہے۔ عموماً اسکولی سطح پر اردو زبان کی تعلیم کے اسلوب اور مواد کی تیاری میں تدریس کے مذکورہ طریقوں کا خیال نہیں رکھا جاتا جس کی وجہ سے طلبا اس طرح فائدہ نہیں اٹھا پاتے جو ضروری ہے بلکہ ان تمام درجات کو پاس کرنے کے بعد بھی اردو الفاظ کی شناخت، سمجھ اور انھیں صحیح موقع ومحل پر استعمال کرنے پر وہ قادر نہیں ہوتے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ عموماً گریجویشن، بی ایڈ اور ایم اے کے طلبا بھی زبان کا صحیح ادراک نہیں رکھتے اور اگر ان سے لکھنے بولنے کو کہا جائے تو وہ بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ اردو زبان میں تدریس کی کوئی جامع تکنیک نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اردو زبان کی تدریس کے بنیادی اصولوں کو واضح کیا جائے۔ این سی ای آرٹی نے اس سمت میں کچھ اقدامات کیے ہیں اور بی ایڈ اور ڈی ایڈ میں اردو تدریس کے لیے درسی کتابیں تیار کروائی گئی ہیں، مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ کتابیں آسانی سے دستیاب نہیں ہیں، خصوصاً اردو زبان کی کتابیں بروقت نہیں مل پاتیں۔ کسی بھی زبان کی تدریس کے سلسلے میں ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ درس وتدریس کے طریقۂ کار اور تکنیکوں میں لگاتار تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے، اس لیے ہم تدریس کے قدیم طریقوں پر انحصار نہیں کرسکتے ہمیں جدید تر اصولوں اور طریقۂ کار کی دریافت اور انھیں اپنانے پر توجہ دینی ہوگی۔ دوسری زبانوں کی طرح اردو کے تدریسی مواد میں بھی ہمیں نیاپن لانا چاہیے اور طلبا کو جدید اصولِ تدریس اور تکنیک کے ذریعے پڑھانا اور سکھانا چاہیے۔ اردو اساتذہ تدریس کی جدید تکنیک سے عام طور پر ناواقف ہوتے ہیں، جبکہ آج ابتدائی سطح پر زبانوں کی تدریس کی نت نئی تکنیکیں سامنے آچکی ہیں، لسانیات اور تعلیم کے ماہرین ومحققین تدریس کا نیا نیا اسلوب دریافت کررہے ہیں، مگر اردو اساتذہ آج بھی روایتی انداز میں ہی اردو پڑھاتے ہیں، زبان کی تدریس کے لیے جدید معاون اشیا مثلاً: لینگویج لیب، پروجیکٹر، آڈیو ویڈیو نظام وغیرہ جو طلبہ وطالبات میں سبق کو دلچسپ بناتے ہیں، اردو اساتذہ عموماً ان سے نابلد ہوتے ہیں۔

ابتدائی مراحل میں اردو کی تدریس میں ایک اہم مسئلہ اردو زبان کی ساخت وبناوٹ سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر زبان دوسری زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ ہر زبان کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اس لیے ہر زبان کی تدریس کا طریقہ بھی مختلف ہے، اسکولوں کی سطح پر مشاہدہ یہ ہے کہ حکومت ہند کے سہ لسانی فارمولے کے تحت قومی زبان ہندی، انگریزی اور اردو یا دگر علاقائی زبانیں سب ایک ہی اسلوب میں پڑھائی جاتی ہیں، جو بجائے مفید ہونے کے نقصان دہ ہیں۔ ایک اہم بات اور یہ ہے کہ اردو زبان میں ہم شکل حروف کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن میں محض نقطوں کی وجہ سے فرق ہوتا ہے۔ اساتذہ کے لیے ضروری ہے کہ نقطوں کے فرق سے حروف میں واقع ہونے والے فرق کو طلبا کو اس طرح سمجھائیں کہ ان کے دماغ میں کوئی الجھن نہ رہے اور وہ ان کے تلفظ میں غلطی نہ کریں۔ ہمارے اسکولوں سے زبان کی تدریس کا ایک اہم طریقہ املا نویسی کا ختم ہوتا جارہا ہے، جس کی وجہ سے طلبہ وطالبات اردو املا کی مبادیات سے بھی ناواقف ہوتے ہیں اور وہ آگے چل کر املا کی فاش غلطیاں کرتے ہیں۔ بہت سے ریسرچ اسکالر حتی کہ پروفیسر اور مشہور ادیب وقلم کار بھی املا کی ایسی ایسی غلطیاں کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، لہٰذا ابتدائی تعلیم کے دوران لفظوں کے درست تلفظ اور صحیح املا پر بھرپور توجہ دینا نہایت ضروری ہے اور یہ زبان سیکھنے کے عمل کا بنیادی جز ہے۔

عام طور پر ہمارے ملک کے اسکولوں میں اردو کی تعلیم وتدریس کا نظام خستہ ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں، ان میں سب سے بڑی وجہ اردو کی تدریس کے لیے ضروری تعداد میں قابل، باصلاحیت اور تربیت یافتہ اساتذہ کا فقدان ہے، جب تربیت یافتہ اساتذہ ہی نہ ہوں تو پھر اردو ہی کیا، کسی بھی زبان کی تدریس ناممکن ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تدریس کے پیشے سے تعلق رکھنے والے یا اس شعبے میں آنے کی دلچسپی رکھنے والے اردو داں حضرات کو بطور معلم اردو تربیت حاصل کرنے کی طرف راغب کیا جائے، کیونکہ ایسا نہیں ہے کہ تربیت یافتہ اردو اساتذہ کے لیے مواقع کی کمی ہے بلکہ تجربہ شاہد ہے کہ اردو مضمون سے تربیت حاصل کرنے والے امیدواروں کے لیے دگر کئی مضامین سے زیادہ مواقع ہیں، کیونکہ اردو مضمون اختیار کرنے والوں کی تعداد کم ہوتی ہے اور عموماً یہ لوگ ایک خاص طبقے سے ہی آتے ہیں۔ پرائمری سے لے کر ہائر سکینڈری تک کا سرکار نے بہترین اردو نصاب تیار کرایا ہے، لیکن ان کی تدریس کماحقہ اس لیے نہیں ہو پاتی کہ بیشتر اردو اساتذہ اس نصاب کو پڑھانے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً انھیں تدریس کا نہ تجربہ ہوتا ہے اور نہ وہ تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ تجربہ تو خیر پڑھاتے پڑھاتے ہوگا مگر تربیت ہر حال میں ضروری ہے، خصوصاً زبان کی تدریس کے لیے غیر تربیت یافتہ استاذ کا انتخاب کسی بھی اعتبار سے موزوں نہیں، بلکہ طلبا کے لیے سراسر نقصان دہ اور ان پر ظلم ہے۔ اسی طرح ایسے طلبہ وطالبات جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے، جو دوسری یا تیسری زبان کے طور پر اردو پڑھ رہے ہیں، انھیں اردو پڑھانا بھی ایک بڑا چیلنج ہے۔ ضروری ہے کہ ایسے طلبہ وطالبات کے لیے خصوصی نصاب تعلیم تیار کیا جائے اور خاص طور سے انھیں سامنے رکھ کر اساتذہ کو تربیت دی جائے۔

اردو زبان کی تدریس کو مؤثر اور مفید بنانے میں ایک اہم وجہ بچوں کے اپنے گھر کا ماحول بھی ہے۔ جس ماحول میں اس کی پرورش ہورہی ہے وہاں اردو زبان کے حوالے سے مثبت اور حوصلہ افزا اندازِ فکر پایا جانا ضروری ہے۔ بچوں کے والدین انھیں اردو کی تدریس کے لیے بھی اسی طرح تیار کریں جیسے وہ انگریزی یا دوسری کسی بھی زبان یا مضمون کے حوالے سے انھیں ترغیب دیتے اور تیار کرتے ہیں۔ عام طور پر ہمارے یہاں اردو کے حوالے سے افسردہ رویہ پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے بچے بھی اس زبان کے سیکھنے میں اس دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کرتے جو کرنا چاہیے۔

■

Dr. Mozaffar Islam
Asst. Professor Education Manuu College of Teacher Education. Laheriasarai
Distt.: Darbhanga- 846002 (Bihar)
Email: mislam1manuu@gmail.com

محمود شیخ

عشق... کل اور آج

کائنات کی ہر شے کا مزاج تخلیقی ہے، تخریبی نہیں۔ اگر تخلیق نہ ہوتی تو کائنات اور انسان کا وجود بھی نہ ہوتا۔ دنیا میں ہر دم کچھ نہ کچھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ہم اسے تغیر سمجھتے ہیں اور یہ تغیر ہی تخلیق کا باعث ہے۔مہاتما بدھ کے مطابق ''کوئی شے مستقل نہیں تغیر ہی تغیر ہے اور یہ تغیر اور عارضیت ہی الم ہے اور جو شے الم ہے وہ ذات نہیں ہوسکتی۔'' اس حقیقت کو علامہ اقبال کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

جدید سائنس کے مطابق ہر شخص کا جسم ایک سو کھرب خلیات کا مجموعہ ہے اور ہر منٹ میں بیس کروڑ خلیات وجود میں آتے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی شے مستقل نہیں۔انسان بھی نہیں!

سماج انسانی کردار و شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ لوگوں کے کردار بدلتے ہی زبان و بیان میں بھی تغیر واقع ہوتا ہے۔انسان کے ذہن و دل پر معاشیاتی نقد ونظر کا فسوں چھایا ہوا ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے شخص کو کاروباری آرگن کی طرح دیکھتا ہے۔جب تک اسے کوئی مادّی اور دنیاوی فائدے کی امید نہ ہو دوستی اور رفاقت سے دور رہنا ہی پسند کرتا ہے۔محبت اور خلوص کا جذبہ مفقود ہوا۔زبان چونکہ انسانی اعمال و افعال کی ترجمان ہے۔اس لیے انسان خود کو تاویلات عقلی کے ذریعے درست ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسا لہجہ و بیان اختیار کرتا ہے جو اس کے خیالات کو معتبر ثابت کر سکے۔ سماجی زندگی میں عوام کے ساتھ ہونے والی زیادتیاں بھی غیر شعوری طور پر زبان و بیان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔عوامی بول چال کے علاوہ زبان کی فطری سمجھ اور شعور میں بھی تفریق واقع ہوتی ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ جب دماغ پر زیادہ دباؤ پڑتا ہے اور آدمی پریشان ہوجاتا ہے تو اس کا دماغ فیل نہیں ہوتا بلکہ ہارٹ فیل ہوجاتا ہے۔کمزور دل والے افراد سے کوئی ایسی بات نہیں کہی جاتی جس سے اس کے دل پر چوٹ لگتی ہو۔اس لیے ہم ایشیائی لوگوں کا یہ سوچنا کہ دل ہمارے تفکرات کا مخزن ہے، درست ثابت ہوتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ دل پسند چیزیں دماغ پسند بھی ہوں۔ دل ربا، دل آویز، دلکش، دل پذیر اور دل آرا صورتوں کا بیان صرف دیارمشرق ہی میں پایا جاتا ہے۔ ہندی فلسفے کے مطابق جذبے اور فکر کا مرکز دل ہے لیکن جدید سائنٹفک ذہن صرف انسانی دماغ کا قائل ہے اور دل کی تمام صورتوں پر اختیار حاصل کرنا چاہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج تمام دنیا میں بجائے محبت اور خلوص کے تکبر، غرور اور طاقت کا نشہ خود ساختہ دانشور اور مفکرین کے ذہن پر چھایا ہوا ہے۔جس نے فکر وفہم کی جذباتی اور ایمائی کیفیتوں کو تاویلاتِ عقلی کے ذریعے غیر اہم اور نامعتبر قرار دے کر بے حس و بے جان اور بے بنیاد شعور تخلیقیت سے آشنا کیا ہے۔جب کہ ماحصل Use and through کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

آدی گروشری شنکرآچاریہ کے نزدیک:

''عقل کو کبھی اول درجہ حاصل نہیں رہا۔اس کی حیثیت صرف ثانوی ہے۔ آخری صداقت صرف عقل سے معلوم نہیں ہوسکتی۔ ایک ماہر بحث اگر ایک چیز کو معقول ثابت کرتا ہے تو دوسرا اس کو باطل کردیتا ہے اور وہ جو کچھ صحیح ثابت کرتا ہے اس کو بھی ایک دوسرا بحث کرنے والا باطل کرسکتا ہے۔ پس کوئی قطعی تعین نہیں کہ صرف منطق یا استدلال سے صداقت تک پہنچ سکیں۔''

(برہمہ سوتر، ص 511)

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی فرماتے ہیں:

''عقل روح علوی کا جوہر ہے۔وہی اس کی رہنما اور اس کی ترجمان ہے۔اس عقل کا روحانی قلب اور پاکیزہ نفس سے اس قسم کا تعلق ہوتا ہے جو ایک پدر مشفق کا اپنے فرزندِ سعید سے یا جیسے ایک شوہر نیک بیوی کا خیال رکھتا ہے اور قلب واژگوں اور نفسِ امارہ کا تعلق بالکل ایسا ہے جیسے ایک باپ کا نافرمان بیٹے یا ایک شوہر کا بدخلق و بداطوار بیوی سے ہوتا ہے تو کبھی وہ ان سے بے اعتنائی اور روگردانی اختیار کرتا ہے اور کبھی ان دونوں کی درستیِ حال کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان سے بےتعلق نہیں رہ سکتا۔

کتاب کتاب ام الکتاب نے تمام عالم انسانیت کو میانہ روی کی تعلیم دی ہے کیونکہ علم اور جذبے کی انتہا حیات و معاشرت میں انتشار وخلفشار کا سبب ہوتی ہے۔ اخلاق ہی وہ اختیاری قوت ہے جو علم اور جہالت کے

درمیان حد فاصل قائم کرتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا ''قرآن کے سوا ہمیں کسی کتاب کی ضرورت نہیں'' اس کا مطلب ہوا دین اخلاق ہی تمام عالم انسانیت کے لیے کافی ہے لیکن دنیاوی علوم تو بہت ہیں۔ سیاست و معیشت، ریاضی و سائنس، سماجیات ونفسیات، جغرافیہ و تاریخ وغیرہ۔ دین اخلاق کے ذریعے مذکورہ علوم کو حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر یہ کیوں کہا گیا کہ قرآن کے سوا ہمیں کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن تمام علوم وفنون کو اخلاقی دائروں سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ورنہ عالم اور جاہل میں کوئی تفریق باقی نہ رہے گی۔ بدمزاج، بداخلاق، اور متکبر ہاتھوں میں آتے ہی علم کی طہارت اور پاکیزگی تمام ہوجاتی ہے اور عوام الناس کے لیے علم کا وجود بجائے رحمت ایک زحمت بن جاتا ہے۔ دریا، سمندر اور اوزون کی آلودگی اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ شکر کا ذائقہ حد سے زیادہ ہونے پر کڑوا ہوجاتا ہے۔ شرافت کی انتہا انسان کو بزدل بنادیتی ہے۔ عشق ومحبت کی انتہا عصبیت کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور عصبیت خواہ نیک ہی کیوں نہ ہو، تکلیف دہ ہوتی ہے۔ منصور حلاج اور سرمد شہید کی مثال سامنے ہے۔ دونوں کا عشق بے خودی کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا اس میں ذہنی توازن و اعتدال نہ تھا۔ عشق حقیقی اور عشق مجازی ایک ہی جذبے کے ظاہر و باطن دو روپ ہیں۔ تارک الدنیا راہب رشتوں کی توسیع سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ ان کی ذات خود ان کے لیے فیض رساں تو ہوسکتی ہے مگر دنیاوی معاملات سے بے نیاز ہونے کے سبب وہ تنہائی پسندی کا شکار بھی ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح بے کردار عالم کا علم طمع اور ریاکاری کے سبب عجیب عجیب شکلوں میں بھیس بدل کر اس کے کردار کو مشکوک بنا دیتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ کس کا علم نافع انسانیت ہے یا مضر۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم کے صوفی، علما، اتقیا وغیرہ حیات ومعاشرت کے بہترین انسان تھے اور اعتدال پسند ذہن رکھتے تھے۔ ان پر مجذوبیت حاوی نہ تھی۔ وہ متقی اور پرہیزگار بھی تھے اور دانا و عالم بھی۔

عالم کا علم اگر عصبیتِ قلب ونظر کا شکار ہے تو معاشرے میں ذہنی اور قلبی انتشار وخلفشار کو راہ ملتی ہے اور انسان حق وسچائی سے دور ہوجاتا ہے۔ ریاکاری، ملمع کاری کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور عیوبِ انسانی کی پہچان مشکل ہوجاتی ہے۔ عدل وانصاف، حق و باطل کا فیصلہ دلائل پر منحصر ہوکر جذباتی شفافیت سے محروم ہوجاتا ہے۔ سبب یہ کہ ایک دلیل کو کسی دوسری دلیل سے منفی قرار دے کر صداقت کو مجہول قرار دینا آسان ہوتا ہے۔ عشق و محبت فطری جذبات ہیں۔ اگر ان میں ریا کو شامل کرلیا جائے تو ان کی مقصدیت، مفاد پرستی میں تبدیل ہوجاتی ہے اور عشق ومحبت کے حقیقی معنی لال، پیلے مشروبات کی طرح معکوس ہوجاتے ہیں۔ جذبے کی تاثیر نہیں بدلتی مگر اس کے اوصاف میں کمی ضرور آجاتی ہے۔ عقل کی انتہا دلیلوں پر قائم ہوتی ہے۔ اگر مفاد پرستی بھی اس میں شامل ہو تو حق وصداقت کا فیصلہ کرنا انتہائی مشکل ہوجاتا ہے۔ اس لیے جذبوں میں اعتدال وتوازن لازم ہے۔ موجودہ زمانے میں انتہا پرستی عام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر

"عشق حقیقی اور عشق مجازی ایک ہی جذبے کے ظاہر و باطن دو روپ ہیں۔ تارک الدنیا راہب رشتوں کی توسیع سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ ان کی ذات خود ان کے لیے فیض رساں تو ہوسکتی ہے مگر دنیاوی معاملات سے بے نیاز ہونے کے سبب وہ تنہائی پسندی کا شکار بھی ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح بے کردار عالم کا علم طمع اور ریاکاری کے سبب عجیب عجیب شکلوں میں بھیس بدل کر اس کے کردار کو مشکوک بنا دیتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ کس کا علم نافع انسانیت ہے یا مضر۔"

خاص وعام کو لکھنے پڑھنے اور بولنے کی آزادی حاصل ہے مگر ہر شخص صاحب رائے نہیں ہوسکتا۔ ہزاروں، لاکھوں میں کوئی ایک شخص ہی کو یہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ کوئی عالم ودانا، محقق وناقد صاحب رائے بھی ہو۔ ایک مفلس اور غیر تعلیم یافتہ شخص بھی صاحب رائے ہوسکتا ہے۔ جہالت اپنے تکبر کے ذریعے اظہار میں آتی ہے۔ بعض تعلیم یافتہ افراد انکسار کے ذریعے اپنے تکبر کا اظہار کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے تکبر اور غرور کو چھپانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ریاکاری جذبوں کی صداقت کو اپنے مقاصد کے حصول میں کچھ اس طرح استعمال کرتی ہے کہ صداقت غیر فطری نقد ونظر کا شکار ہوجاتی ہے۔

''اطالوی فلسفی سسرو (Cicero) کے مطابق، انسان مملکت کے انہی قوانین کی اطاعت کرتا ہے۔ جو قانونِ قدرت کے فطری اصول وضابطوں کے مطابق ہو۔'' (تاریخ افکار سیاسی: ڈاکٹر ہاشم قدوائی، ص 116)

عشق ایک جذبہ ہے جسے تخلیق کار مختلف مقاصد کی جذباتی تفہیم میں استعمال کرتے ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں جسمانی لذت کے حصول میں کردار کی تگ و دو جنسی کشش اور اس کی تکمیل تک محدود ہے۔ 'سہائے' اور 'منگو کوچوان' جنس زدگی سے عاری ذہن رکھتے ہیں مگر 'بابو گوپی ناتھ' جنسی حصول میں ناکامیاب ہوکر خود سے بھی بے زار ہوجاتا ہے۔ 'موذیل' جنسی آوارگی کا شکار ہے، جس نے اسے بے کردار شخصیت کا حامل بنا دیا ہے۔ 'سہائے' کی طرح اس کی قربانی بھی ضائع ہوجاتی ہے۔ کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے زیادہ تر افسانے جذبۂ عشق سے باہر نفسیاتی وجود رکھتے ہیں۔ خاص طور پر کرشن چندر کا ناول 'شکست' فرقہ پرستی، بوالہوسی، اور انسانی بہیمیت کے خلاف ایک احتجاج کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اس کے برعکس بیدی کا ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' عورت اور مرد کی جنس زدہ فطری زندگی کا نقیب ہے۔ کرشن چندر نے رومانی افسانے اور ناول بھی لکھے ہیں جن میں شدت احساس بھی ہے اور وقت کی چیرہ دستیاں بھی شامل ہیں۔ افسانہ 'چندرو' ناول 'زرگاؤں کی رانی' کا خوبصورت بیانیہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ 'ایک عورت ہزار دیوانے' معاشرتی جبر کا چہرہ بے نقاب کرتا ہے۔

پاپولر ادب میں عشق ومحبت کی رومانی کہانیاں کئی دہائیوں تک کافی مقبول تھیں۔ کچھ معروف اور غیر معروف ادیب آج بھی رومانی افسانے کافی تعداد میں لکھ رہے ہیں۔ رام لال، کشمیری لال ذاکر، م ک مہتاب، جیسے افسانہ نگار رسالہ 'بیسویں صدی' اور 'شمع' کے لیے رومانی افسانے لکھ رہے تھے۔ 'گلشن نندہ'، 'دت بھارتی' اور ان سے قبل اے آر خاتون، شوکت تھانوی اور رضیہ بٹ کے رومانٹک ناول کافی مقبول ہورہے تھے۔ علامہ راشد الخیری، صادق حسین سردھنوی کے تاریخی ناولوں میں عشق ومحبت کی کہانیاں عوام کو پسند آرہی تھیں لیکن تبصرہ نگاروں نے اس طرف توجہ نہیں دی کیونکہ مغربی ناولوں کو ہندوستانی ناولوں پر ترجیح دیے جانے کا رجحان انھیں وراثت میں ملا تھا۔ مغربی ادب میں انھوں نے ایسے ناولوں کا انتخاب کیا جن میں قصہ گوئی کی روایت سے انحراف ملتا ہے۔ مثلاً کافکا، جیمس جوائس، ورجینا وولف وغیرہ کے نفسیاتی بیانیہ اور ذہنی خلفشار کو واقعاتی تسلسل کا عمدہ نمونہ قرار دے کر انھیں قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ قصہ گوئی میں مشہور ناول نگار الیکزنڈر ڈوما، رائیڈر ہیگرڈ کا نام لینا بھی گوارہ نہیں تھا۔ بورس پاسترناک، ہرمن میلول، ٹامس ہارڈی، پرل

ایس بک، چارلس ڈکنس کے ناولوں میں واقعات کا رابطہ وتسلسل اور جمالیاتی تصورات کے ایک نئے زاویۂ نگاہ کی پیش کش پر بھی غور کیا جانا چاہیے تھا۔ تا کہ مشرقی قصہ گوئی کو ایک نئی رفعت و پرواز سے متعارف کیا جا سکے۔ ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں کہیں کہیں قصہ گوئی کی روایت اور عشق ومحبت کا خوبصورت امتزاج بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثلاً 'ڈیڑھ متوالے' ناول میں بدصورت کو بڑوالا مرد ہمبگ دی گریٹ' اور 'تھویسیا' کو محبت کا بیان قابل مطالعہ ہے۔ حالانکہ یہ تصور ایک فرانسیسی ناول سے مستعار ہے لیکن پیشکش کی انفرادیت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دنیا کے تمام قصے مثلاً لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا وغیرہ محبت کی آفاقیت سے معمور ہیں۔ مثنوی میر حسن، دیا شنکر نسیم، نواب اختر مرزا کے قصے اور 'طلسم ہوشربا' کی داستانوں میں بیان کی گئی رودادِ محبت کی گل افشانیاں جادو نگار قلم کی وراثت ہی تو ہیں۔ جن میں امیجری اور زبان کی وسعت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مغربی زبانوں کا جب خمیر بھی نہیں اٹھا تھا اس وقت مشرق میں اکثر زبانیں جذبہ و احساس کی انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ ادبی فلسفۂ تنقید کے مطابق 'کتابِ نورس' کی مثال سامنے ہے جسے قلی قطب شاہ نے سنسکرت سے ترجمہ کیا تھا۔ ایسی کوئی تخلیق مغرب میں نہیں ملتی۔ عشق کو اگر جذبے کا مرکز قرار دیا جائے تو یہ قبول کرنا ہوگا کہ غیظ و غضب کا تعلق بھی عشق کی مرکزیت سے ہے۔ ایسی صورت میں اخلاقی برتری سے کام لے کر حق و ناحق کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے مگر لوگوں نے اخلاق کو ایک فرسودہ عمل قرار دے کر اس کی طہارت و پاکیزگی جسے سقراط نے Virtu is Knowledge قرار دیا تھا، متروک قرار دے دیا ہے۔ لہٰذا قدر اخلاق کے ہٹتے ہی نظام عدل وانصاف کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ ظالم اور مظلوم میں فرق کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ نیکی بدی کا معیار برقرار نہ رہنے کے سبب ادبی معیار کا قائم رہنا بھی ممکن نہیں ہوتا۔ تغیر اور تبدل کے نام پر 'علامت' اور ''علامتی بیانیے کو قبول کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ یوں تو علامتی ادب غیر جذباتی اور غیر معیاری ہوتا ہے۔ حالانکہ ناقدین ادب نے اسے ایک 'معیار' دینے کی ہر چند بہت کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہوئے۔ سبب یہ کہ غیر فطری خیالات ونظریات برف کی طرح پگھل کر آہستہ آہستہ خود ہی ضائع ہو جاتے ہیں۔ انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں تلمیحات کو علامت کی شکل میں متعارف کرایا مگر حقیقت کے ظاہر ہوتے ہی علامتوں کی ملمع کاری رخصت ہو گئی اور بیان کی خوبصورتی بھی خیال میں رنگ بھرنے میں ناکام ثابت ہوئی۔ انور سجاد کیڑے مکوڑوں کو افسانوں میں جگہ دے کر بھی اپنی انفرادیت ثابت نہ کر سکے۔ سبب یہ کہ افسانوں میں کوئی مرکزی خیال تو ہونا ہی چاہیے۔ سریندر پرکاش کے خیالات میں ربط وتسلسل قاری کو خود ہی تلاش کرنا پڑتا ہے مگر کوئی سرا ہاتھ آتا نہیں۔ صرف بلراج مینرا ہی ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو اپنی علامتوں میں ربط و بیان قائم رکھتے ہیں مگر افسانوں میں کوئی مثبت خیال اور نظریہ واضح نہیں ہوتا۔

جذبوں کو نام دے کر رشتوں کی تجسیم کی جاتی ہے۔ رشتے جس قدر وسیع ہوں گے جذبوں کا دائرہ بھی اتنی ہی وسعت اختیار کرے گا۔ پیڑ، پودوں، جانور اور پرندوں سے رشتوں کی استواری بھی جذباتی زندگی کا ایک قدیم نظریہ ہے۔ جس نے خیالات کو جذباتی آفاقیت عطا کی ہے لیکن تمام جذبوں کو عقل کی کھراد پر جانچا پرکھا نہیں جا سکتا ورنہ عشق ومحبت کی وسعت تمام ہو جائے گی اور جذبات بے رنگ و بے نور ہو جائیں گے۔ ان میں کشش بھی باقی نہ رہے گی جیسا کہ آج دیکھنے میں آرہا ہے کہ عشق ومحبت کے جذبات پر دولت وشہرت کا فسوں طاری ہے۔ افسانہ اور ناول نگار سیاسی، نفسیاتی، اور معاشی رشتوں کو ایک نئی سماجی فکر کو قصہ کہانی کا متبادل بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ قلب ونظر کا مزاج بدل گیا ہے۔ ضرورتیں انسانی زندگی کا ماحصل قرار دی جاتی ہیں۔ پھر بھی 'ماں' کا وجود غنیمت ہے۔ جس نے جذبے کی صداقت کو بلندی اور پہچان عطا کی ہے حالانکہ وہ عقلی طور پر اپنے وجود کو ثابت کرنے میں ناکام ہے مگر تمام دنیا ماں کے وجود کو بغیر کسی دلیل کے قبول کرتی ہے۔ جذباتی حقائق کو سمجھنا مادّی حقائق کے سمجھنے سے زیادہ مشکل ہے۔ بچوں کے معصوم چہرے دیکھ کر ہمارا دل ان کی طرف خود بخود مائل ہو جاتا ہے۔ پرندوں کی نرم و نازک آوازیں دلوں کو مسحور کر لیتی ہیں۔ بعض اوقات مغموم تصویریں دیکھ کر ہمارا دل بھی اداس ہو جاتا ہے۔ خون کا رشتہ نہ ہونے کے باوجود، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ دراصل عالم انسانیت کی ہر شے ایک دوسرے سے کتنی وابستگی رکھتی ہے اس کی خبر بھی ہمیں نہیں ہے۔ یہاں ابن عربی کا نظریہ 'وحدۃ الوجود' درست ثابت ہوتا ہے۔

بازار میں فروخت ہونے والے نقلی اور مصنوعی مشروبات کی طرح افسانہ اور ناول نگاری کا فن بھی قصہ کہانی سے مستعار ضرور ہے۔ بادشاہ، شہزادے، شہزادیاں، امرا، وزرا اور تاجروں کے کردار کی جگہ عام آدمی نے لے لی ہے۔ دور ملوکیت میں لکھا جانے والا ادب شان و شوکت، اور جام و مینا کی کھنک گل ریز چہروں کی دل آویز چمک اور قوت بازو کی کمک سے معمور تھا۔ نظام جمہوریت نے سیاسی بنیاد پر ادبی تہذیب وثقافت کا ایک نیا مفروضہ 'آزادی' وضع کر لیا تجس کا مرکز ومحور ضرورت نفسی کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ نیکی بدی سے جس کی کوئی اخلاقی معروضیت نہ تھی۔ ایسی صورت میں موضوعات کا تبدیل ہونا ناگزیر تھا۔ جس میں مرد وزن کی محبت سیاسی، معاشی، جنسی اور نفسیاتی محاکموں میں تبدیل ہو گئی مگر ہجر وصال کی کیفیت میں وہ جاذبیت پیدا نہ ہو سکی جو کبھی تھی۔ ملوکیت اور جمہوریت میں ایک بڑی مماثلت عورت اور مرد کی رفاقت ہے جسے قصہ کہانی افسانہ اور ناول سے نکالنا ممکن نہ ہوا۔ 'علامت نگاری' کے تصور میں یہ دونوں کردار کہیں گم ہو گئے جس نے افسانہ اور ناول کو محض روداد نفسی کی خشک بیانی تک محدود کر دیا—

علامہ اقبال کا یہ کہنا کہ ''شاعر اور افسانہ نویس کے سر پر عورت ہے سوار'' پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں ''وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ'' ظاہر ہے کائنات کا رنگ قصہ کہانی کو خوبصورت اور دل آویز بناتا ہے۔ اس لیے شاعر اور افسانہ نویس اسے صدیوں سے اختیار کرتے آرہے ہیں۔ سب سے اہم حقیقت تو یہ ہے کہ 'عورت' کا وجود عشق ومحبت کی صداقت کا پتہ دیتا ہے۔ غور کیا جائے تو دنیا میں عورت مرد کے سوا کوئی تیسری ہستی نہیں کہ جسے تخلیقی ادب کا محور بنایا جا سکے۔ درد و کرب، ظلم وستم کی آگ میں تپ کر بھی وہ اذن عمل دینے والی ایک ایسی ہستی ہے کہ جس پر تخلیقیت کی تمام ذمے داری ہے۔ دورِ جدید میں عشق ومحبت کی اظہاریت کا طریقہ نفسیاتی اور جنسی زاویۂ نگاہ تک محدود ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ اور ناول کے بیان میں عقلی محاکات، جذباتی احساسات پر حاوی ہو گئے ہیں۔ اردو ادب کے زیادہ تر ناقدین جذبات عشق ومحبت کی آفاقیت کو محض جنسی اور جمالیاتی کشش تک محدود سمجھتے ہیں مگر یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ اقبال کے یہاں بیشتر نظموں اور غزلوں میں نسائی لب ولہجہ ہی سرفہرست نظر آتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو امیجری کی تمام خوبیاں ضائع ہو گئی ہوتیں۔ بیان کا نسائی لب ولہجہ ہی اقبال کے تخیلاتی وژن سے مناسبت رکھتا ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ تمام دنیا کی ادبی نگارشات کا نسائی لب ولہجہ ہی تخیلاتی وژن کو پرکشش بناتا ہے۔

سینے میں دل ہے دل میں داغ، داغ میں سوز وساز عشق
پردہ بہ پردہ ہے پنہاں، پردہ نشیں کا راز عشق
عرش بریں پہ کبریا، فرش زمیں پہ مصطفیٰ
پہنچا کہاں سے ہے کہاں، سلسلۂ دراز عشق

من بندۂ آزادم، عشق است امامِ من
عشق است امام من، عقل است غلام من
ہنگامۂ این محفل، از گردش جام من
این کوکب شام من، این ماہِ تمام من

نمی دانم چہ منزل بود، شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقص بسمل بود، شب جائے کہ من بودم
خدا خود میر مجلس بود، اندر لامکاں خسرو
محمد شمع محفل بود، شب جائے کہ من بودم

تمام طرح کی جذباتی اظہاریت شدتِ احساس کے ذریعے ہی عشق و محبت کا پتہ دیتی ہے۔ سگمنڈ فرائڈ اور دیگر مغربی فلاسفہ اسے ایک نفسیاتی عمل قرار دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل جذبات واحساسات پر تاویل قائم کرسکتی ہے مگر عینیت پسندی جذبے کا وصف نہیں ہے لہٰذا تاویلات عشق و محبت کو کوئی عقلی جواز فراہم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ضرور ہے کہ میاں بیوی جنسی تعلقات کے باہمی رشتے قائم کرسکتے ہیں جس سے ان کی ازدواجی زندگی کے رشتوں کو استحکام ملتا ہے مگر عورت اور مرد کے درمیان ایک یہی رشتہ استوار نہیں ہوتا کچھ اور بھی رشتے قائم ہوتے ہیں جن میں جنسی رشتے قائم کرنا اخلاقی جرم سمجھا جاتا ہے۔ قدر اخلاق فطری اور روایتی طور پر مختص ہے اس میں ترمیم کرنا حیوانیت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔ انسان اپنی جذباتی حقیقت اور روایت سے منحرف تو ہوسکتا ہے مگر آزاد نہیں ہوسکتا۔ بعض لوگ آزادی کے زعم میں اخلاقی ضابطوں پر محاسبہ قائم کرتے ہیں اور اس حقیقت کو فراموش کرجاتے ہیں کہ دنیاوی عدالتوں کے قوانین کی بنیاد فطری اخلاقی ضابطوں پر ہی قائم ہے۔ اگر بنیاد کمزور ہو تو عدل وانصاف کا قائم رہنا بھی مشکل ہوتا ہے، عقل کی آزادی حقیقی آزادی نہیں ہوسکتی۔ سبب یہ کہ۔

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ ملا ہے، نہ زاہد، نہ حکیم

دوستی، رفاقت، اعتماد، خوش فہمی، انسیت، وابستگی، دلداری، دل جوئی و دیگر جذبات انسانی رشتوں کی بنیاد پر بالیدگی اختیار کرتے ہیں۔ مغربی معاشرہ اور ادب میں بھی رشتے داریاں محدود ہوتی ہیں۔ افسانہ اور ناول کے علاوہ شعری ادب میں بھی محبت کا تصور اتنا پرکشش نہیں ہوتا جو مشرقی ادب کی خصوصیت ہے۔

پروفیسر یوسف حسن خاں نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''یورپ کے ہر ملک میں رومانیت کی تحریک میں کسی نہ کسی حیثیت سے حافظ کی کارفرمائی ہوئی۔ مختلف زبانوں میں حافظ کے استعارے، علامتوں اور تجلی پیکروں کے سانچے میں بدلتے رہے۔ حافظ کا اثر جرمن رومانیت پر سب سے زیادہ پڑا اور اس کے بعد انگریزی زبان کی رومانی تحریک پر۔'' (حافظ اور اقبال، ص 335)

رومانیت مشرقی ادب کی خصوصیت ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ عشق و محبت کے بالیدہ تصورات مشرقی ادبیات سے مغرب میں منتقل ہوئے۔ Aesthetic sence کو جمالیات کا متبادل قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ Aesthetic Sence کے مقابلے جمالیات کا تصور زیادہ وسعت انگیز اور ریشنلز ہے۔ نظریۂ جمال کی آفاقیت Aesthetic Sence کے مادّی احساسات سے پیدا کردہ تصورات و خیالات کی ظاہری حقیقتوں سے ماورا کہیں زیادہ مکمل اور جامع ہے۔ 'اللہ جمیل ویحب الجمال' کے مصداق جمالیاتی تصورات بغیر عشق ویقین کے بے معنی ہیں۔ Aesthetic Sence کا تصور بے یقین مادّی حقیقتوں کا ترجمان ہے۔ عقل اضطراب اور بے یقینی کے درمیان اپنا وجود تلاش کرتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بعض افراد حقیقت نظر انداز کردیتے ہیں اور اپنے جہل پر جم جاتے ہیں۔ یہی عصبیت قلب ونظر عقلی حدود کا تعین کرتی ہے۔

عام لوگ جنسی کشش کو محبت کا متبادل سمجھتے ہیں، جنسی کشش کے تمام ہوتے ہی ان کی محبت کا جذبہ بھی تمام ہوجاتا ہے مگر عشق کی خوبی یہ ہے کہ اس کا سلسلہ انسان کی آخری سانس تک برقرار رہتا ہے۔ ماں اپنے بچے کو آخری دم تک چاہتی ہے اور ایک بیوی کی حیثیت سے اسے اپنے شوہر سے بھی محبت ہوتی ہے۔ بھائی بہن آپس میں محبت رکھتے ہیں۔ دوستوں کے درمیان بھی انسیت ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کو اپنی کسی خاص چیز سے دلچسپی ہوتی ہے اور وہ اسے حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرگزرنے سے گریز نہیں کرتے اگر دیکھا جائے تو ہر شخص کسی نہ کسی شے کی جستجو میں گرفتار ہے۔ عشق کی بہت سی قسموں میں یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ کون سچا ہے کون سچا نہیں ہے؟ پھر بھی اس کا فیصلہ اخلاقی ضابطوں کی مدد سے کیا جاسکتا ہے۔ اگر عمل کی بنیاد فطری اصول اور ضابطوں پر قائم ہے تو اسے درست سمجھا جائے گا مگر حقیقت یہ بھی ہے کہ غیر فطری ضابطوں میں بھی ایک ایسا بنیادی توازن ہوتا ہے جو ان کی صداقت عملی کو غیر فطری طور پر قائم رکھتا ہے جیسے زمانہ قدیم میں افلاطون اور ارسطو نے 'نقل در نقل' اور آج جب کہ انسان 'مریخ اور عطارد' کی خبر لارہا ہے 'مصنوعی ذہانت' (Artificial Intelligence) کے عنوان سے متعارف کیا گیا ہے۔ عام طور پر حقیقت تاویلات میں گم ہوجاتی ہے۔ متخرب ذہن افراد صداقت علم وعمل سے منحرف بھی ہوتے ہیں اس لیے حقیقت فن واضح نہیں ہوتی۔

صوفیائے کرام کا جذبۂ صادق انھیں عوامی خدمت گزاری پر معمور کرتا ہے چونکہ انھیں مال وزر کی لالچ نہیں ہوتی اس لیے وہ بااقتدار طبقات سے دور ہی رہتے ہیں۔ فلسفی اور دنیاوی علوم کے ماہرین مغربی معاشرے کی سربرآوردہ شخصیتیں ہیں۔ دیارِ مشرق میں صوفیا اور درویش اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ تخلیقی تصانیف کا ایک بڑا حصہ صوفیا اور اتقیاء کے قلم کی عطا ہے۔ زبان وبیان پر بھی ان ہی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ شاعر اور ادیب کی ایک بڑی اکثریت ان کی تعلیمات سے متاثر نظر آتی ہے۔ مولانا روم تصوف کے بلند مقاصد کو حکایتوں کے پیرائے میں ایک ایسا اخلاقی وژن عطا کرتے ہیں جس کی کوئی مثال نہیں۔ شیخ سعدی اور دیگر صوفیائے کرام کے یہاں بھی سادہ بیانی کے نہایت عمدہ مرقعے حکایتوں کے پیرایۂ اظہار میں نظر آتے ہیں جن کا صلابت قلب ونظر سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ایسی کوئی روایت مغربی ادب میں ناپید ہے۔ افسانے اور مختصر افسانے کی بنیادیں حکایتی طرز ادا اور ہیئت کا اہم رول ہے۔ موضوعات میں بھی اخلاقی اور غیر اخلاقی طرز حیات کا خاکہ ہی کھینچا جاتا ہے۔ چالاک اور عیار آدمی سیدھے سچے لوگوں کا کس طرح استحصال کرتے ہیں، اس موضوع پر بھی آج کل خوب لکھا جارہا ہے۔ حالانکہ قصہ کہانی کا یہ موضوع بھی صدیوں پرانا ہے، 'پنچ تنتر' کہانیوں میں ایسے بہت سے موضوعات ہیں جو آج بھی بہت Relevent ہیں، تہذیب وثقافت کا وجود عشق کی تعمیریت سے عبارت ہے۔ اگر رشتے نہ ہوتے تو دنیا میں کوئی کسی کا خیر خواہ نہ ہوتا۔ عالم انسانیت کی تربیت کا سلسلہ اخلاقی تعلیمات اور قدرتی انصاف (Natural Justice) کی سمجھ سے گزر کر ہم تک پہنچا ہے۔ جنس زدہ زندگی کو شوہر بیوی تک محدود کرنے کا مقصد تہذیب و ثقافت کو مضبوط اور صالح خطوط پر قائم کرنا ہے تاکہ دنیا میں عملی طور پر توازن و اعتدال قائم رہ سکے۔ جمہوری آزادی کے دعووں نے انسانی روایتوں کی مثبت اور مستند حقیقتوں کو کالعدم قرار دے کر اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش میں جذبات کی ایک ایسی دنیا قائم کرنے کی جانب پیش قدمی کی ہے جس کی کوئی فطرت ہے نہ آفاقیت۔ افسانہ اور ناول میں قصے اور کہانی کے بجائے

روداد نفسی کو تخلیقی محاکات کی صورت میں پیش کیے جانے کا رجحان عام ہے۔ سیاسی اور معاشی موضوعات کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے۔ لوگوں کو قصہ کہانی پڑھنے کی فرصت ہی نہیں بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ قصہ کہانی کا سلسلہ ہی موقوف ہوگیا ہے۔ سیاسی اور معاشی معاملات سے دلچسپی میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ جس نے لوگوں کو جذباتی اور اخلاقی زندگی کا ناقد بنا دیا ہے۔ عشق ومحبت کے بیان میں اب وہ پہلے جیسی گرمی بھی نہیں رہی۔ داوری اور ہمدردی محض رسمی سچائی ہی رہ گئی ہے۔ دل ودماغ کو مصروف کار رکھنے کے لیے تجارت اور سائنس نے سیکڑوں موضوعات فراہم کردیے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ایجادات و اختراعات نے ایک ہلچل پیدا کردی ہے جس کی معلومات ہونا ہر فرد کے لیے لازمی ہے۔ مثلاً کمپیوٹر، بائک، سیل فون وغیرہ ورنہ اس کا وجود اندھیروں میں غرق ہوجائے گا۔

عشق ومحبت کی سرفرازی کی تمام دلیلیں کارگر نہیں ہوسکتیں۔ وجہ یہ کہ جذباتی حقائق مادّی اشیا کی طرح اپنا کوئی عینی وجود نہیں رکھتے۔ ان سے کوئی مالی منفعت بھی نہیں ہوتی۔ جذباتی انسان نظام جمہوریت کا پسندیدہ انسان ہرگز نہیں ہوسکتا۔ ریاکار اور چالاک آدمی نیک اور شریف انسان پر برتری رکھتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اکثر ڈائس پر بیٹھے ہوئے بدخصال آدمی ہی عزت و افتخار کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ برائی پر اچھائی کی فتح کا زمانہ گزرے ایک عرصہ ہوا۔ اب سیاست کے سامنے سچائی کی قوت ارادی بے اثر ثابت ہوگئی ہے۔ حضرت علیؓ سے کسی نے دریافت کیا ''شریف آدمی کی پہچان کیا ہے؟'' آپ نے فرمایا ''جب اس پر سختی کی جائے تو سخت ہوجائے اور جب نرمی برتی جائے تو نرم!'' علامہ اقبال نے اس خیال کو کچھ اس طرح رقم کیا ہے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

صلہ رحمی، غم گساری دراصل عشق کی خصوصیت ہے۔ ظلم و جبر بھی عشق کی انتہائی شکل ہے۔ جب اقتدار، ناموری، دولت اور ذاتی مفادات کی ہوس قدر اخلاق پر غالب آجاتی ہے تو عشق عصبیت میں تبدیل ہوجاتا ہے اور فتنہ و فساد کو راہ ملتی ہے۔ صوفیائے کرام چونکہ داوری اور خدمت خلق کو عشق کی معراج سمجھتے ہیں اس لیے حیات و معاشرت کے بہترین انسان بھی وہی ہوتے ہیں۔ بعض فقر اندر و نیاز قبول کرتے ہیں بعض نہیں مگر ان کے دل خدا کی عبادت و ریاضت میں مبتلا ہوتے ہیں اور عوامی خدمات سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ کردار کی درستگی ان میں ایک ایسی استقامت پیدا کردیتی ہے جس کے آگے سخت سے سخت معرکے بھی پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ واعظ، ناصح، محتسب، ملا اور شیخ کی نارسائی پر اردو شاعری میں سیکڑوں اشعار باآسانی دستیاب ہیں۔ ان کی جگہ آج کل امیر شہر اور سیاست دانوں کی نااہلیت کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ سیاسی معاشرے کی پروردہ سیاسی شخصیتیں عشق و محبت کی شفافیت سے دور ہوتی ہیں۔ ریاکاری ان کے مزاج کا اہم وصف ہوتا ہے۔ ان کے فیصلے بھی غیر متوازن ہوتے ہیں۔ حالانکہ عشق میں بھی کبھی کبھی بے اعتدالی پیدا ہوجاتی ہے مگر اس سے کسی کو نقصان نہیں ہوتا۔ لیکن دنیاوی معاملات میں عشق کی انتہا عصبیت کی صورت اختیار کرلیتی ہے جس سے عدل و انصاف میں توازن برقرار نہیں رہتا اور بعض اوقات حق وناحق میں تفریق کرنا مشکل ہوتا ہے'انتقام' عشق کی فطرت نہیں لیکن جب عدل و انصاف سے گریز کیا جاتا ہے تو حق و باطل میں ٹکراؤ ناگزیر ہوجاتا ہے۔

صوفیائے کرام کے دور میں آزادی کا اتنا شور نہیں تھا۔ لوگوں کی ضرورتیں کم تھیں۔ سماجی بنیادیں، خلوص و محبت پر استوار تھیں۔ آزادی اور مساوات کے سیاسی تصورات نے آج انسان کو دولت و شہرت، اقتدار اور ذاتی مفادات کا شیدائی بنا دیا ہے۔ لوگ جرم کرتے ہیں اور شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔ یہی لوگ جب تخلیقات ادب و فن میں آتے ہیں تو ان کے کردار میں وہ گرمی اور استحکام نہیں ہوتا جو ایک تخلیقی کردار کا وصف ہوتا ہے۔ افسانہ اور ناول میں صرف واقعات کو یکجا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ربط و تسلسل پیدا کیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں یہی تکنیک استعمال کی جاتی ہے۔ تخیلات فن کے بغیر عقل اپنے وجود کی برتری ثابت کرنا چاہتی ہے۔ حالانکہ اس کی رسائی (Approach) محض مادیاتی حقائق کی ظاہری حالتوں کے تجزیے تک محدود ہے۔ یقین و اعتبار سے اس کا کشکول خالی ہے۔ وسوسہ اور تشکیک اس کی خصوصیت ہے اور عقل کی اسی خصوصیت کے سبب علم نفسیات کا وجود ہوتا ہے۔ مادیاتی یقین عینیت پسندی پر منحصر ہے۔ جو چیز نظروں سے اوجھل ہے فلسفی اور سائنسداں کے لیے اس پر یقین کرنا مشکل ہے۔ دولت پسند تاجر، شہرت پسند فنکار، دانشور اور مفاد پرست سیاست داں سب کا منتہائے نقد و نظر اقتدار کا حصول اور خود کو لائم لائٹ (Limelight) میں بنائے رکھنا ہے تاکہ ان کی مارکٹ ویلیو (Market Value) بنی رہے۔ گم نامی کے اندھیروں میں گھر کر اپنا تجارتی، معاشی اور نفسیاتی وجود گنوا بیٹھتے ہیں۔ روحانی یقین خدا کی ذات پر منحصر ہے جسے انسان کے لیے دیکھنا ممکن نہیں۔ صرف مظاہر قدرت اور فطری قوانین کی حقیقتوں کو سمجھ کر اس کے وجود پر یقین کیا جاسکتا ہے۔ صوفیائے کرام کی عبادت و ریاضت اور مال و دولت سے بے نیازی انھیں طمع اور لالچ کے شر سے محفوظ رکھتی ہے۔ مراقبہ اور کیفیت جذب کے ذریعے وہ ایک غیر مرئی قوت و طاقت کا احساس کرتے ہیں۔ جس کا تعلق دل کی شفافیت اور ذہنی بالیدگی سے ہوتا ہے۔ نفس اور جسمانی ضرورتیں فطری طور پر مختص ہیں۔ اس حقیقت سے آشنا افرادہی 'من عرف نفسہ ومن عرفہ ربہ' کے مصداق زندگی کی حقیقتوں کو مادّی اور روحانی طور پر محسوس کرتے ہیں اور ان میں ایک میانہ روی اور توازن قائم رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اہل وعیال کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے بھی اللہ کی عبادت اور اپنی عبودیت سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ اللہ کی وحدت کا یقین ہی عشق کا مقصد ہے جس نے تہذیب وثقافت میں نت نئے رنگ پیدا کیے ہیں۔ ماں کا رنگ سب سے ارفع واعلیٰ ہے۔ زبان اور ادب کا دلکشن عشق الٰہی کی عملی تحریک سے پیدا ہوا ہے۔ اجتماعیت ہی جس کا اہم وصف ہے۔ انفرادیت عشق کا وصف کبھی نہیں ہوسکتا۔ موجودہ سیاسی طرز حیات میں — سیاسی ذہن، سیاسی معیشت، سیاسی معاشرہ انفرادی حیثیت کا حامل ہوسکتا ہے۔ جس کی انتہا تنہا رہائش (Solo Living) پر تمام ہوتی ہے اور تنہا انسان کی فکر وفہم اجتماعی نہیں ہوسکتی۔ وہ صرف اپنی ذاتی خواہشوں کا غلام ہوتا ہے۔ سماجی اجتماعیت اور ضابطے اس کی نظر میں کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کا ذہن تہذیب وثقافت کی عطا کردہ مثبت قدروں سے آزاد ہوتا ہے۔ عشق ومحبت، جلال و جمال، ایثار وقربانی، عدل وانصاف کی مستند اور روایتی تفہیم سے الگ ایک منافقانہ نظریہ پیدا ہوتا ہے جسے سیاسی آزادی کی غیر اخلاقی صورت حال میں دیکھا جاسکتا ہے۔ لوگ وعدہ کرتے ہیں مگر وفا نہیں کرتے۔ قول وفعل کا تضاد ایک عام بات ہے۔ دلیل کا علم فقط عقلی تاویلات تک محدود ہوگیا ہے۔ جس نے کمزور ذہنوں پر جذبات عشق ومحبت کی عقلی وعملی انفرادیت ثابت کردی ہے۔ غالباً دوسو برس پیشتر غالب کو اس تبدیلی کا احساس ہوگیا تھا

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

■

Dr. Mehmood Shaikh
592, Naya Mohalla, Mirza Ghalib Marg
Jabalpur - 482002 (MP)
Mob.09300353584

بانو سرتاج

سنت شاعرہ
بہینا بائی

مہاراشٹر کی سنت شاعرات میں مہادسیا، مکتا بائی، بیابائی وغیرہ کے ساتھ بہینا بائی چودھری ایک اہم نام ہے۔

وہ سنت تکارام کی شاگرد تھیں۔ ان کی پیدائش مہاراشٹر کے اجنتا ایلورہ کے مشہور زمانہ شہر وروڑ کے دیوگاؤں میں 1629 میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام 'آؤجی دیوکلکرنی' اور والدہ کا نام جانکی تھا۔ آؤجی پکے شو بھکت تھے۔ بہینا بائی کو بھی بچپن سے ہی بھگوان کی بھکتی میں دلچسپی تھی۔

کم عمری میں بہینا بائی کی شادی ایک تیس سالہ جوان سے کردی گئی۔ ان کے شوہر کا نام رتنا کر عرف گنگادھر پاٹھک تھا۔ وہ شو پور کے جیوتشی تھے۔ وہ گنگادھر پاٹھک کی دوسری شادی تھی۔ بہینا بائی ان جیسا عالم فاضل شوہر پاکر اپنی خوش نصیبی پر خوش تھیں۔

ابتدا میں ان کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہیں رہی۔ شادی کے چار برس بعد ان کے والد پر برا وقت آپڑا۔ جیوتشی رتنا کر عرف گنگادھر پاٹھک نے دیویاترا کرنے کا مشورہ دیا جسے قبول کر آؤجی، جانکی بائی، بہینا بائی اور رتنا کر پاٹھک سب سفر پر نکل پڑے۔ پنڈھرپور، شنگناپور، رحمت پور ہوتے ہوئے وہ لوگ کولھاپور پہنچے جہاں ہرن بھٹ نامی ایک برہمن نے انھیں پناہ دی۔

کولھاپور قیام کے دوران بہینا بائی نے سنت جے رام سوامی وڑگاؤں کر کے مذہبی جلسوں میں سنت تکارام کے ابھنگ (صوفی شاعری) سنے اور ان کی معتقد ہوگئیں۔ ان سے ملنے کو بے قرار ہوگئیں۔ ان کے شوہر کو بہینا بائی کا پاگل پن پسند نہیں آیا مگر سنت تکارام کی شاعری نے کچھ ایسا جادو کیا تھا کہ بہینا بائی نے شوہر کی ناراضگی کی بھی پرواہ نہیں کی۔

1640 میں سنت تکارام نے بہینا بائی کو خواب میں درشن دیے، دعا دی اور بہینا بائی اشعار موزوں کرنے لگیں۔ وہ دیہوس پہنچیں، سنت تکارام سے ملیں اور مکمل طور پر ایشور بھکتی میں ڈوب گئیں۔

بہینا بائی کی شاعری میں مختلف موضوعات پر اشعار ہیں۔ ایشور بھکتی شاعری کی بنیاد ہے۔ نرگن نراکار برہما، اوتاروں کی حقیقت، ایشور کی عبادت، آتما، پرماتما اور انسان کے باہمی رشتے بولتے ہیں، ہندوستانی معاشرے کی مذہبی دیوانگی، ڈھونگ، ضعیف الاعتقادی پر طنز ملتا ہے۔

بہینا بائی مراٹھی سنت ساہتیہ کی اکلوتی شاعرہ ہیں جنھوں نے اپنی آپ بیتی خود لکھی ہے۔ نانا صاحب گورے بہینا بائی کی سوانح حیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ''بہینا بائی کی زندگی محیر العقول واقعات سے بھری پڑی ہے۔ شوہر کا انھیں بے دردی سے زدوکوب کرنا اور احتجاجاً ان کی پیاری گائے کا دانہ چھوڑ دینا، سنت تکارام کا خواب میں آکر گرومنتر دینا، شاعری کا آشیرواد دینا، بہینا بائی کو شودر (نچلی ذات) کا طعنہ مارنے پر ان کے شوہر کے بدن میں جلن ہونا، ظالم مہیاجی کا گائے کو مارنا اور مار کے نشانات کا سنت تکارام کی پشت پر ظاہر ہونا جیسے ناقابل یقین واقعات کا انھوں نے اپنی سوانح حیات میں ذکر کیا ہے۔''

بہینا بائی نے مراٹھی اور ہندی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ مراٹھی کے اشعار لاکھوں کی تعداد میں ہیں جب کہ ہندی کے صرف سات سو اشعار ہی حاصل ہوئے ہیں۔ شاعری کے اس بے بہا خزانے کو یکجا کرنے کی کوششیں وقفہ وقفہ سے ہوتی رہی ہیں جیسے، 1913 میں شری ڈھونڈو وشوناتھ نے سب سے پہلے پونے سے مجموعہ شائع کیا۔ 1926 میں وشواس نارائن کولہٹ کر، نے... سنت بہینا بائی چی گاتھا (سنت بہینا بائی کی کہانی) عنوان سے ان کی شاعری کو یکجا کیا۔ 1956 میں پونے چترشالا نے 'شری سنت بہینا بائی یانچی ابھنگ گاتھا (شری سنت بہینا بائی کی ابھنگ شاعری) شائع ہوئی۔ جسٹس ای ایبٹ' نے مہاراشٹر کوی سنت مالا (مہاراشٹر کے صوفی شاعر) سیریز میں بہینا بائی کی مراٹھی شاعری کے ساتھ انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا ہے۔

سنت بہینا بائی کی شاعری کی زبان مہاراشٹر کے خاندیش علاقے کی اہیرانی مراٹھی ہے جو ہندی استعمال کی گئی ہے وہ سادہ عام بول چال کی زبان ہے۔ اس پر مراٹھی کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ اردو کے الفاظ فقیر، حضور، بندہ، صاحب فکیر (فکر)' ہسیار (ہوشیار) ذکر (ذکر) وغیرہ کا استعمال ہوا ہے۔ ڈاکٹر وِنے موہن شرما اس تعلق سے کہتے ہیں ''بہینا بائی کے اشعار میں فصاحت نہیں ہے۔ ان میں، بندہ، حضور، اللہ وغیرہ الفاظ بڑی تعداد میں استعمال ہوئے ہیں لیکن ایک مراٹھی زبان کی شاعرہ سے اعلیٰ درجے کی اردو، ہندی کی توقع رکھنا مناسب نہیں ہے۔ ان کے اشعار صرف زبان کی کسوٹی پر نہیں پرکھے جاکر ان کی بھکتی بھاؤنا اور صوفیانہ خیالات پر پرکھے جانے چاہئیں۔''

صحیح ہے، بہینا بائی کی شاعری دل کو چھو جانے والی ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف رنگ ہیں، مٹی کی خوشبو ہے، موسیقی کے سر ہیں۔ ان کی شاعری میں عورت اپنی پوری ہمت واستقلال کے ساتھ پوری کمیوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ عورت کی عبادت، خدمت اور ایثار کی جھلکیاں نظر آتی ہیں تو ممتا، محبت اور شفقت کے جذبات بھی نظر آتے ہیں۔ عورت، چاہے وہ باورچی خانے میں کھانا پکا رہی ہو، اناج پیس رہی ہو، کھیتوں میں گڑائی کر رہی ہو، کنویں سے پانی کھینچ رہی ہو، شاعری میں مکمل تصویر کشی ہوئی ہے۔ بہینا بائی کی شاعری آفاقی ہے، زمان ومکان سے پرے، مفید اور دلپذیر ہے۔

بہینا بائی کے پاس الفاظ کا لامحدود خزانہ تھا جس میں سے چھان پھٹک کر مناسب لفظ نکالتیں اور انگوٹھی میں نگینے کی طرح مہارت سے شعر میں جڑ دیتیں۔ اپنے فرزند سوپن دیو سے ایک مرتبہ انھوں نے کہا ''ایک لفظ ہے رنگ... دیکھو کہ اسے کتنی طرح استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔'' چار مصرع فی البدیہہ کہہ کر انھوں نے لفظ رنگ کو استعمال کر کے سمجھایا تھا۔

سوپن دیو نے کسی موقعے پر ان سے پوچھا تھا ''ماں! تم ہر وقت کام کرتی رہتی ہو۔ کام کرتے ہوئے تمھارا سر زمین کی طرف جھکا رہتا ہے۔ تم اشعار تخلیق کب کرتی ہو؟ تم ہر بات، ہر رنگ کو کیسے دیکھ لیتی ہو، ان کی عکاسی کیسے کرتی ہو؟''

بہینا بائی نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا، ''کام، عورت کی پہچان ہے۔ میں زمین کے آئینے میں آسمان کا عکس دیکھ لیتی ہوں۔'' اور اس حقیقت کو سنت شاعری کے مداح سب جانتے ہیں کہ بہینا بائی چکی پر اناج پیستے ہوئے اشعار کہتیں اور گنگناتی تھیں۔

شاعری کہاں سے نازل ہوتی ہے؟ شاعر کا شاعری سے کیسا رشتہ ہے؟ یہ تمام حقیقتیں بہینا بائی کی شاعری میں نظر آتی ہیں... ان کی شاعری میں بادل، برسات کی پھواریں نظر آتی ہیں تو کنویں سے پانی بھرتی عورتیں اور قحط سے زمین میں پڑی دراڑیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کمہار کے چاک پر مٹی کا گھومنا، مٹی کو اوپر سے زور زور سے مارنا مگر اندر سے دوسرے ہاتھ سے سنبھالا جانا اور سنبھال کر برتن کی شکل دینا شاعری ہے، برتن کو دھوپ میں سکھا کر، آگ میں پکا کر پختگی دینا شاعری ہے۔ اناج کا چکی میں

ڈالا جانا، دو پاٹوں کے درمیان پس کر آٹا بننا شاعری ہے۔ وہ کہتی ہیں، ''دو پتھروں کی رگڑ سے اناج جس طرح پس کر آٹا بن کر گرتا ہے ویسے ہی شاعری میرے دل کی گہرائیوں سے نکل کر میرے ہونٹوں تک آتی ہے۔''

بہینا بائی کے ہندی اشعار کا جائزہ لیں تو دیوتاؤں کے اوتار لینے کی بابت وہ کہتی ہیں'' دنیا میں جب برائیاں بڑھ جاتی ہیں تو ایشور اوتار لے کر زمین پر آتا ہے۔ جیسے ہی اس کا ظہور ہوتا ہے، اچھائی کا وقت آجاتا ہے۔ زمین سے پاپ ختم ہونے لگتا ہے۔'' مراٹھی میں انھوں نے کہا اور لکھا کہ ''لوگ بے جا فکر کرتے ہیں؟ دنیا میں ایشور کا ظہور ہوا تو کیوں ہوا، یہ سوچنے سے زیادہ اہم یہ سوچ لینا ہے کہ پاپ کا زمانہ ختم ہو کر پنیہ کا دور آرہا ہے۔ اچھائی کی طرف راغب ہونا چاہیے۔''

وہ کرشن بھگوان کی بھکت تھیں۔ انھیں مکمل بھگوان مانتی تھیں۔

کرشن بھگوان کے ظہور سے عقیدت مندوں کے دکھ درد، مصیبتیں، مسائل سب دور ہو جاتے ہیں۔ کھیل کھیل ہی میں انھوں نے کتنے راکششوں کو ختم کر دیا۔

بہینا بائی نے شری کرشن کے دلکش پیرائے کا خوبصورت بیان کیا ہے۔ پیلے رنگ کے کپڑے، بالوں میں مور پنکھ اور ہونٹوں میں بانسری کرشن کی پہچان ہے۔

بہینا بائی مانتی تھیں کہ دکھاوے کی عبادت سے نہیں، سچی بھکتی سے ایشور کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ گیروے کپڑے پہننا، سر منڈا لینا یا جٹائیں بڑھا لینا، ہاتھ میں مالا (تسبیح) گھماتے رہنا بھکتی نہیں ہے۔ سنیاس لینا، غاروں میں جا بسنا، سمادھی لگانا عبادت نہیں ہے۔

سچی عبادت دل سے ہوتی ہے اور سیدھی ایشور تک پہنچتی ہے۔ وہ خود کو خوش نصیب سمجھتی ہیں کہ دھوکہ فریب سے دور رہ کر بھکتی کر سکیں یہ ان کی بھکتی کا ہی پھل تھا جو گھر بیٹھے انھیں ہری کرشن کے درشن ہوئے۔

وہ جانتی تھیں دنیا فانی ہے۔ اس سے دل لگانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ان کے تجربات ان کے پاس تھے جن کی وجہ سے ان کی سوچ کا دائرہ بے حد وسیع اور سلجھا ہوا تھا۔ مستقبل کو دیکھنے والی نظر انھیں حاصل تھی... پھر انھیں یہ بھی یقین تھا کہ اس فانی دنیا سے بخیر و خوبی پار لے جانے والے شری کرشن ان کے ساتھ ہیں۔

دنیا میں جو آیا ہے اسے جانا بھی ہے موت کو قبول کرنا عقل مندی ہے۔ موت سے خوف مناسب نہیں۔ اعمال کے اچھے برے ہونے کا انحصار خود انسان پر ہے۔ اعمال کے اچھے برے ہونے پر ہی جنت جہنم کا داخلہ طے ہوتا ہے۔

پرمیشور کی ماتا کے روپ میں ممتا کے سوتے پھوٹے اور بہینا بائی چاروں طرف بال پرمیشور (ننھے ایشور) کو دیکھنے لگیں۔ پتے پتے میں پرمیشور کی آہٹ محسوس کرنے لگیں، کانوں میں کلکاریاں گونجنے لگیں... مختصراً یہ کہ ننھے ایشور نے بہینا ماں کے لیے چاروں طرف رنگ ہی رنگ بکھیر دیے۔

بہینا بائی مراٹھی سنت شعرا کی اول قطار میں کھڑی نظر آتی ہیں۔ جب وہ کہتی ہیں، دیو (ایشور) کہاں ہے؟ ایشور کہاں ہے؟ پوچھنے والے! ایشور تو تیرے دل میں ہے۔

سنت کبیر بھی تو یہی کہتے تھے۔

زندگی کے ہر پہلو پر بہینا بائی کی نظر تھی۔ وہ ہر بات کو واضح طور پر محسوس کرتیں اور اس سے زیادہ مہارت سے پیش کر دیتیں۔ اخلاقیات کی تعلیم اور تعمیر میں مذہب کی اہمیت کو وہ درج ذیل اقتباس میں واضح کرتی ہیں:

''مذہبی کہہ کر جو باتیں سکھائی جاتی ہیں، مذہبیات کے تحت جو کچھ بچوں کے دماغ میں ٹھونسا جاتا ہے وہ کپڑے میں باندھ کر طاق پر رکھ دینے کی باتیں نہیں ہیں۔ وہ باتیں جسم میں لہو کے ساتھ مل کر، گوشت پوست میں ڈھل کر زندگی میں اتار لینے کی باتیں ہیں۔ مذہب صرف کتابوں میں لکھے جانے یا بحثوں کا موضوع نہیں ہے وہ عمل کا موضوع ہے۔ عمل میں ہی اس کی معنویت ہے۔''

بہینا بائی اوصاف نہ رکھنے والے انسان کو دیکھ کر مایوس ہوتی ہیں۔ ان کے مطابق اچھے اوصاف سے اخلاقیات سے عاری ہونے کا مطلب ہے اشرف المخلوقات خطاب کے لائق نہ ہونا۔ سچا انسان ملنا بہت مشکل ہے مگر وہ اس کی تلاش جاری رکھنا چاہتی ہیں۔

لیکن دنیا اچھے اور سچے انسانوں سے خالی بھی تو نہیں ہے۔ غریبوں، دکھیوں کا دکھ درد دور کرنے والوں، مظلوموں کو انصاف دلانے والوں، رونے والوں کے آنسو پونچھنے والوں، سوکھے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرنے والوں، خدمت خلق کی زندگی کا مقصد ماننے والوں کو بہینا بائی جب دیکھتی ہیں تو جیسے انھیں دیو درشن ہوتے ہیں۔

زندہ رہنے کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے مگر زندگی صرف پیٹ بھر کھانا نہیں ہے۔ من بھی ایک چیز ہے اور یہ من کیا چیز ہے؟ بہینا بائی کے مطابق ''من ایک پرندہ کی مانند ہے۔ تم اس کی تھاہ نہیں پا سکتے۔ ایک پل میں وہ زمین پر ہوتا ہے تو دوسرے پل آسمان میں پہنچ جاتا ہے۔''

کبھی کبھی وہ معصومیت سے ایشور ہی سے پوچھ بیٹھتی ہیں، ''اے ایشور! یہ من آخر ہے کیا چیز؟ اس کی تخلیق آخر ہوئی کس طرح؟ اس کے متعلق لاتعداد خواب دیکھے جاتے ہیں۔ رات کو نیند میں بھی اور دن میں اس وقت بھی جب انسان جاگا ہوا اور مکمل ہوش و حواس میں ہوتا ہے۔ بہینا بائی کی شاعری میں یہ من کئی شکلوں میں موجود ملتا ہے۔

صرف تیس برس کی عمر میں بیوہ ہو جانے والی بہینا بائی شوہر کی موت پر پہلے تو سکتہ زدہ رہ گئیں پھر بے اختیار چیخ اٹھیں ''پیاری دھرتی ماں! کہو تو؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ عظیم الشان درخت تو زمیں بوس ہو جائے مگر اس کا سایہ بنا رہے؟''

مگر جلد ہی انھوں نے خود کو سنبھال لیا.... دلاسہ دینے کے لیے آئی عورتوں سے کہا ''بھلے ہی چوڑیاں توڑی جا چکی ہوں، گلے سے منگل سوتر اتارا جا چکا ہو، پیشانی سے سندور صاف کیا جا چکا ہو، ایشور پر میرا بھروسہ قائم ہے۔ مجھ پر رحم نہ کھاؤ۔ میں قدرت کا کھیل سمجھ چکی ہوں۔ میری زندگی اب میرے ہاتھ میں ہے۔ جس نے مجھ پر یہ مشکل وقت ڈالا ہے وہی اسے برداشت کرنے کی طاقت مجھے دے گا۔''

بہینا بائی عورت ہیں، ماں ہیں، سونے پہ سہاگہ کہ شاعرہ ہیں۔ ممتا کی خوشبو سے ان کی شاعری مہکی ہوئی ہے، ممتا کا امرت چھل چھل چھلکتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کے لیے اپنی زندگی ختم کر دیتی ہے۔ سسرال میں چاہے جو سہنا پڑے سہتی ہے کیونکہ وہ چاہتی ہے کہ بیٹی جب سسرال جائے تو اسے میکہ ضرور ملے... سسرال میں اس پر ظلم ہو تو میکے آکر وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر رو سکے۔

بہینا بائی کی یہ سطور عورت کی عظمت کا اقرار نامہ ہے۔

بہینا بائی کا زندگی اور موت کا فلسفہ بھی خاص الخاص ہے۔ سنسار کیا ہے؟ چولھے پر رکھا ہوا توا ہے جسے ہر دم مصیبتوں کا مسائل کی آگ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے اس کا مقابلہ کرو۔ رونے دھونے سے نہیں بہادری سے سامنا کرنے پر زندگی کی کشتی طوفان سے مقابلہ کر کے بخیریت ساحل سے لگتی ہے۔

اس فلسفے کو ہر کوئی اپنے نظریے سے سمجھتا پرکھتا ہے۔

زندگی اور موت کا فلسفہ ایک پہیلی ہی تو ہے۔

زندگی اور موت کے درمیان کا وقفہ انسان کا میدان عمل ہے جو موت کی آہٹ ہوتے ہی غائب ہو جاتا ہے، باقی صرف کارکردگی رہ جاتی ہے۔

کتابیات

کولہٹ کر، وشواس نارائن: سنت بہینا بائی چی گاتھا۔

گورے ٹاٹا صاحب (201)، سنت بہینا بائی کا ہندی پد ساہتیہ سنچارکا، اورنگ آباد، جولائی ستمبر

دیکشت آنند پرکاش (ایڈیٹر): مراٹھی سنتوں کی ہندی وانی

بھاوے۔ پرا۔ ہا آ۔ بہینا بائی چی گاتھا۔

شرما، ونے موہن: ہندی کو مراٹھی سنتوں کی دین

شیوڑے اندو متی: ہندی کو یتریاں اور کویتا

جنسی ای ایبٹ: مہاراشٹر کوی سنت مالا

دینک مہاودر بھ (مراٹھی)، چندر پور، مول روڈ

دینک لوک مت (مراٹھی): ناگپور، لوک مت بھون، دھنتولی

پونے چتر شالا: شری سنت بہینا بائی یانچی ابھنگ گاتھا

■

Dr. Bano Sartaj Kazi
'Sartaj House', Jindran Nagar
Near 1st MSEB Tower
Pandharkawada Road
Yavatmal - 445001 (MS)

محسن علی

مقدمۂ دیوان فانی گورکھپوری

ایک تجزیاتی مطالعہ

دیوان فانی اردو زبان وادب کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے جو اپنے دل نشیں اسلوب نگارش، عمدہ طرزِ بیان، مختلف اصنافِ سخن اور متنوع موضوعات کے لحاظ سے انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ اتنا وقیع دیوان اب تک کیوں اہل علم وادب کی نگاہوں سے اوجھل اوران کی دسترس سے دور رہا۔ دیوان کی تصحیح ونظر ثانی کے بعد ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی نے دیوان اور صاحب دیوان کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''مشربی طور پر آپ خم خانۂ تصوف کے مست الست تھے، اس لیے آپ کے اشعار میں جو تغزل کا جوہر ہے وہ آپ کے ہم عصر شعرا میں خال خال پایا جاتا ہے۔ پھر سرکار آسی غازی پوری کے دربار عالی کی خاک روبی نے اس رنگ تغزل کو اور چوکھا کر دیا۔ شاعری صرف قافیہ پیمائی نہیں ہے۔ علم عروض کا ماہر بلند شعور شاعر ہو، یہ بھی ضروری نہیں ہے۔ نہ اتنے سے کوئی شاعر نام آور ہو سکتا ہے۔ اچھا شعر وہی ہے جو بلندیِ تخیّل کا حامل ہو اور جس کے لیے الفاظ کا انتخاب اسی کے متناسب ہو۔ اس نقطۂ نظر سے 'دیوان فانی' میں بڑی جامعیت نظر آتی ہے۔ بے شبہ 'دیوان فانی' میخانۂ تصوف کی رحیق مختوم اور خوانِ تغزل کا مزعفر و مطنجن ہے۔''[1]

تعجب کی بات ہے کہ جس شاعر کی شعری عظمت اور فنی کمال کا اعتراف ان کے معاصر اصحاب علم وادب اور اربابِ شعر وسخن نے کیا ہو اور مشاعروں میں جس کا کلام حاصل مشاعرہ قرار پائے اور جس کی شرکت مشاعرے کی کامیابی کی ضامن ہو، ایسے شاعر کا دیوان بے اعتنائی کا شکار رہا اور اس کے مطالعے واستفادے سے اہل علم وادب محروم رہے، جس کی وجہ سے اردو دواوین اور تذکروں میں فانی گورکھپوری اور ان کے مجموعۂ کلام کا ذکر نہیں ملتا اور کہیں ملتا بھی ہے تو بہت کم۔ مقدمے کے مطالعے سے یہ بھی منکشف ہوا کہ اس کے مقدمہ نگار بھی صاحب علم اور فن شناس تھے۔ ایک عظیم علمی وادبی خانوادے کے فرد تھے۔ حضرت فانی کے حاضر باشوں، مجلس نشینوں اور نیاز مندوں میں سے تھے اور ان کے یہاں ان کی آمد ورفت کا سلسلہ بھی خوب تھا۔ وہ اپنے والد وسیم خیر آبادی اور عم محترم ریاض خیر آبادی کے ہمراہ صاحب دیوان کی خدمت میں برابر حاضر ہوتے تھے۔

صاحب دیوان کا تعارف

صاحب دیوان سید شاہ شاہد علی سبز پوش فانی گورکھپوری اپنے عہد کے نامور عالم، باکمال بزرگ اور عظیم شاعر تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ سید شاہ قیام الدین گورکھپوری تھے جن کا سلسلۂ نسب سلطان العارفین میر سید موسیٰ اودھی کے واسطے امیر المومنین خلیفۂ چہارم حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ آپ 20/نومبر 1888 کو جعفرا بازار ضلع گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ چودہویں صدی ہجری کے معروف عالم دین، عظیم شیخ طریقت اور ممتاز صوفی شاعر حضرت مولانا شاہ محمد عبد العلیم آسی غازی پوری (آٹھویں سجادہ نشیں خانقاہ رشیدیہ جون پور) کے تلمیذ اور خلیفہ وجانشیں تھے اور خانقاہ رشیدیہ جون پور کے نویں سجادہ نشیں۔ شاعری میں حضرت شمشاد لکھنوی سے شرف تلمذ تھا۔ حضرت آسی غازی پوری کے بعد خانقاہ رشیدیہ کے سجادہ نشیں ہوئے اور اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خلق خدا کی رشد وہدایت اور راحت رسانی خلائق میں عظیم خدمات پیش کیں۔ آپ کی چار اولادیں تھیں جن میں سید شاہ راشد علی سبز پوش، سید شاہ عارف علی سبز پوش، سید شاہ مصطفیٰ علی سبز پوش اور سید شاہ ہاشم علی سبز پوش شامل ہیں اور چاروں صاحبزادگان علم وفضل اور فکر وفن میں آپ کے سچے وارث وامین تھے۔

حضرت فانی ایک شیخ کامل اور مرشد طریقت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ آپ کا تخلص فانی تھا۔ آپ کا مجموعۂ کلام آپ کے فرزند سید مصطفیٰ علی سبز پوش آنی گورکھپوری نے دیوان فانی کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ آپ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ حضرت فانی گورکھپوری نے بیشتر اصناف میں اپنی جودتِ طبع اور مذاقِ شاعری کا اظہار کیا ہے جن میں نعت، منقبت، قصیدہ، غزل، مثنوی، مثلث، مخمس، رباعی ومسدس وغیرہ مختلف اصناف شامل ہیں۔ آپ نے اپنے پیر ومرشد اور استاذ گرامی حضرت آسی غازی پوری کے دیوان 'عین المعارف' کو جدید ترتیب وحواشی کے ساتھ شائع کرایا اور اس پر ایک مفصل اور معلوماتی مقدمہ ثبت فرمایا جس کے ذریعے علمی وادبی دنیا، حضرت آسی کے شاعرانہ فن سے آگاہ ہوئی جو دیوان آسی کے نام سے معروف ہے۔ آپ کی ایک بہت بڑی لائبریری بھی تھی جس میں عربی، اردو، فارسی کی ہزاروں مطبوعہ کتابوں کے ساتھ ساتھ بہت سے نایاب قلمی نسخے بھی تھے۔ آپ کی جمع کردہ کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ آپ کے چھوٹے فرزند سید ہاشم علی سبز پوش جامی گورکھپوری نے 'خدا بخش لائبریری، پٹنہ' کو دے دیا تھا جو آج بھی 'سید شاہد علی سبز پوش کلیکشن' کے نام سے موجود ہے اور اہل علم وتحقیق برسوں سے اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ آپ نے 27/جولائی 1952 کو وفات پا کر رشید آباد ضلع جون پور میں مدفون ہوئے۔

مرتب دیوان کا تعارف

مرتب دیوان سید شاہ مصطفیٰ علی سبز پوش آنی گورکھپوری صاحب دیوان حضرت فانی کے فرزند وجانشین اور خانقاہ رشیدیہ کے دسویں سجادہ نشین تھے۔ آپ 1922 میں گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ اور جامعہ ازہر قاہرہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ آپ نے بے شمار لوگوں کو اپنے علمی و روحانی فیوض سے سرفراز کیا۔ آپ کا وصال 1958 کو ہوا اور اپنے والد ماجد کے پہلو میں رشید آباد ضلع جون پور میں سپرد خاک ہوئے۔ آپ کو شعر وسخن کا ذوق وراثت میں ملا تھا۔ آپ کا تخلص آنی تھا۔ آپ کی شاعری بڑی بامعنی ہوتی تھی۔ فن شاعری میں اپنے والد حضرت فانی کے شاگرد تھے۔ آپ کا مجموعۂ کلام اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔ آپ نے اپنے والد کے مجموعۂ کلام کو 'دیوان فانی' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا اور اس پر ایک اپنی مختصر اور جامع تحریر بھی رقم کی جس میں حضرت فانی کے شعری اصول اور دیوان فانی کی اشاعت وغیرہ کا ذکر ہے۔ چنانچہ دیوان کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

’’والدصاحب قبلہ اپنے کلام کی اشاعت پسند نہیں کرتے تھے۔ میرے اصرار پر بھی جواب دیتے تھے کہ’’ نظر ثانی کی ضرورت ہے، ممکن ہے کہ فروگزاشتیں ہوں‘‘۔ میرے زیادہ اصرار پر اجازت عطا فرمائی۔ اگر ناظرین کرام کچھ فروگزاشت ملاحظہ فرمائیں تو مقتضہائے بشریت سمجھ کر عفو سے کام لیں۔ والد صاحب قبلہ جناب مولانا شمشاد فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے جملہ قواعد کے سختی سے پابند تھے۔ بعض بعض جگہ خلاف قواعد الفاظ پائے جاتے ہیں۔ جیسے مکان، آسمان وغیرہ میں بے عطف و اضافت کے بھی نون غنہ آگئے ہیں، میں نے [والد صاحب سے] استفسار کیا تھا تو [آپ نے] یہ فرمایا: بعض غزلوں میں جناب وسیم [خیرآبادی] کی فرمائش سے ایسا نظم کیا گیا ہے اور چند اشعار میں جو قواعد کی پابندی اختیار کرنے کے قبل کے ہیں، یوں ہی رہنے دیا گیا ہے۔‘‘[1]

مقدمہ نگار کا تعارف

دیوان کے مقدمہ نگار حضرت اثیم اتر پردیش کے ضلع سیتا پور کے معروف موضع خیر آباد میں 1900 میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کا آغاز اپنے والد حضرت وسیم خیر آبادی سے کیا اور شعری اصلاح بھی انھیں سے لی۔ اس کے بعد وہ 1916 میں مدرسہ نیازیہ میں داخل ہوکر 1921 تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد منبع الطب کالج لکھنؤ میں علم طب کا درس لے کر 1927 میں سند سے نوازے گئے۔ فراغت تعلیم کے بعد آپ نے کچھ دن مطب چلایا۔ اس کے بعد اپنے عم محترم حضرت ریاض خیر آبادی کی طلب پر گورکھپور پہنچ کر ایک اسکول میں اردو اور فارسی کے استاذ مقرر ہوگئے۔ اسی زمانے میں ’گل چین‘ اور ’تحفۂ خوشتر‘ کے نائب مدیر بھی رہے۔ اس کے بعد بہار اور حیدر آباد دکن بھی گئے جہاں 1949 تک آپ کا قیام رہا۔ اس کے بعد آپ خیر آباد واپس آگئے اور یہیں ایک مدرسے میں مدرس اور ’کارواں‘ کے مدیر ہوئے۔ اس کے بند ہونے کے بعد آپ کان پور پہنچ کر اپنی ادارت میں ’جھلک‘ نکالنے لگے۔ آپ نے خیر آباد میں ’انجمن ادب‘ کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا۔ عمر کے اخیر حصے میں زیادہ تر آپ کا قیام کان پور میں تھا، جہاں 1960 سے 1971 تک مدرسہ ارشادیہ اور احسن المدارس میں استاد رہے۔ 6/اپریل 1972 میں داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے سپردِ خاک ہوگئے۔ آپ جہاں بھی رہے تدریسی، علمی اور ادبی سرگرمیاں پوری شان و شوکت کے ساتھ جاری رکھیں۔ آپ کا پورا گھرانہ علم و ادب اور شعر و سخن کا گہوارہ تھا۔ آپ کے دادا سید محمد مہدی غمگین خیر آبادی بھی شاعر تھے۔ آپ کے والد حضرت وسیم خیر آبادی اپنے عہد کے مقبول شاعر اور تلامذۂ امیر مینائی میں ایک بلند مقام رکھتے تھے۔ آپ کے بھائی سید محمد خلیل احمد شمیم خیر آبادی اور ہمشیرہ سیدہ وارث فاطمہ صنوبر خیر آبادی دونوں شعری مذاق اور ذوقِ سخن رکھتے تھے۔ آپ کو نظم و نثر دونوں پر بڑا عبور حاصل تھا۔ نظم میں آپ کو غزل کے علاوہ مختلف اصنافِ سخن میں بھی مہارت تھی۔ آپ کے شعری نمونے ’تذکرۂ شعرائے اتر پردیش‘ اور ’تذکرۂ معاصرین‘ میں درج ہیں۔ آپ کا کلام مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتا تھا۔ مصنف ’تذکرۂ شعرائے اتر پردیش‘ کے بقول:

’’افسوس! اس قدر قادر الکلام اور زود گو شاعر کا کلام زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا اور شاید آئندہ بھی نہ ہو سکے لیکن اس کے سینوں میں اترے ہوئے اشعار بہت دنوں تک اس کے نام اور تذکرے کو زندہ رکھیں گے۔‘‘[3]

مقدمہ دیوان فانی آپ کا بہترین نثری نمونہ ہے جس سے آپ کی عمدہ نثر نگاری، زبان و بیان پر قدرت، اسلوبِ نگارش پر دسترس اور وسعت مطالعہ بخوبی عیاں ہوتی ہے اور اس سے آپ کے علمی مقام اور شعری مرتبے کا بھی اندازہ ہوتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ یہ مقدمہ خود ایک مستقل تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ آپ کے تذکرہ نگاروں نے اس مقدمے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جب کہ اس مقدمے میں نہ صرف صاحب دیوان حضرت فانی گورکھپوری کی حیات و سیرت، ان کے خاندانی احوال، شعری و ادبی خدمات، شاعری میں ان کا مقام و مرتبہ، شعرا و ادبا سے ان کے روابط اور ان سب کا حضرت فانی کے علم و فضل اور کمال فکر و فن کا اعتراف کے علاوہ دیوان فانی کی ترتیب و تدوین کے ایام کے احوال و کوائف وغیرہ پر تفصیلی روشنی ملتی ہے بلکہ اسی ضمن میں خود مقدمہ نگار، ان کے والد حضرت وسیم خیر آبادی اور ان کے عم محترم حضرت ریاض خیر آبادی کے حوالے سے بھی نادر معلومات ملتی ہیں اور شعر و ادب میں ان کی اہم دریافتیں بھی سامنے آتی ہیں۔ ان تینوں حضرات کے دیگر شعرا و ادبا سے تعلقات وغیرہ کا بھی ذکر جگہ جگہ ملتا ہے نیز یہ کہ آپ اور آپ کے خانوادے کا تعلق حضرت فانی سے نہایت گہرا اور بڑا دیرینہ تھا۔

دیوان فانی کے اب تک تین اشاعتی مراحل عمل میں آئے ہیں جن میں پہلا نسخہ 1956 میں خود مرتب دیوان سید مصطفیٰ علی سبز پوش گورکھپوری کا شائع کردہ ہے، دوسرا نسخہ انجمن فیضان رشیدی کمرہٹی کلکتہ کے زیر اہتمام 1998 میں طبع ہوا ہے جب کہ تیسرا نسخہ شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن نئی دہلی نے 2019 میں شائع کیا ہے جو اَب تک کا تازہ ترین اور محقق نسخہ ہے۔ نسخۂ دہلی میں مرتب دیوان کے دیباچے اور اثیم خیر آبادی کے مقدمے کے ساتھ ’ابتدائیہ‘ بھی شامل ہے جس میں مرتب اور مقدمہ نگار کے کچھ احوال و کوائف کو بیان کیا گیا ہے جب کہ نسخہ کلکتہ میں مرتب دیوان کے دیباچے کی بجائے ناشر کا پیش لفظ ہے۔ نسخہ دہلی 525/صفحات پر مشتمل ہے جس میں 108/صفحات پر سید امیر احمد اثیم خیر آبادی کا طویل اور مبسوط مقدمہ ہے۔ مجھے یہاں دیوان فانی پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس کے مقدمے کا ایک تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے علمی و ادبی اور معلوماتی اعتبار سے اس کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالنی ہے۔

مقدمۂ دیوان کی علمی و ادبی افادیت

اثیم خیر آبادی کا یہ مقدمہ فانی گورکھپوری کی حیات اور شاعری پر نہایت ہی معلوماتی اور مستند تحریر و دستاویز ہے جس کو آپ نے خود صاحب دیوان کی حیات اور ان کے یہاں رہ کر لکھا ہے اور اپنے خاندانی بزرگوں کی فراہم کردہ معلومات اور اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات کی روشنی میں قلم بند کیا ہے جیسا کہ اس کا ذکر آپ نے جا بہ جا اپنے مقدمے میں کیا ہے۔ ایک جگہ آپ یوں خامہ فرسا ہیں:

’’والد قبلہ اور عم بزرگ وار آپ کے یہاں اکثر قدم رنجہ فرماتے تھے۔ کبھی حسب طلب کبھی بذوقِ خود۔ جب کوئی شاندار مشاعرہ ہونے والا ہوا یا جب مولوی صاحب مذکور کے یہاں مشاہیر ملک سے کچھ اربابِ سخن تشریف لائے تو ان حضرات کو مجھ کو اور میرے بھائی شمیم سلمہ کو اور بسا اوقات اپنے دیگر تلامذہ و احباب کو ساتھ لے کر ضرور تکلیف کی۔ لطف سخن رہتا تھا۔ سنتے تھے، سناتے تھے، نقد و تبصرہ، تبادلۂ خیالات، ادبی مکالمات، علمی مناظرات اور مختلف مباحث رہتے تھے۔‘‘[4]

اس طرح یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ حضرت فانی کے علم و فن کے تعارف میں خیر آبادی شعرا یعنی مقدمہ نگار اثیم خیر آبادی، ان کے والد بزرگ وار وسیم خیر آبادی اور عم محترم ریاض خیر آبادی نے اہم کردار پیش کیا ہے۔ واضح رہے کہ مقدمہ نگار نے صاحب دیوان کو ’حضرت فانی‘ سے کم اور ’شاہ صاحب‘ سے زیادہ مخاطب کیا ہے۔ مقدمہ نگار کے حوالے سے کچھ اہم معلومات خود مقدمے ہی سے فراہم ہوتی ہیں، مثلاً یہ کہ آپ بھی آل انڈیا مشاعرۂ گورکھپور (1942) کے ایک رکن تھے۔ نیز یہ کہ مقدمہ نگار نے حضرت فانی کے حوالے سے کچھ نادر معلومات کو شامل مقدمہ نہیں کیا ہے جیسا کہ مجنوں گورکھپوری کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’شاہ صاحب کو درمیان میں ڈال کر مجھ سے یہ معاملہ کرنا چاہتے تھے کہ عم محترم حضرت ریاض کا دیوان طبع کریں۔ ان کی ضدیں، عم بزرگوار کی فہمائشیں، بابو بدری پرشاد صاحب قمر،

بابو رنگ بہادر لال صاحب جگر، وکلائے گورکھپور اور دوایک اور احباب گورکھ پور کی کوششیں اور سب کامل کران کو مجبور کرنا کچھ عجب لطف رہ چکا ہے۔ بہت سی تحریریں بطور یادگار میں نے رکھ چھوڑی ہیں۔خیر! چھوڑیئے۔''[5]

مقدمہ نگار نے جہاں حضرت فانی نیز اپنے خانوادے کے بزرگوں سے متعلق اپنے چشم دید واقعات، بصیرت افروز نظریات اور مستند روایات کو اپنے مقدمے کا حصہ بنایا ہے، وہیں اپنے والد گرامی اور عم محترم کی روایت کردہ باتوں سے بھی اپنے مواقف کو مبرہن کر کے اور باوزن بنادیا ہے، نیز آپ نے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں بھی چیزوں کو تحریر فرمایا ہے۔ دیوان کی ترتیب وتدوین اور تحریر مقدمہ کا کام صاحب دیوان ہی کی حیات میں ہوا تھا۔مثلاً اپنے مقدمے میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:

''میں آپ ہی کے یہاں مقیم اور اس مضمون اور آپ کے کلام کی تدوین میں مصروف تھا کہ جارج اسلامیہ انٹر کالج، گورکھپور بسلسلہ علمی نمائش قرار پایا کہ شاندار پیمانے پر ایک آل انڈیا مشاعرہ کیا جائے۔''[6]

مقدمے کی ترتیب بھی خوب ہے۔اس میں حضرت فانی کی حیات وسیرت کے اہم پہلوؤں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی علمی، اخلاقی، روحانی، ادبی وشعری خدمات اور سرگرمیوں کو بڑی شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور شاعری کے موضوعات پر بھی تبصرہ کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

مقدمہ نگار نے صاحب دیوان کے اندازِ مطالعہ، طریقۂ خواندگی، کمالِ انہماک، شوقِ مطالعہ، قوتِ حافظہ، ذہانت دادی، استحضارِ علمی وغیرہ پر بھی خاص طور پر گفتگو کی ہے، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یہ مطالعہ سرسری نہیں، گہری نظر اور افادۂ نقطۂ نگاہ سے کرتے تھے۔ اساتذۂ اردو اور فارسی کے دواوین دیکھتے وقت ایراد واسناد کا بھی کام کرتے چلتے تھے۔ دومصرعوں کے بیچ کی نالی اور حواشی پر ذہن سے ترتیب دادہ نشان لگاتے اور ایک آدھ سندی شعر جلد کے اِدھر اُدھر کے سادہ کاغذ پر اتارتے جاتے تھے۔ جمع رکھا جائے تو یہ ایک سرمایہ ہے۔ تبصرہ وتنقید اور لغات نویسی کے کام کی چیز بجائے خود بھی ضخیم مجموعہ ہو جائے گا۔''[7]

اثیم نے صاحب دیوان کی اخلاقی وروحانی شخصیت اور ان کی بافیض محافل ومجالس کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے ان کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی ہے، ایک جگہ وہ رقم طراز ہیں:

''تصوف کے رموز واسرار، روحانیت کے حقائق ومعارف یا پھر خدا اور خاصانِ خدا کا ذکر، اذکار اُن کا خاص موضوع اور دلچسپ مشغلہ ہے اور ہر عنوان کا آخر الکلام۔ ہزاروں روایتیں اور سیکڑوں مضامین کتابوں کے اقتباسات، بزرگوں کے ارشادات، اولیاء اللہ کے کلمات اور مفصل بیانات مع ماخذ وحوالہ جات نوکِ زبان پر ہیں۔ بات چھڑی اور سلسلہ چلا۔ عموماً ایسا سماں بندھ جاتا ہے کہ روح وجد میں آجاتی ہے۔''[8]

مقدمہ نگار نے حضرت فانی کے کتب خانے کا بھی ذکر کیا ہے اور اہل علم وادب میں اس کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے چنانچہ لائبریری کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کتب بینی کے ذوق میں کتابیں کافی جمع کیں۔اچھا خاصا ایک کتب خانہ ہو گیا۔اکثر کم یاب ونایاب ونادر کتابیں مہیا کرلیں۔ایسے بھی چند نسخے ہیں جن کا ثانی دستیاب ہونا دشوار ہے۔ایک کتاب تو ایسی نادر ہے کہ دنیا میں نظیر نہیں۔''[9]

مقدمہ نگار نے بیان کیا ہے کہ اس لائبریری سے پروفیسر احمد صدیق مجنوں گورکھپوری جو اردو زبان وادب کے معروف نقاد ومحقق تھے، نے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے اور یہاں برابر ان کی آمد ورفت رہتی تھی اور وہ میر تقی کے برادر خرد میر اثر، بیدار اور کاشف لکھنوی کے غیر مطبوعہ دیوان ایوان میں شائع کرنے کے لیے یہیں سے لے جاتے تھے۔

مقدمہ نگار نے حضرت فانی کی علمی، ادبی اور شعری سرگرمیوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور بعض مشاعروں میں آپ کے پڑھے گئے کلام پر عمدہ تبصرہ بھی کیا ہے، چنانچہ 'دیوان فانی' کے طویل مقدمے میں انھوں نے ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میرے والد اور جگر بسوانی کے مابین خصوصی تعلقات تھے۔میرے والد ہی کی وساطت سے جگر بسوانی حضرت فانی کی علمی وادبی شخصیت سے متعارف ہوئے اور ان کو حضرت فانی سے ملاقات کا اشتیاق ہوا، یہاں تک کہ انھوں نے حضرت فانی کو اپنے وطن بسواں میں مدعو بھی کیا تھا جس میں حضرت فانی کی شرکت تو نہیں ہوئی تھی البتہ آپ کا کلام ضرور پہنچا تھا۔ جب جگر بسوانی کی ملاقات حضرت فانی سے ہوئی تو انھوں نے یاد دلاتے ہوئے کہا کہ:

''آپ کو تکلیف دینا چاہی تھی۔خیر آپ تو معذور رہے۔غزل پہنچی تھی۔یہ شعر تو گویا حاصل مشاعرہ رہا۔

اے دست کرم ہمت سائل کی ذرا شرم
کونین سے بھرتے نہیں دو ہاتھ دعا کے''[10]

اس شعر کی اہمیت ومعنویت پر تبصرہ کرتے ہوئے اثیم خیر آبادی نے لکھا ہے:

''واقعی شعر ہی کچھ ایسا ہے کہ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ ایک مشاعرہ کیا، یہ شعر اپنے مضمون کی نوعیت کے اعتبار سے اس زمین میں جتنے مشاعرے ہوں، سب کا حاصل رہے گا۔''[11]

آپ کی شعری اصناف کو بیان کرتے ہوئے مقدمہ نگار نے تحریر کیا ہے:

''شاہ صاحب کو غزل گوئی سے زیادہ شغف رہا۔دو تین خمسے بھی ہیں اور لاجواب ہیں۔صاحب غزل کی زبان میں ایسی زبان ملائی ہے کہ امتیاز ناممکن ہے۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے۔رباعیاں بھی چند ہیں۔ قصیدے کے بارے میں فرماتے تھے: ''اہل دنیا کی مدح میرے لیے عار ہے۔'' ایک بار نعت میں قصیدہ کہنا شروع کیا تھا۔ پندرہ بیس شعر ہوئے تھے کہ خیال ہوا کہ میرے طائر وہم وخیال کی انتہائی پرواز بھی باعث کمال منقصت ہوگی، اس لیے اس خیال کو ترک کردیا۔احباب کی فرمائش سے البتہ قصیدے قلم برداشتہ اُنھیں کے نام سے لکھ کے دے دیے۔ایک مثنوی بھی کہی تھی؛ مگر ضائع گئی۔''[12]

مقدمہ نگار نے حضرت فانی کی تضمین نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس کی اہمیت وافادیت کو پیش کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

''تضمین میں شاہ صاحب کو عجب ملکہ اور شغف ہے۔ قریب قریب شاعروں کے ہر مصرع پر مصرع لگائے جو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر غزل جس میں تضمین کا مصرع ہے، واضح کردیا گیا ہے۔ناظرین محظوظ ہوں گے۔''[13]

حضرت فانی نے اساتذہ کی غزلوں پر بھی بلند پایہ اور بصیرت افروز غزلیں کہی ہیں، چنانچہ مقدمہ نگار لکھتے ہیں:

''زبان اور انداز بیان پر قدرت ایسی ہے کہ جو کہنا چاہتے ہیں، خوب کہتے ہیں۔شاہ صاحب کی اکثر غزلیں اساتذہ کی غزلوں پر ہیں، خصوصاً حضرت داغ اور حضرت امیر مینائی کی غزلوں پر۔کچھ غزلیں آتش کی غزلوں پر بھی ہیں۔ ذوق ومومن کی زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔میر کی طرح میں دوایک غزلیں ہیں؛ مگر خصوصیت یہ ہے کہ جس کی غزل ہے، وہی رنگ غالب ہے۔ ناظرین خود ہی ملاحظہ فرمائیں گے۔''[14]

حضرت فانی اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان میں بھی شاعری کرتے تھے جس کے کچھ نمونے دیوان میں بھی ملتے ہیں لیکن اثیم خیر آبادی کے بقول حضرت فانی کا فارسی کلام ضائع ہو گیا ہے، جیسا کہ وہ رقمطراز ہیں:

''کبھی کبھی فارسی میں بھی کہتے تھے۔بعد میں ترک کی اس خیال سے کہ اردو ہی میں جو اپنی زبان ہے، امتیاز پیدا کرنا آسان نہیں۔دوسری زبان میں اہل زبان کے سامنے کیا درجہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ غالباً فارسی کا کلام تلف ہوا۔چند اشعار ملے جو مشاقی اور قدرت کا نمونہ ہیں۔''[15]

اس مقدمے میں حضرت فانی کی شخصیت اور شاعری کے ضمن میں ان کے پیر ومرشد حضرت آسی غازی پوری اور شاعری کے استاذ حضرت شمشاد لکھنوی کا بھی ذکر کیا گیا

ہے اور ان کے حوالے سے خاصا مواد مقدمے میں جمع کردیا ہے۔ حضرت فانی کی کیفیت شاگردی اور طریقۂ استفادہ وغیرہ کو بیان کرتے ہوئے حضرت فانی کی قدرومنزلت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ حضرت فانی کو شمشاد لکھنوی سے چار پانچ غزلوں پر اصلاح لینے کا موقع ملا اور ان کا طریقۂ اصلاح بھی منفرد اور قابل رشک تھا جیسا کہ مقدمہ نگار کہتے ہیں:

''ان کا اصلاح لینے کا طریقہ عام انداز سے جدا گانہ اور کمال استفادہ کو لیے ہوئے تھا۔ غزل کے ساتھ ان کے علوفکر، رسائی ذہن، سلیقۂ حسن، نشست وانتخاب، الفاظ کی اصلاح اور بجمیع حیثیات قوت فکریہ کی ترقی ہوجاتی تھی، بصیرت تامہ حاصل ہورہی تھی، ملکہ بڑھتا ہی جاتا تھا اور وجوہِ اصلاح دل نشیں ہوتے جاتے تھے۔''[16]

جب یہ غازی پور جاتے تو اپنے پیر ومرشد کے آرام فرمانے کے وقت دو پہر کو خود حضرت شمشاد کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور عرض کرتے: ''جو لفظ بدلوانا ہو، مجھ ہی سے بدلوایئے۔'' جب تک استاذ کے پسند کا لفظ نہ مل جاتا، طبیعت پر زور دے کر الفاظ بدلتے جاتے تھے۔ تمام زمانۂ اصلاح میں دو تین مرتبہ انھوں نے اظہارِ عجز کیا اور مولانا شمشاد نے لفظ رکھا۔ یہاں تک کہ ایک روز کسی شعر کے ایک لفظ پر استاد وشاگرد دونوں میں دیر تک مکالمہ رہا۔ حضرت فانی نے استاد محترم حضرت شمشاد کا لفظ ادباً قبول کرلیا اور یہاں سے فارغ ہوکر اپنے شیخ کامل حضرت آسی غازی پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت آسی نے پوچھا: ''میاں شاہد! کہاں گئے تھے؟'' حضرت فانی نے کہا: حضرت شمشاد کی خدمت میں۔ حضرت آسی نے فرمایا: ''اصلاح کے لیے کوئی غزل لے گئے تھے؟'' حضرت فانی نے کہا: جی حضور۔ حضرت آسی کا حکم ہوا: ''سناؤ!''۔ حضرت فانی نے سنائی تو حضرت آسی نے فرمایا: ''مولوی شمشاد صاحب نے کیا اصلاح دی؟''۔ حضرت فانی نے اپنا شعر اور اپنے استاد مولانا شمشاد کی اصلاح پیش کی۔ حضرت آسی نے فرمایا: ''تمہارا لفظ بہتر ہے''۔ اس کے بعد حضرت فانی کو تشفی ہوئی۔ صاحب دیوان کے طریقۂ اصلاح و استفادہ پر بصیرت افروز تبصرہ کرتے ہوئے مقدمہ نگار کہتے ہیں:

''یہ طریقہ غیر معمولی افادی پہلو رکھتا ہے۔ استاد شفیق مل جائے تو یوں ہی اصلاح لینی چاہیے۔ یہ اکثر کہتے ہیں اور ٹھیک کہتے ہیں کہ ان چار پانچ غزلوں کی اصلاح سے جو نفع مجھ کو حاصل ہوا، اگر سیکڑوں غزلیں بھیج کر اصلاح لی جاتی تو نہ ہوتا۔''[17]

حضرت فانی کا دولت کدہ اہل علم وفن کا مسکن اور فکر وادب کا گہوارہ بن چکا تھا۔ آپ کے یہاں بڑی تعداد میں اہل علم پہنچتے۔ علمی وادبی مجالس خوب آراستہ ہوتیں اور مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ مقدمہ جہاں حضرت فانی کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے بیش بہا معلومات فراہم کرتا ہے، وہیں دیگر شعرا وادبا کے بارے میں بھی گراں قدر مواد فراہم کرتا ہے۔ مثلاً وسیم خیرآبادی، ریاض خیرآبادی، بیخود دہلوی، افضل لکھنوی وغیرہ کے بارے میں نادر معلومات موجود ہیں۔ اس مقدمے کی روشنی میں بیخود دہلوی اور فانی گورکھپوری، وسیم خیرآبادی اور فانی گورکھپوری، ریاض خیرآبادی اور فانی گورکھپوری وغیرہ کے عنوانات سے بڑے اچھے مضامین لکھے جاسکتے ہیں اور اس حوالے سے مقدمہ نگار نے بڑی طویل اور تفصیلی گفتگو کرکے قابل قدر مواد مہیا کردیا ہے۔ مقدمے کی روشنی میں معاصر شعرا وادبا اور اصحاب علم و دانش میں سے حضرت فانی کے درج ذیل حضرات سے تعلقات وروابط تھے:

بیخود دہلوی، وسیم خیرآبادی، ریاض خیرآبادی، افضل لکھنوی، احسن مارہروی، اصغر گونڈوی، عزیز لکھنوی، صفدر مرزاپوری، عالم لکھنوی، سیماب اکبرآبادی، وصل بلگرامی، فصاحت لکھنوی، عشرت لکھنوی، ابر قدوائی، ناطق کانپوری، جگر بسوانی، ظریف لکھنوی، ہادی مچھلی شہری، مولانا عبدالباری آسی، برہم فتح پوی، حسرت موہانی، ثاقب لکھنوی، اثر لکھنوی، سائل دہلوی، مجنوں گورکھپوری، ممتاز حسین ایڈیٹر اودھ پنچ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آپ کے معاصرین آپ کے علم وفن کے مداح اور فضل وکمال کے معترف تھے۔ چنانچہ بیخود دہلوی سے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے مقدمہ نگار نے لکھا ہے:

''حضرت بیخود ان کے یہاں گورکھپور آ بھی چکے ہیں۔ تفصیل یہ ہے کہ 1942 میں جگہ جگہ مشاعرے ہورہے تھے۔ گورکھپور میں بھی ایک معرکہ آرا مشاعرہ طے پایا۔ آخر مارچ یا اول اپریل میں کوئی تاریخ معین ہوئی، جناب حبیب احمد صاحب صدیقی یہاں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ انتظام انھیں کا تھا۔ شاہ صاحب سے ان کے خاص مراسم تھے۔ انھوں نے شاہ صاحب کو مجبور کیا کہ حضرت بیخود کو بلوایے! صحیفۂ شوق روانہ کیا گیا۔ موصوف آئے۔ مصافحے معانقے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

''گورکھپور کی تو کوئی طاقت مجھ کو مجبور نہیں کرسکتی تھی۔ جناب کے حکم نامے کے بعد اگر فرشتۂ اجل بھی تشریف لاتے تو میں ان سے معذرت کرتا کہ بھائی! مجھے اتنا موقع عنایت فرمایئے کہ جناب شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر حکم کی تعمیل کرلوں۔ وہاں سے واپسی کے بعد آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔''[18]

اسی طرح حکیم برہم فتح پوری بھی ایک فاضل شخص گزرے ہیں جن کا تذکرہ کرتے ہوئے مقدمہ نگار لکھتے ہیں:

''اربابِ وطن سے ان کے قدردانوں میں میرے ایک محترم بزرگ خاص شخصیت رکھتے ہیں۔ جناب حکیم برہم مرحوم فتح پوری، ایڈیٹر 'مشرق' گورکھپور کی نظر جوہر شناس میں آپ کی بڑی قدر وقیمت تھی۔ 'تحفۂ خوشتر' کے ہم زمانہ 'مشرق' کی فائل اٹھا کر دیکھیے کہ وہ آپ کے کلام پر کس طرح تبصرہ فرماتے ہیں۔ اس وقت کا 'مشرق' ادبی حیثیت، ناقدانہ نوٹوں اور ایڈیٹوریلوں کے اعتبار سے معیاری اور مستند اخبار سمجھا جاتا تھا۔''[19]

مقدمہ نگار نے اس بات کی مکمل صراحت کی ہے کہ حضرت فانی کی نغز گوئی، خوش فکری اور کمالِ فنی کا یوں تو ہر شخص ستائش گر تھا، مگر حضرت جگر بسوانی جو حضرت امیر مینائی کے تلامذہ میں باقیات الصالحات سے ہیں اور کامل الفن ہیں، یہ آپ کی بہت زیادہ مدح سرائی فرماتے تھے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دیوان فانی ایک ادبی سرمایہ ہے اور اس کا مقدمہ صاحب دیوان کے احوال وکوائف اور ان کے علمی وادبی آثار پر ایک نہایت مستند اور وقیع دستاویز ہے جو بڑی قدر واہمیت کی حامل ہے۔ مقدمے کی اہمیت اور گوناگوں خصوصیات کے پیش نظر اس کو کتابی شکل میں بھی مرتب کرکے ضرور شائع کرنا چاہیے تاکہ حضرت فانی کا علمی وادبی تعارف اصحابِ علم وادب میں ہونے کے ساتھ ساتھ خود اثیم خیرآبادی کی یہ بیش قیمت تحریر بھی اہل علم کے مطالعۂ میز کی زینت بنے اور لوگوں کو اس مقدمے کا بھی بخوبی علم ہوسکے۔ دیوان فانی تک رسائی ہر ایک کی نہیں ہوسکتی ہے تاہم یہ مقدمہ اگر الگ سے کتابی شکل میں مرتب ہوکر شائع ہوجائے تو نہ صرف اس سے استفادہ آسان ہوگا بلکہ ایک اہم علمی کام بھی انجام پائے گا۔

حوالہ جات

1 دیوان فانی، ص: 26/27، ناشر شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن، نئی دہلی- 2019
2 ایضاً ص: 29
3 تذکرۂ شعرائے اترپردیش حصہ سوم، ص: 20، از عرفان عباسی
4 دیوان فانی، دیوان فانی، ص: 59، ناشر شاہ عبد العلیم آسی فاؤنڈیشن، نئی دہلی- 2019
5 ایضاً ص: 75
6 ایضاً ص: 67
7 ایضاً ص: 44
8 ایضاً ص: 43
9 ایضاً ص: 44
10 ایضاً ص: 66/67
11 ایضاً ص: 67
12 ایضاً ص: 81
13 ایضاً ص: 122/123
14 ایضاً ص: 82
15 ایضاً ص: 77
16 ایضاً ص: 80
17 ایضاً ص: 81
18 ایضاً ص: 68/69
19 ایضاً ص: 70

Dr. Mohsin Ali
Dept of Persian, Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

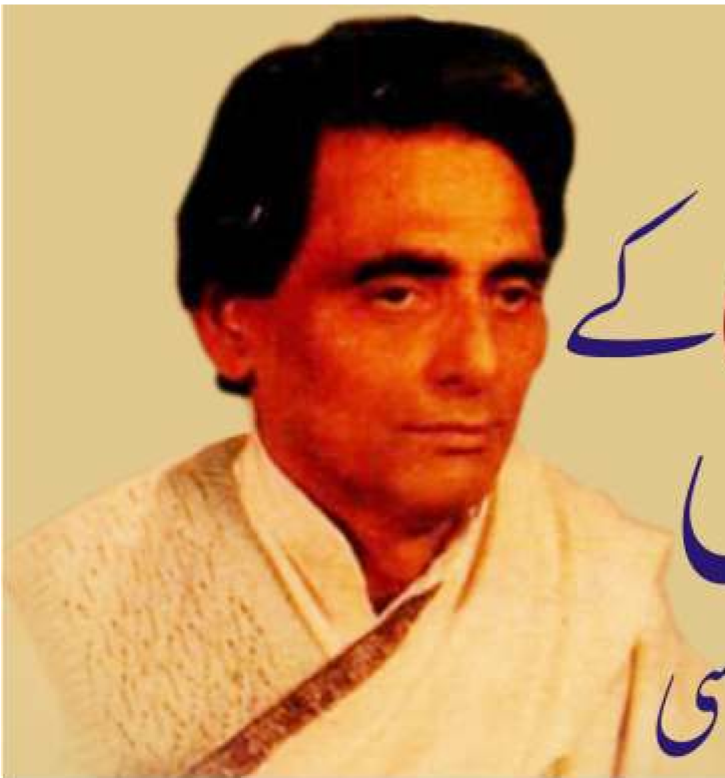

احسان عالم

منظر کاظمی کے افسانوں میں

سماجی اور سیاسی حالات کی عکاسی

"منظر کاظمی کا شمار بہار کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوی سفر کا آغاز بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے کیا۔ ان کا پہلا افسانہ 'زہر کی پوٹ' تھا۔ انھوں نے روایتی انداز کے افسانوں سے اپنا تخلیقی سفر شروع کیا لیکن جلد ہی اپنے منفرد انداز بیان اور انفرادی فکر کے سبب اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہوگئے۔ جس زمانے میں ان کے افسانے قارئین کے درمیان پسند کیے گئے وہ دور جدیدیت کا تھا۔"

منظر کاظمی کا شمار بہار کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوی سفر کا آغاز بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے کیا۔ ان کا پہلا افسانہ 'زہر کی پوٹ' تھا۔ انھوں نے روایتی انداز کے افسانوں سے اپنا تخلیقی سفر شروع کیا لیکن جلد ہی اپنے منفرد انداز بیان اور انفرادی فکر کے سبب اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہوگئے۔ جس زمانے میں ان کے افسانے قارئین کے درمیان پسند کیے گئے وہ دور جدیدیت کا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علامتی اور تجریدی افسانے ناقدین کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے مگر ترسیل کا مسئلہ اتنا اہم تھا کہ قاری خود کو ٹھگا ہوا محسوس کرتا تھا۔ ایسے میں منظر کاظمی نے اپنے افسانوں میں ابہام سے پاک بیانیہ اپنا کر مخصوص جگہ بنالی۔ انھوں نے زمینی حقیقت سے کبھی چشم پوشی نہیں کی۔ زبان و بیان کا رنگ بھلے ہی زیادہ ہو مگر جذبے اور قصے میں سچائیاں ہی ہماری افسانوی روایت کا خاصہ رہی ہیں۔ معاشرے کی حقیقت اور سیاست کی رنگت کہانیوں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ فن کار سماج کا ایک فرد ہوتا ہے۔ وہ بھی عام انسان کی طرح اپنے سماج میں جیتا ہے۔ ماحول سے اثر پذیر ہوتا ہے البتہ وہ قدرے حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ اوروں سے زیادہ سوچتا اور احساس کرتا ہے۔ اس لیے چھوٹا سے چھوٹا واقعہ اور حادثہ سے اثر انداز ہونا اس کی فطرت بن جاتی ہے۔ انھیں واقعات و حادثات میں کچھ ان کے ذہن میں کہانی کا عنوان بن جاتے ہیں اور اس موضوع کو وہ تخلیق کے مراحل سے گذار کر پھر ہمارے معاشرے کے سامنے رکھ دیتا ہے۔

گویا تخلیق کار ہمیں وہی دیتا ہے جو ہمارے لیے اجنبی نہیں ہوتا۔ لیکن قوت پرواز اور قوت تخیل سے وہ اس موضوع میں ایسے مواد ڈال دیتا ہے کہ انسان کے ذہن پر اس کا فوری اثر ہوتا ہے۔

منظر کاظمی کے افسانے ان کے تجربات و مشاہدات کے آئینہ دار ہیں۔ یہ مشاہدے ان کی زندگی کا سرمایہ ہیں۔ یہ وہ قیمتی اثاثے ہیں جن پر شخص کو ناز کرنا چاہیے۔ انھوں نے گاؤں سے شہر تک کا سفر اور اس سفر سے حاصل توشۂ زندگی کو اپنی تخلیق کا اصل مانا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یاد نہیں وہ کون سی گھڑی تھی کہ قصہ سنتے سنتے، قصہ سنانے کی ایک بات سامنے آکر ٹھہر گئی۔ ہزار کوششوں کے باوجود ندی، تالاب، پنگھٹ، چاندنی اور چوپال کی یادوں کے سائے ذہن کی دہلیز سے نہیں اترتے۔ ویسے ان کا کوئی نقش مرتب نہیں ہو پاتا لیکن جدید معاشرے میں زندگی جینے کا سارا فریب کبھی کبھی پشت پر سوار ہو کر مخالف سمت میں سفر کی ترغیب دلاتا ہے اور ہم کہ بہر طور نئے عہد کے لوگوں میں شمار کیے جانے کی تمنا رکھتے ہیں۔ ہر آن آگے بڑھنے کی کوشش میں لگے ہیں اور یوں کمر جھکتی جاتی ہے اور قصہ پیچیدہ ہوتا جاتا ہے۔ بہ ظاہر کسی افسانے کا سرا کسی دوسرے افسانے سے نہیں ملتا لیکن اندرون کا عالم یہ ہے کہ تمام افسانوں کا بس ایک ہی قصہ ہے جس پر بے نام سا گہرا سایہ منڈلاتا رہتا ہے، قصہ افسانہ کب بنا، یہ ایک ایسی کہانی ہے جس کی ابتدا کا ہمیں کوئی اندازہ نہیں... ہماری تحریر کہ جس پر وقت کے تیس سال گذر چکے ہیں۔ ہماری ذات کا وہ منظر نامہ ہے جس کے پس منظر سے افسانہ نگاری کے نام پر نوحہ خوانی کی آواز ابھرتی ہے۔ واقعات نوحہ خواں ہیں.....''

(قصہ ہماری تحریر کا، کہکشاں ریکھا، ص 10-9)

ان کا افسانہ 'سیاہ غلاف اور کالے جرنیل' یوں تو اسلامی واقعات اور بالخصوص محمدؐ کی زندگی پر تحریر کردہ افسانہ ہے مگر اس کی بنت میں منظر کاظمی نے کئی سوالات قائم کرتے ہوئے چند آفاقی مسائل سے روبرو کیا ہے۔ انھوں نے اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا ہے کہ انسان کے

چاہنے سے سب کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہاں تک کہ جنگ میں بھی فتح اس کی ہوتی ہے جس کی فتح ہونی ہوتی ہے۔ اس نکتے کو افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

منظر کاظمی کے ہر ایک افسانے میں کس نہ کسی مسئلے کو پیش کیا گیا ہے۔ ماجرا اگر سماجی اور سیاسی نہ بھی ہو تب بھی کہانی بیان کرتے ہوئے ایک معاشرتی نباض کی طرح قارئین کو چونکا دیتے ہیں۔ علامتوں اور اشاروں سے وہ ساری باتیں ہمارے روبرو کر دیتے ہیں جن کے باطن میں ہمارا معاشرہ آئینہ ہوا ہے۔ ان کا افسانہ 'آسمان سے گرتی روٹیاں' اسلامی واقعات بطور خاص حضرت یوسف، حضرت موسیٰ اور فرعون کی کہانی کو علامتی انداز سے پیش کرنے کے لیے مشہور ہے۔ لیکن اس میں زندگی کے رموز سے بھی آشنائی ہوتی ہے۔ 'آسمان سے گرتی روٹیاں' کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے اور اس کے اندرون سے برآمد محنت ومشقت کا درس محسوس کیجیے:

''ہوا یہ کہ ایک قصہ جو ہم نے کچھ دنوں پہلے سنا ہے۔ انھوں نے بہت پہلے سن لیا تھا۔ مگر انھیں صرف ایک بات یاد ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب روٹیاں آسمان سے گرتی تھیں۔ اور ہم اس کے علاوہ بھی جانتے ہیں کہ آسمان سے روٹیاں اب کیوں نہیں گرتیں۔ ہم اپنے کمرے میں بیٹھ کر کھلے آسمان کو دیکھتے ہیں اور ہمارے اردگرد ننگی دیواریں ہیں اور اوپر چمکتا ہوا چاند ہے کہ جس کی ٹھنڈی روشنی میں مسلسل تلاش کے باوجود کوئی روٹی نظر نہیں آتی اور کچھ لوگوں کے ہاتھ اوپر کی طرف اٹھے ہوئے ہیں کہ وہ اب تک ایک پرانے قصے کو فراموش نہیں کر سکے۔''

(افسانہ 'آسمان سے گرتی روٹیاں'، لکشمن ریکھا، ص 22)

منظر کاظمی کے افسانوں میں فسادات کا بیان نہایت ہی احسن طریقے سے ہوا ہے۔ وہ فساد کی تصویر کشی پر اکتفا نہیں کرتے ہیں جب کہ ان محرکات پر ان کی نگاہ رہتی ہے جس سے آپسی بھائی چارے کا ماحول اچانک سے کشیدگی میں تبدیل ہوجاتا ہے اور خون خرابہ شروع ہوجاتا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے لکشمن ریکھا میں شامل ایک کہانی بعنوان 'سوگز پر دفن ایک کہانی' ہمیں احساس دلاتی ہے کہ انسان کو حیوان بننے میں دیر نہیں لگتی۔ اس افسانے میں جمشید پور کے دنگے ہیں۔ اپنے پڑوسی کے ہاتھوں شہید کیے گئے مشہور افسانہ نویس زکی انور کو یاد کیا گیا ہے۔ اس افسانے کی ایک کیفیت محسوس کیجیے:

''اور یہ وہی رات تھی جب ایک اجنبی دروازے کھول کر اپنے ایک بیٹے کی دردناک کہانی سنانے لگا۔ یہ رات بہت سی بھیانک راتوں کی ابتدا تھی۔ ان راتوں میں شیر خوار بچے رونے کو ترس گئے۔ ماں کی ہتھیلیاں ان کے نازک ہونٹوں پر سختی سے جمی رہیں۔ ضعیف سانسیں گھٹ گھٹ کر دم توڑتی رہیں۔ عورتوں پر سکتہ طاری تھا اور وہ کہ جن کے بازوؤں میں مچھلیاں تڑپتی تھیں حیران آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی دوسروں کو دیکھتے یا اپنے آپ کو ٹٹولتے رہنے کی کوشش میں ٹھوکریں کھاتے رہے۔''

(افسانہ 'سوگز پر دفن ایک کہانی'، لکشمن ریکھا، ص 53)

فرقہ وارانہ فساد ایک اہم مسئلہ ہے۔ یہ اہم اس لیے ہے کہ اس کے ذریعے سماج، مذہب اور ملک کے اندرون کا علم ہوجاتا ہے۔ جب مذہب کے نام پر جنگ و جدال ہونے لگے تو انسانیت کو شرمسار ہونا ہی پڑتا ہے۔ منظر کاظمی نے جمشید پور کے فساد کو نہ صرف دیکھا بلکہ اس کی شدت اور نتائج کو محسوس کیا۔ ان پر فساد کا اتنا زیادہ اثر تھا کہ کئی برس تک وہ اس خونچکاں حادثے کو یاد کر کے رونے لگتے تھے۔ اس فساد میں ان کا پیارا مصنف افسانہ نگار زکی انور شہید کر دیا گیا۔ انھوں نے فسادات کی نفسیات پر بھی بہت کچھ لکھا۔ یکجہتی اور بھائی چارگی کی عمارت میں دڑار پڑنے کی دھمک سے وہ پریشان تھے۔ ان کا ایک مضمون 'ہم جنگل کی طرف لوٹ رہے ہیں' ان کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بڑھتے ہوئے علم، بدلتی ہوئی تہذیب اور پوری دنیا کو ایک رشتے میں باندھنے والے انسانی سماج میں حیوانی جذبے کی گنجائش اگر معدوم نہیں ہوسکتی ہے تو موہوم ضرور ہوجانی چاہیے تھی۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ بعض جگہوں پر یہ نہ صرف زندہ رہنے والی بہت طاقت ور بھی ہے، جس کی عبرت ناک مثال اپنے ملک میں تیزی سے پھیلتے ہوئے فرقہ وارانہ فسادات اور ان کی روح فرسا تفصیلات ہیں بلکہ قتل و غارت گری کے بعض واقعات تو قدیم عہد میں جنگلی جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے والے انسان کی درندگی کو بھی مات کر دیتے ہیں۔ دنیا کو امن کا پیغام دینے والے اس ملک میں فرقہ پرستی کا جنون کس سطح سے ابھرتا ہے۔ کس بنیاد پر قائم ہے۔ اس سوال نے آج ہمیں متحیر اور ذہنی طور پر منتشر کردیا ہے۔''

(مقالات منظر، مرتب: ڈاکٹر افسر کاظمی، ص 15)

منظر کاظمی نے معاشرے کی ابتری کو جو فی الوقت بڑا مسئلہ ہے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ یہاں انسان ایک دوسرے کو تکلیف دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کو روند کر آگے بڑھ جاتے ہیں اونچے مقام پانے کے لیے انسان جانوں کو سیڑھی بناتے ہیں اور اس پر قدم رکھ کر کامیاب ہوتے ہیں۔ انسان اسی طرح انسان کا خون چوستا ہے۔ ایسے میں منظر کاظمی کا افسانہ 'پٹا ہوا مہرہ' کا مطالعہ کیجیے اور یہاں کی فکر میں سماج کا ننگا پن دیکھیے۔ افسانے کے یہ جملے حقیقت کو ہی تو بیان کرتے ہیں:

''یار پیارے مجھے مچھر کاٹ رہے ہیں اور تم بری چند کو گالی دے رہے ہو۔..... یار منظر تم کیسے ادیب ہو۔ آدمی، آدمی کا خون چوستا ہے۔ مچھر تو کیڑوں میں سے ہیں جنھیں صرف اسی بات کی عقل ملتی ہے کہ وہ ہر آدمی کا خون چوسیں، چاہے پیارا سنگھ کا خون ہو۔ اسٹالن کا یا میکسم گورکی کا۔''

(افسانہ 'پٹا ہوا مہرہ'، منظر کاظمی کی افسانہ نگاری، از: ڈاکٹر افسر کاظمی، ص 105)

ہمارے معاشرے میں پیارا سنگھ جیسا انسان ملنا مشکل ہے مگر ویسے ہی انسان کی ضرورت ہمارے سماج کو ہے۔ دوسروں سے حد درجہ محبت کرنے والے کی کمی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اب تو خود کے اندر ہی جینا چاہتے ہیں

منظر کاظمی کے ہر ایک افسانے میں کس نہ کسی مسئلے کو پیش کیا گیا ہے۔ ماجرا اگر سماجی اور سیاسی نہ بھی ہو تب بھی کہانی بیان کرتے ہوئے ایک معاشرتی نباض کی طرح قارئین کو چونکا دیتے ہیں۔ علامتوں اور اشاروں سے وہ ساری باتیں ہمارے روبرو کر دیتے ہیں جن کے باطن میں ہمارا معاشرہ آئینہ ہوا ہے۔ ان کا افسانہ 'آسمان سے گرتی روٹیاں' اسلامی واقعات بطور خاص حضرت یوسف، حضرت موسیٰ اور فرعون کی کہانی کو علامتی انداز سے پیش کرنے کے لیے مشہور ہے۔

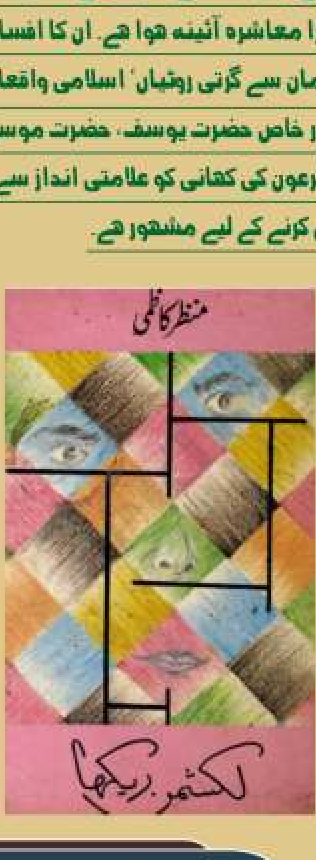

لوگ۔ زندگی انسان کی اب فرد کی زندگی ہوگئی ہے۔ اسی وجہ سے سماجی مسائل بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ہر قدم پر مسائل اور مشکلوں میں گھری عوامی زندگی مذکورہ کردار کی تلاش میں بے چین ہے۔ آج کا دور صارفی دور ہے۔ تھوڑے سے فائدے کے لیے لوگ رشتے ناتے بھول جاتے ہیں۔ خون کی پہچان ختم ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنا خون خون کا پیاسا ہوجاتا ہے۔ دوسروں کے بارے میں سوچنے والا کوئی نہیں ہے۔ بس اپنا فائدہ پیش نظر ہے۔ منظر کاظمی نے ایک مضمون ''ہم جنگل کی طرف لوٹ رہے ہیں'' میں آج کے انسان کے سلسلے میں بڑی اہم اور بے باک بات کہی ہے جس کا اطلاق تو بہ ظاہر فرقہ پرستی پر ہوتا ہے مگر عام زندگی اور سماجی زندگی بھی اس سے اچھوتی نہیں ہے۔ ملاحظہ کیجیے یہ حقیقت پسندانہ اظہار:

''غیر مہذب سماج میں انسان کا انسان کو درندوں کی طرح مار ڈالنا اپنے ساتھ ایک جواز رکھتا ہے کہ اس عہد میں آدمی کی کوئی قدر و قیمت متعین نہیں ہوئی ہے وہ تہذیب سے ناآشنا ہے۔ رشتوں اور تعلقات کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ ہمدردی اور دکھ سکھ کے مشترک جذبوں کا کوئی تصور اس کے پاس نہیں ہے۔ وہ غیر آباد زمین کے کچھ ٹکڑوں پر کسی جنگل یا پہاڑ کے دامن میں جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ علم سے بے بہرہ ہے۔ ترسیل خیال کے لیے کوئی مناسب زبان اس کے پاس نہیں۔ ستر پوشی، کنبہ پروری، ازدواجی تعلقات اور بھائی چارگی کے تقاضوں سے واقف نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس پر حیوانی جذبے غالب ہیں۔''

(مقالات منظر از ڈاکٹر افسر کاظمی، ص 14-13)

منظر کاظمی کے افسانوں میں سماجی اور سیاسی حالات کا در آنا فطری تھا۔ سماج اور سیاست کو موضوع بنانے میں ان کے تجربات کو دخل ہے۔ زندگی میں جن حادثات و واقعات سے دوچار ہوئے یا جن لمحوں میں سماج کو بگڑتے دیکھا۔ ان کی آنکھوں نے اسے قید کرلیا اور موضوعات کی رسائی افسانے کی شکل میں قارئین تک ہوگئی۔ فنکار کی کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ وہ زندگی کو بیان کرتے ہوئے قاری کو کتنی بصیرت فراہم کرتا ہے۔ ان کے اندر موجود طاقتوں سے کس قدر گھائل کر پاتا ہے۔ اعلیٰ ادب محسوسات پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور زندگی کو معنی نو سے سوچنے کو اکساتا ہے۔ سید حامد حسین نے بجا طور لکھا ہے:

''اعلیٰ ادب قاری کی خواہشات کا احترام کرنے کے لیے کوئی بنا بنایا فارمولا تو اختیار نہیں کرتا، لیکن وہ ان

عصری مسائل بھی سماج کے کوکھ سے ہی جنم لیتے ہیں. اس لیے ان پر نگاہ رکھ کر فن پارہ تخلیق کرنے والا ہمارے سماج کو آئینہ دکھانے والا شخص ہوتا ہے. سماج تو ابتدا سے ہی اردو افسانے کا موضوع رہا ہے. چاہے واقعات ہوں یا ماحول سازی، کردار ہوں یا زبان، افسانہ نگاروں نے ہمارے سماج کو پیش کرنے کا کام بحسن و خوبی انجام دیا.

احساسات کا اس انداز سے ارتقا (Sublimation) کرتا ہے کہ اس میں قاری اپنی توقعات کی ایک نئی تشکیل کا تجربہ کرتا ہے۔ اعلیٰ ادب کے لیے مکروہات اس تخلیق کا منتہا بن کر نہیں آتے بلکہ وہ ان کو اس نوعیت سے پھیلانے اور پیش کرنے میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔ وہ زندگی کی پرمعنی بصیرت فراہم کرنے کا سبب بنتے ہیں۔''

(جدید ادبی تحریکات وتعبیرات از سید حامد حسین، اشاعت 2012، ص 34)

عصری مسائل بھی سماج کے کوکھ سے ہی جنم لیتے ہیں۔ اس لیے ان پر نگاہ رکھ کر فن پارہ تخلیق کرنے والا ہمارے سماج کو آئینہ دکھانے والا شخص ہوتا ہے۔ سماج تو ابتدا سے ہی اردو افسانے کا موضوع رہا ہے۔ چاہے واقعات ہوں یا ماحول سازی، کردار ہوں یا زبان، افسانہ نگاروں نے ہمارے سماج کو پیش کرنے کا کام بحسن و خوبی انجام دیا۔ منظر کاظمی نے اس طرف خاص توجہ دی۔ انھوں نے سماج کے ان مسائل کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا جن پر لکھنے اور بولنے والے حضرات کم تھے۔ ہماری دکھتی رگوں پر انھوں نے انگلی رکھ دی۔ انھوں نے نہ صرف واقعات کو پیش کیا بلکہ داخلی سطح پر ہمارے محسوسات پر ضرب کاری لگانے کی کوشش کی۔ انھوں نے سماج کے ایک فرد کی طرح سماجی حقائق کو بیان کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ یہ وہ دور تھا جس میں بقول ڈاکٹر نکہت ریحانہ خان:

''...اب افسانہ نگار نیکی و بدی کو ان کے حقیقی روپ میں پیش کرنے لگا۔ کیونکہ سماج سدھارک کا رول نہیں ادا کر رہا تھا کہ اپنے افسانے کو برائی کا انجام برائی اور نیکی کا انجام نیکی سے بندھے ٹکے اصولوں اور میکانکی انداز کا پابند بناتا۔ وہ حقائق کو ان تمام تر تلخیوں کے ساتھ قبول کر کے ان کا اظہار کرتا تھا۔ اب فنکار زندگی کو کسی مخصوص نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا تھا بلکہ اس کی متنوع جہات کو دیکھتا تھا معاشرے کے تضادات پر اس کی گہری نظر تھی۔''

(تنقید کے مثبت رویے، ڈاکٹر نکہت ریحانہ خان، 1997، ص 50)

منظر کاظمی نے بھی ہمارے سماج کے ان تمام گوشوں کا مشاہدہ اپنی کہانیوں کے ذریعے پیش کیا۔ وہ صرف کہانیوں کے ذریعے دل کی باتیں نہیں کہتے تھے بلکہ اپنی تقاریر اور عملی طور پر معاشرے کو خوش حال دیکھنا چاہتے تھے۔ تعلیم کی کمی آج بھی معاشرے کا بڑا مسئلہ ہے۔ خاص طور پر اقلیتی طبقے کی تعلیم کے راستے میں کئی رکاوٹیں ہیں۔ تعلیم کی کمی نے ہمیں ذہنی طور پر غلام بنا رکھا ہے۔ وہ اقلیت کے مسائل کے تئیں بے حد حساس تھے اور عملی طور پر کچھ کرتے رہنے کی ترغیب دیتے تھے۔ ان کی اس فکر مندی سے لبریز چند سطور پیش کرتا ہوں جس میں اقلیت کی تعلیم اور ذہنی غلامی کو موضوع بنایا گیا ہے:

''لیکن ہم یہ جاننے کو تیار نہیں کہ کسی نے ہم کو ہماری مرضی کے خلاف غلام بنایا ہے۔ دراصل ہم تعلیم سے بے بہرہ ہیں اور جو افراد تعلیم سے محروم ہوتے ہیں وہ اپنے آپ سے آشنا نہیں ہوتے۔ گرد و پیش کے حالات سے بے خبر ہوتے ہیں۔ زندگی کی سچائی ان پر نہیں کھلتی۔ وقت کے تقاضے کو وہ نہیں پہنچاتے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنے غلام ہوتے رہنے کے عمل کو محسوس نہیں کرتے۔ دنیا کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جب قومیں ان ہی مرحلوں سے گذر کر تباہ و برباد ہوئی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر ہم بھی ان مرحلوں سے گذر رہے ہیں تو ہماری کیا ذمے داری ہوتی ہے؟ حکمت اور فراست تو مومن کی دولت ہوا کرتی تھی ہم نے اسے کہاں چھوڑ دیا؟ کہاں کھو آئے؟ اور کچھ کریں یا نہ کریں کم از کم اپنی گم شدہ دولت کی تلاش تو کریں۔''

(منظر کاظمی کی افسانہ نگاری از افسر کاظمی، ص 55-54)

منظر کاظمی اس فنکار کا نام ہے جن کے یہاں سماجی اور سیاسی بصیرت و بصارت موجود تھی جو ان کے افسانوں میں بھرپور طریقے سے در آئی تھا۔ اس لیے انھیں سماجی نباض افسانہ نگار کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

■

Ahsan Alam
Near Al-Hira Public School
Moh: Raham Khan, P.O. Lalbagh,
Darbhanga - 846004 (Bihar)
Mob:9431414808

1950 کے بعد اردو نظم کا رجحان

محمد شاہد

1947 کے سانحۂ تقسیم، فسادات اور سماجی انتشار کے بعد ہی سے ادب میں ایک جدید تخلیقی رویے اور خیال بندی کے منظرنامے کی تشکیل کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ تقسیم ہند کا واقعہ ایک عظیم سانحہ تھا جس نے برصغیر میں انسانی زندگی اور اس کی داخلی کائنات کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ عالمی سطح پر بھی دوسری جنگ عظیم کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا جس نے پوری دنیا کے انسانوں کو متاثر کیا تھا۔ جس آزادی اور انسانی فلاح کی راہ انسانوں نے دیکھی تھی وہ سراب ثابت ہو چکی تھی، آزادی اور انقلاب جیسے نعرے کھوکھلے اور بے معنی ثابت ہوئے تھے اور اس عہد کے انسانوں کا سماجی انقلاب اور مشترکہ جد و جہد سے بھروسہ اٹھ چکا تھا۔ 1950 کے بعد جس طرح کے حالات اور مسائل کا سامنا انسان کو ہوا وہ انتہائی المناک تھے۔ آدمی مایوس ہو کر اپنی ذات کے خول میں بند ہو رہا تھا جس کی بنا پر اسے شدید ذہنی کشمکش، الجھن، عدم تحفظ اور تنہائی کا سامنا تھا۔ سماجی اور تہذیبی قدروں سے اس کی دلچسپی ختم ہو رہی تھی جس کی وجہ سے اس کی سماجی زندگی بحران کا شکار ہو گئی اور انسان تنہا ہوتا گیا۔ وقت کے جبر اور حالات نے انسان کو شدید مایوسی اور افسردگی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اب شاعر اور ادیب انسان کی اس نئی زندگی اور اس کے نئے تقاضوں سے شعر و ادب کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرنے لگے اور ادب میں اس نئے رجحان کو جدیدیت کے رجحان سے تعبیر کیا گیا۔ اس جدید رجحان کی بنیاد انسان کی ذات، اس کی پیچیدہ کائنات کے سربستہ اسرار کا انکشاف، اس کی پیچیدہ ذہنی کشمکش اور نفسیات کو سمجھنے کی کوشش اور بحیثیت فرد اس کے مسائل اور احساسات و جذبات کی عکاسی پر تھی۔

اردو ادب میں جدیدیت کا رجحان 1955 کے آس پاس واضح طور پر سامنے آیا اور اردو ادب میں نظم کی صنف میں اس رجحان کو بہت جلد مقبولیت حاصل ہو گئی۔ جدیدیت کے رجحان کے زیر اثر لکھی جانی والی نظم کو نئی نظم یا جدید نظم کا نام دیا گیا۔ اس رجحان کے زیر اثر لکھنے والوں نے گروہ بندی، جماعت، حلقہ اور تحریک سے مکمل احتراز کیا اور اظہار خیال کی آزادی کی موافقت کی۔ اظہار خیال کی آزادی اچھے ادب کی تخلیق کے لیے ناگزیر ہے اور آزادیِ اظہار کی بنا پر یہ رجحان ترقی پسند تحریک کی جگہ بہت جلد مقبول عام شعری رجحان بن گیا۔

1950 کے آس پاس ترقی پسند تحریک کے انحطاط کا دور شروع ہوا اور اردو ادب میں نیا رجحان سر اٹھانے لگا۔ 1960 کے آس پاس یہ رجحان واضح طور پر ظاہر ہوا اور جدیدیت سے موسوم کیا گیا۔ شاعری میں یہ رجحان نظم کی صنف میں بہت مقبولیت کے ساتھ نمودار ہوا اور اس کے زیر اثر تخلیق شدہ نظموں کو نئی نظم سے تعبیر کیا گیا۔ جدیدیت دراصل شعر و ادب کے اس نئے اور جدید طرز فکر اور اسلوب کا نام تھا جو مروجہ روایت سے بغاوت کے نتیجے میں پروان چڑھ رہا تھا اور آزاد طرز تخلیق پر مبنی تھا۔ جدید نظم نگاروں نے انسان کی ذات، اس کے وجود کے اسرار و رموز اور اس کی داخلی کائنات کے انکشاف کی شعوری کوشش کی ہے۔ یہ کسی مخصوص طرز فکر اور طرز و اسلوب کا پابند نظریۂ شعر و ادب نہیں تھا اور نہ اس کا تعلق مخصوص عہد سے تھا۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اس دور کا ہر لکھنے والا جدیدیت کا علم بردار تھا۔ جدیدیت کا عام اور آسان مطلب یہی ہے کہ وہ خاص انداز نظر اور طرز فکر جو موجودہ زمانے سے ہم آہنگ ہو اور روایت اور اپنے ماضی سے گریزاں ہو، جدیدیت ہے۔ ن م راشد اپنے مضمون 'جدیدیت کیا ہے' میں لکھتے ہیں:

''جدیدیت کی ایک تعریف تو یہی ہو سکتی ہے کہ جو انداز نظر اپنے زمانے کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور ماضی سے یگانگت اور ربط محسوس نہ کرے وہ گویا جدیدیت کا حامل ہے۔ تاہم جدیدیت کا معنی محض معاصریت نہیں ہیں۔ یعنی ہر شاعر جو ہمارے زمانے میں زندگی بسر کر رہا ہے اور شعر کہتا ہے جدید شاعر نہیں کہلا سکتا۔ یہ پیش افتادہ بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی تکرار اس ضمن میں ضروری تھی کیونکہ بیشمار شعرا اس وقت 'موجود' ہیں لیکن 'جدید' نہیں ہیں۔ جدید شاعر صرف وہی ہے جو 'جدید' شعر کہتا ہے۔''

(مقالات ن م راشد، ن م راشد، ص 180، مطبوعہ الحمرا پبلشنگ اسلام آباد 2002)

وہ نظریۂ ادب جو ترقی پسند تحریک کے زیر اثر پروان چڑھا اور سماج اور انسانی زندگی کے نئے مسائل اور تقاضوں کی بنا پر وجود میں آیا، اس نظریے کو جدیدیت سے تعبیر کیا گیا۔ روایت سے بغاوت اور مروجہ طرز فکر سے انحراف کے نتیجے میں پیدا ہونے والا یہ رجحان موضوع، طرز اظہار، ہیئت، نئے رنگ و آہنگ اور تنوع سے عبارت تھا۔

نئی نظم کے خد و خال مکمل طریقے سے 1960 تک ظاہر ہو چکے تھے اور یہ رجحان اردو شاعری کا غالب رجحان بن چکا تھا۔ نئی نظم میں موضوع، بیان اور ہیئت یا کسی اور اعتبار سے پابندی سے گریز ملتا ہے۔ نئی نظم کے شعرا اپنی انفرادی بصیرت اور فکر کا اظہار کرتے ہیں اور یہ اظہار اپنے اندر مختلف رویوں کا حامل ہے۔ اختلاف رائے اور اختلاف طرز اظہار ان شعرا کے یہاں مسئلہ نہیں ہیں اور وہ اسے ایک فطری اور ادبی سچائی کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں۔

نئی نظم کا شاعر حیات و کائنات کے سربستہ رموز کو اپنی بصیرت اور تجربات کی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور ایک جدید فلسفے کی دریافت کرتا ہے۔ وہ انسانی زندگی یا سماج کو کسی مخصوص مروجہ سماجی نظریے یا سیاسی نظریے سے دیکھنے کا قائل نہیں بلکہ بحیثیت فرد وہ انسانی زندگی اور کائنات کی حقیقتوں کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا

ہے۔نظم کے اس رجحان کے زیراثر شاعری کرنے والوں نے کسی مخصوص لب و لہجے، زبان وبیان کے مخصوص مسائل، ہیئت، موضوع یا بیان کے محدود رویوں میں آزادی اظہار کو اہمیت دی ہے اسی لیے جدید شعرا کے یہاں موضوع، اسلوب، لہجہ اور زبان و بیان میں تنوع ہے۔

نئی نظم میں زبان و بیان، اسلوب، طرز اظہار اور موضوع کے اعتبار سے بہت وسعت ہے، تنوع اور رنگارنگی ہے۔ یہ علاقہ، حلقہ، تحریک، جماعت اور گروہ بندی کی مکمل نفی کرتی ہے۔اس نئے رجحان کے زیراثر شاعر یا نظم نگار کو کسی تحریک اور گروہ سے وابستگی یا موافقت کا اعلان کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ وہ ان پابندیوں سے آزاد ہے تاکہ اچھا اور سچا ادب تخلیق کر سکے کیونکہ نئے ادیبوں اور شاعروں کا خیال تھا کہ آزاد اذہان و افکار ہی اچھا ادب تخلیق کر سکتے ہیں نہ کہ گروہ بندیوں، تحریکوں اور جماعتوں کی اتباع میں لکھنے والے۔ اس اتباع میں فنکار کی وہ داخلی حس جہاں سے شعر وادب اور فن کے سوتے پھوٹتے ہیں وہ دب جاتی ہے، اس کی انفرادیت واضح نہیں ہو پاتی اور جو فن پارہ تخلیق ہوتا ہے وہ دراصل اس کی آواز نہ ہو کر بھیڑ اور گروہ کی آواز بن جاتا ہے۔نئی نظم میں فنکار کو آزادی ہے کہ وہ جو تخلیق کرنا چاہتا ہے کرسکتا ہے۔ نہ اس میں کوئی موضوع کی قید ہے، نہ ہیئت کی اور نہ کوئی واضح اور معینہ اسلوب۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نئی نظم کے شعرا کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”1960 اور 1970 کے درمیان کے شعرا کی نمایاں خصوصیت تنوع، رنگا رنگی اور پہلوداری ہے۔نئی شاعری اب آزاد نظم کے مترادف نہیں سمجھی جاتی، اس کی متعین اور سکہ بند ہیئت ہے اور نہ اس کا بندھا ٹکا اسلوب، پابند، نیم پابند، معریٰ، آزاد ہر طرح کے اسالیب میں نئی جہتیں پیدا ہوئی ہیں اور نئی حسیت نے ان میں تازگی پیدا کی ہے۔نئی پابند نظم پرانی پابند نظم کے درمیان اپنے ذائقے، اپنی خوشبو اور اپنے لہجے سے پہچانی جاسکتی ہے۔“

(نئی نظم کا سفر، خلیل الرحمٰن اعظمی، ص22، مکتبہ جامعہ نئی دہلی 2011)

نئی نظم میں بیان کی رنگارنگی، وسعت فکر، مختلف شعری ہیئتوں کے تجربات، آہنگ اور بیان کا تنوع اور لفظوں کے نئے معانی سے ہم آہنگی ہے۔ مضامین کے برتنے کی اگر بات کی جائے تو نئی نظم کے شاعر نے جسم سے روح تک کا سفر کیا ہے اور تجرید سے تجسیم تک کے مراحل طے کیے ہیں۔ ظاہر و باطن کی کشمکش، جذبہ، خیال، حسیت، مادہ روح کا فلسفہ، تجرید اور تجسیم اور طبعیات سے مابعد الطبعیات تک کے موضوعات کا تنوع ہے۔اس میں روحانیت سے لے کر مادیت تک سب کچھ ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے عام اور واضح حقیقی طرز اظہار سے لے کر علامتی اور استعاراتی مبہم اسلوب اور جدید ہیئتوں کی دریافت کے ساتھ نئی نظم نے ارتقا کا یہ سفر طے کیا ہے۔ 1980 کے آس پاس نثری نظم کے تجربے دیکھنے کو ملتے ہیں اور پھر نثری نظم بھی نظم کا اہم حصہ بن جاتی ہے۔اردو نظم نے اس رجحان کے زیراثر ارتقا کے بہت سے مراحل طے کیے اور اپنی ایک اہم شناخت قائم کی۔

نظم کے اس نئے رجحان کو ابتدا میں جن شعرا نے پروان چڑھایا وہ ترقی پسند تحریک کی انتہا پسندی سے بیزار تھے۔ وہ آزادیِ اظہار اور شعر وادب کے نئے رویوں کے متلاشی تھے جو نئے انسانی اور سماجی مسائل کی بہتر ترجمانی کرنے کے لیے معاون ثابت ہوں۔ 1960 کے آس پاس اردو نظم میں یہ جدید شعری رجحان عام ہوا۔اس رجحان کو نئی شعری کائنات میں وجود بخشنے کا سہرا ان شعرا کے سر جاتا ہے جو ادبی انتہا پسندی سے بیزار ہو کر نئے رویے کی دریافت میں فکری سفر پر سرگرداں تھے اور فکر وفن کو تحریکوں اور مخصوص سیاسی و سماجی نظریات کی بیڑیوں سے آزادی دلانا چاہتے تھے۔اولاً جن نظم نگاروں کے ذریعے نئی نظم کی تعبیر عمل میں آئی ان میں خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، عمیق حنفی، وحید اختر، شاذ تمکنت، قاضی سلیم، ساجدہ زیدی، محمود ایاز، بلراج کومل، شفیق فاطمہ شعری اور شہاب جعفری وغیرہ اہم نام ہیں۔ان شعرا نے نئی نظم کے اولین نمونے پیش کیے۔ان شعرا کے بعد نظم کی اس فضا میں طلوع ہونے والے شعرا میں شہریار، ندا فاضلی، زبیر رضوی، کمار پاشی، شمس الرحمٰن فاروقی، زاہدہ زیدی، حمید الیاس، عادل منصوری، خلیل مامون، بشر نواز، عزیز قیسی، صلاح الدین پرویز، علی ظہیر، شاہد ماہلی، عتیق اللہ، سلیم شہزاد اور جاوید ناصر وغیرہ اہم ہیں۔ان شعرا کو بنی بنائی فضا ملی اور انھوں نے اس سے استفادہ کر کے اس کو مزید ترقی سے ہمکنار کیا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی ان اولین نئے نظم نگاروں میں سے ہیں جو ترقی پسند اور حلقۂ ارباب ذوق والوں کے گروہی اور مخصوص نظریاتی ادب سے الگ نئے ادبی رویوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔نئی نظم کے ابتدائی خد وخال مرتب کرنے میں ان کا اہم رول رہا ہے۔ان کے علاوہ وحید اختر کا شمار بھی اس رجحان کے اولین نظم نگاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے 'پتھروں کا مغنی' جیسی عمدہ اور خوبصورت نظمیں تخلیق کی ہیں جو اپنے اندر جدید اسلوب اور آہنگ رکھتی ہیں۔اردو شاعری کے اس جدید رجحان کی فضا میں شہریار طلوع ہوتے ہیں اور فکر وفن کی روشنی بکھیرتے ہیں۔ شہریار نے خلیل الرحمٰن اعظمی کی صحبت سے فیض یاب ہو کر اردو نظم کے اس نئے افق پر خوبصورت رنگ بھرے۔ان کی نظموں میں موضوع اور بیان کا بہت زیادہ تنوع ہے۔شہریار نے اپنی نظموں میں مکمل علامتی اور استعاراتی فضا تخلیق کی اور زندگی اور کائنات کی تلخ حقیقتوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ان کی نظمیں سرگوشی کی سی کیفیت لیے ہوئے ہیں اور ان کا لہجہ خود کلامی کا سا ہے۔ان کے علاوہ ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی نے جدید نظم کے ارتقا میں حصہ لیا ہے اور عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ منیب الرحمٰن بھی جدید شعرا کی صف میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔منیب الرحمٰن کبھی کسی تحریک، مخصوص نظریے، رجحان یا رویے کے پوری طرح پابند نہیں رہے البتہ وہ ترقی پسند تحریک کے نظریات و مفروضات، حلقۂ ارباب ذوق کی نرم گفتاری، ابہام گوئی اور فنی اصول کی اہمیت و معنویت کے رجحان سے ضرور متاثر ہوئے مگر ان کو اپنے لیے کبھی بیڑی نہیں بننے دیا جس کی بنا پر ان کا شعری سفر ارتقا کی نئی منزلوں سے ہمکنار ہوتا رہا اور جب نئی نظم کا سفر شروع ہوا تو ان کی نظمیں نئی نظم کے تصور سے ہم آہنگ ہوتی گئیں۔منیب الرحمٰن کا تعلق اگرچہ حلقۂ ارباب ذوق سے بھی رہا ہے لیکن ان کی نظمیں جدید رنگ و آہنگ کی ہیں۔ حلقۂ ارباب ذوق سے وابستہ شعرا کا لہجہ، علامتی اور استعاراتی اسلوب اور آہنگ نئے نظم نگاروں کے یہاں بھی ملتا ہے لیکن ان کے یہاں حلقے والوں کی طرح مخصوص اسلوب اور نظریے پر اصرار نہیں ہے۔منیب الرحمٰن کی نظموں کا ارتقائی سفر حلقۂ ارباب ذوق کے زیر اثر ہوتے ہوئے جدید نظم سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

مذکورہ شعرا میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو 1950 سے پہلے بھی شاعری کر رہے تھے لیکن 1950 کے بعد کے شعرا میں ان کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اگرچہ ان کی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا مگر ان کے فن نے ارتقائی مراحل 1950 کے بعد طے کیے۔اس سے پہلے دو دہائیوں سے اردو نظم ترقی پسند تحریک کے زیر اثر تھی، بیچ میں حلقۂ ارباب ذوق نے مختلف نظریات کی بنا پر ایک گروہ بنا لیا اور ایک نئے رجحان سے اردو شاعری آشنا ہوئی۔ آزادی، تقسیم ہند، فسادات، نفرت اور انسانی قدروں کے انتہائی زوال نے انسانی زندگی میں نئے مسائل کو جنم دیا اور یہ شعرا نئے ادبی رویوں کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ انسانی زندگی اور اس کے مسائل سے شعر وادب کو ہم آہنگ کریں۔

نئے شاعروں نے زندگی اور کائنات کو اپنے تجربات اور بصیرت کی روشنی سے دیکھا اور پرکھا۔ یہ بصیرت فنکار کا ذاتی رویہ ہے جو مخصوص سیاسی اور سماجی نظریات اور تحریکات کے زیر اثر وجود میں نہیں آیا۔ یہ اس کے باطن اور روح کی آواز ہے جو وقت اور حالات نے اسے دی ہے۔نئی نظم میں ابہام ہے، علامتی اور استعاراتی فضا میں

رچی بسی نظمیں انسان کی پیچیدہ حیات اور کائنات کا احاطہ کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو سمجھنا عام قاری کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ نئے شاعروں نے کس طرح انسان کے نئے مسائل اور میلانات کو اپنی نظموں میں علامتی اور اسعاراتی مبہم نظام فکر قائم کیا ہے اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

مسیح وقت تم بتاؤ کیا ہوا
دیو علم کے چراغ کا، کیوں بھلا بھر گیا
دھواں دھواں بکھر گیا/ سنو کہ چیختا ہے، کام۔کام
ساحلوں کے سمت ہو سکے تو روک لو
اس نئے عذاب کو/ ناخدا کی آخری شکست تک
سمندرں کی ریت چھانتے رہو

(وائرس: قاضی سلیم)

ابھی سانپ چھتری لگائے ہوئے
بھاپ نیلے خلاؤں کی جانب رواں ہے
وہ جس کی ضیافت کی تیاریاں تھیں، کہاں ہے
مری آتما چاک کر چیختی ہے
یہ ہانڈی ابلنے لگی ہے
یہ مٹی کی ہانڈی ابلنے لگی ہے
یہ مٹی کی دیوانی ہانڈی ابلنے لگی ہے

(ابال: عمیق حنفی)

پتھروں نے سنا اور چپ چاپ سنتے رہے
پتھروں کی اسی انجمن کا مغنی ہوں میں
اور بے درد، بے حس ستم گار پتھر سنیں گے کبھی
ان کا وہ مطرب خوش نوا شکوہ سنج زماں
اپنے نغمات کی آگ میں جل گیا
یا پھر ان ہی کے مانند پتھر کا بت بن گیا

(پتھروں کا مغنی: وحید اختر)

علی بن متقی رویا
مقدس آیتوں کو مخملیں جزداں میں رکھا
امام دل گرفتہ/ نیچے منبر سے اتر آیا
خلا میں دور تک دیکھا
فضا میں دور تک پھیلی ہوئی تھی/ دھند کی کھائی

(علی بن متقی رویا: زبیر رضوی)

جدید نظم نگاروں کے یہاں سفر، خواب، کشتی، دریا، ریت، دھند اور دھوپ جیسے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ موجودہ زندگی کی صحیح اور موزوں تعبیر پیش کرتے ہیں۔ انسان کی پیچیدگیوں میں بھری زندگی کسی طوفان سے کم نہیں ہے جس کو شاعر اس طرح کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔

جدید شاعر ایسی لفظی اور معنوی رعایتیں استعمال کرتا ہے جس سے نظم کی زبان اور فضا دونوں ستعاراتی ہو جاتی ہیں۔ اس دور کی نظموں میں فطری زندگی اور صنعتی زندگی کا فرق اور زندگی کے فطرت سے صنعت کی طرف سفر کا پتہ چلتا ہے۔ جدید شعرا کی نظموں میں شور، گڑگڑاہٹ، ریل، فیکٹری، سڑکوں پر بھاگتی مخلوق جیسی فضا ملتی ہے اور اس فضا میں انتہائی افسردہ، کرب زدہ، مایوس، تنہا، بھوکا اور خود سے ناراض انسان ظاہر ہوتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف پہاڑ، جنگل، ندی، جھیل اور جھرنے جیسے الفاظ ہیں۔ یہاں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان میں فضا خوشگوار ہے لیکن یہاں بھی درد ہے، تنہائی اور کرب ہے جس سے نکلنے کی کوشش میں انسان صنعتی زندگی میں مثبت امید کے ساتھ داخل ہوتا ہے لیکن وہ مثبت احساسات سے مزید دور ہوتا جا رہا ہے۔

نوسماجی تشکیل اور نئی اقدار کے نظم گوشعرا کے یہاں لفظوں کا ایسا تضاد دیکھنے کو ملتا ہے جو معنی میں تضاد کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ زندگی کے تصادم کو دکھاتا ہے۔ یہ تضاد نظم کے خیال میں نہ ہو کر لفظوں اور ان کے استعمال میں ظاہر ہوتا ہے۔ جدید شعرا کے یہاں علامتی طرز اظہار ملتا ہے۔ علامتی گفتگو (Symbolic discourse) پر مبنی لفظوں کی ایسی بھول بھلیاں شاعر تخلیق کرتا ہے کہ عام قاری کے لیے مطالب و مفاہیم تک رسائی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ صنعتی اور تکنیکی ترقی اور اس کے زیر اثر تشکیل پاتی جدید طرز زندگی، فکر اور مسائل اس دور کے شعرا کے اہم موضوعات ہیں۔

نئ نظم کا منظر نامہ انسانی زندگی اور اس کی ذات کے جن حالات اور مسائل سے تشکیل پاتا ہے وہ انسانی زندگی کے پیچیدہ اور اس کی ذات کے گم ہوجانے سے عبارت ہے۔ اس عہد کے انسان کی ذہنی کشمکش، اس کی داخلی کیفیت اور اس کی نفسیات کی ترجمانی کرنے کے لیے اور اس کے اندر جھانکنے کی کوشش میں نیا نظم نگار پیچیدہ اور مبہم اسلوب اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ خارجی معاملات اور مسائل کی ترجمانی کرنے اور انسان کی ذات کی داخلی سطحوں میں جھانکنے کے عمل میں یہی بنیادی فرق ہے جو نئ نظم نگاری اور ترقی پسند یا دوسری خارجی شاعری میں نظر آتا ہے۔

1950 کے آس پاس کا دور جب یہ نیا رجحان کہیں نہ کہیں عالم وجود میں آچکا تھا، انسانی زندگی کے نئے مسائل اور زندگی اور سماج کے نئے تقاضوں سے آشنا ہو رہا تھا۔ یہ نئے مسائل انسانی زندگی میں اور اس کی ذات میں بہت سے غیر امکانی طوفان لے کر آئے جس کی وجہ سے انسان عجیب صورت حال سے دوچار ہوا۔ تقسیم، ہجرت، نفرت، فسادات، تہذیبی قدروں کا خاتمہ اور معاش کی شدید فکر اور ان کے نتیجے میں، خودغرضی، نفرت، بے مروتی، رشتوں کی پاکیزگی کا خاتمہ، اور سب سے بڑھ کر انسان کی ختم ہوتی اہمیت نے انسان کو تنہائی، بے چینی، عدم تحفظ اور غیر یقینیت میں گرفتار کر دیا۔ نئے نظم نگاروں نے انسان کی ذہنی کیفیت اور اس کی زندگی کے جدید مسائل و میلانات کو موضوع بنایا۔ اپنے عہد کے سنگین حالات، فسادات، وحشی پن اور ظلم و زیادتی کو بھی یہ نظم نگار موضوع بناتے ہیں مگر وہاں بھی ان کا انداز استعاراتی اور مبہم ہی رہتا ہے:

خون میں لتھڑی ہوئی دو کرسیاں
شعلوں کی روشنی میں وحشی آنکھوں کا ہجوم
رات کی گھڑیوں میں موجزن
اجنبی بڑھتے ہوئے سایوں کا شور
نیم مردہ سا چاند
کوئی دوشیزہ کا جیسے ادھ کٹا پستان
اور اس پر خون کی لتھڑی ہوئی دو کرسیاں

(خون میں لتھڑی ہوئی دو کرسیاں: عادل منصور)

نئے شعرا کی نظموں میں خود کلامی کی کیفیت کا احساس غالب ہے۔ ان کی نظموں میں سوچنے کا انداز، خود میں کھو جانے، کہیں گم ہو جانے اور کچھ تلاش کرنے، کچھ اچانک غیر متوقع ہو جانے اور ایک دم سے چونک جانے کا انداز ملتا ہے۔ شہریار کی نظموں میں چونکنے کا یہ انداز اور خوف کے سائے کا احساس غالب ہے اور ان کی بیشتر نظموں میں نیم خوابی کی سی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔

نئے نظم نگاروں کے یہاں انسان کی شناخت ایک اہم موضوع ہے۔ بھیڑ میں انسان اپنی شناخت اور اہمیت کھو چکا ہے۔ یہ موضوع نظم نگاروں کے یہاں مختلف انداز سے آیا ہے۔ شناخت کھونا یا شناخت کا بدل جانا ایک ہی بات ہے اور نظم نگاروں نے شناخت کے گم ہو جانے کی انہی مختلف جہات کو اپنے اپنے منفرد اسلوب میں موزوں کیا ہے۔ نظم کا یہ رجحان اردو شاعری میں گوناگوں کیفیات کا حامل ہے۔

ہندوستان کی آزادی ساتھ میں تقسیم اور فسادات کی ایسی تلخیاں اور کربناکیاں لے کر آئی تھی جس نے آزادی کی خوشیوں میں نہ صرف ماتم برپا کر دیا تھا بلکہ آزادی کو مشکوک اور نامکمل بنا دیا تھا۔ نئے شاعروں نے اس مسئلے کو بھی نظموں میں پیش کیا ہے۔ تقسیم کا ناقابل برداشت درد اور آزادی کے نام پر غلامی کے چہرہ بدل کر آجانے پر اس شاعر کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور تڑپ کر ان کو جھنجھوڑتا ہے جو آزادی کے اس فریب کا شکار ہو گئے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظم ''کوڑھ کے داغ'' میں فریب خوردہ انسانوں کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی اس رجحان سے وابستہ اولین شعرا میں سے ہیں۔ انھوں نے عرفان ذات اور باطنی و

روحانی دنیا کی جستجو پر توجہ دی ہے۔ وہ باطنی دنیا تک رسائی کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ باطن ہی اصل ہے اور باطن کی جستجو کا مطلب وہی ہے جو اقبال کے یہاں خودی، خود شناسی یا عرفان ذات سے ہے۔ باطن کی تلاش اور عرفان ذات کا شعور انھوں نے بیدار ضرور کیا ہے مگر ساتھ ہی وہ اس سماجی اور معاشی جبر پر شدید طنز بھی کرتے ہیں جس نے انسان کو جسم کی آگ اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اس کے فکر وشعور کو گروی رکھ لیا ہے۔ نظم 'نیا آدمی'، 'میں گوتم نہیں ہوں' اور 'پچھلے جنم کی کتھائیں'، ان نظموں میں خود شناسی اور باطن کی جستجو کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ نظم 'نیا آدمی' بہت خوبصورت نظم ہے۔ نظم علامتی پیرائے میں ہے۔ نظم میں انسان کی اس جدید نفسیات کی گرفت کرنے کی کامیاب کوشش اس نظم میں ملتی ہے جس کے زیر اثر وہ اپنے عقل وشعور کو بروئے کار نہ لاکر ہر کسی پر ایمان لاکر اس کے پیچھے چلتا ہے اور پھر پھر کوئی آکر نیا اعلان نامہ سناتا ہے اور وہ اس کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ کسی نجات دہندہ کا انتظار کرنے کے بجائے اپنی روحانی اور باطنی قوت کو پہچانو:

چند لوگوں نے یہ آکے ہم کو بتایا
کہ اب ان پرانی کتابوں کو
تہہ کر کے رکھ دو/ ہمارے وسیلے سے/تم پر
نئی کچھ کتابیں اتاری گئی ہیں/انھیں تم پڑھو گے
تو تم پر صداقت نئے طور سے منکشف ہوگی
بوسیدہ و منجمد ذہن میں/کھڑکیاں کھل سکیں گی
تمھیں علم وعرفان اور آگہی کے/خزینے ملیں گے
اور پھر یوں ہوا/ ان کتابوں کو اپنی کتابیں سمجھ کر
انھیں اپنے سینے سے ہم نے لگائی
ہر اک لفظ کا ورد کرتے رہے
اک اک حرف کا رس پیا
اور ہمیں مل گیا/ جیسے معنی ومفہوم کا/ اک نیا سلسلہ
اور پھر یوں ہوا/ ان کتابوں سے/اک دن
یہ ہم کو بشارت ملی/آنے والا ہے دنیا میں
اب اک نیا آدمی

اس دور کا شاعر انسانوں کی بے حسی کو موضوع بناتا ہے۔ نظم 'پتھروں کا مغنی' وحید اختر کی ایک ایسی ہی نظم ہے۔ شاعر نے اس میں خود کو پتھروں کا مغنی کہا ہے اور پتھر اس دور کے انسان کا استعارہ ہے۔ مغنی کی آواز پتھر کے انسانوں کے کانوں سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہے۔ اس کے پر اثر نغمے بے حس اور انسانی جذبوں سے عاری سماج پر بے اثر واقع ہوئے ہیں۔ یہ نظم ان کے عہد کی غیر معمولی سماجی اور سیاسی بصیرت کی حامل ہے۔ یہ نظم آج کے انسان کی بے حسی، خود غرضی، انسانی قدروں اور جذبوں سے دوری پر روشنی ڈالتی ہے اور اس سے کسی انسانی انقلاب کی امید کو سراب کے نام سے تعبیر کرتی ہے۔ انسان کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ وہ پتھروں کی مانند ہو گیا ہے۔ اس میں بصیرت، درد، تڑپ، احساس اور انقلاب کا جذبہ نہیں ہے۔ ان میں زندگی کی کوئی علامت موجود نہیں ہے اور پتھروں کی مانند ان پر بھی کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس نظم میں پتھروں کی درشتی کے ساتھ درد و کرب کی ندی کا سیل رواں ہے جو پتھروں کے اس شہر (دنیا) میں رواں دواں ہے۔

اس نے جب زخم دل کو زباں بخش دی
سننے والوں نے بے ساختہ آہ کی
عشق کے ساز پر جب ہوا نغمہ زن
شور تحسیں میں خود اس کی آواز دب سی گئی
مطرب خوش نوا پھر بھی تنہا رہا
مطرب خوش نوا زندگی کے حسیں گیت گاتا رہا
اس کی آواز پر انجمن جھوم اٹھی
داد وتحسیں کے ہنگامۂ ذوق کش اسے
ہر طرف ملامت کے پتھر ملے
مطرب خوش نوا پتھروں سے پٹکتا رہا اپنا سر
پتھروں کو زباں تو ملی، پر تکلم نہیں
پتھروں کو ملے ہونٹ، لیکن تبسم نہیں
پتھروں کو ملی آنکھ لیکن نظر کون دیتا انھیں
پتھروں کو خد وخال انسان ملے، دولت درد وغم کب ملی
پتھروں کو حسیں صورتیں تو ملیں، دل نہیں مل سکا

مطرب خوش نوا پتھروں کو سناتا رہا درد دل
اپنا غم/ ان کا غم/سب کا غم
پتھروں نے سنا اور چپ چاپ سنتے رہے
پتھروں کی اسی انجمن کا مغنی ہوں میں

بھیڑ میں گم ہوتا اور اپنی شناخت کھوتا ہوا انسان نئی نظم کے شاعر کی نظموں کا اہم موضوع ہے۔ شہر یار نے بھی اس موضوع پر عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ نیا شاعر جدید عہد میں انسان کی شناخت کی بازیابی کے لیے سرگرداں ہے۔ وہ انسان کی مسخ شدہ صورت سے خوفزدہ ہے اور یہ بات اسے مزید افسردہ کر دیتی ہے کہ انسان کو اپنے مسخ شدہ چہروں کا عرفان نہیں ہے مگر جب انھیں اپنی بگڑی اور مسخ شدہ صورتوں کا عرفان ہوگا تو وہ کس قدر خوف زدہ ہوگا اور ان کے خوف کا کیا عالم ہوگا؟ شاعر اس بات پر خوفزدہ ہے اور نئے عہد میں انسان کی شناخت کو موضوع بناتے ہوئے اسے آئینہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔

نفرتوں کے آئینے/ چور ہونے سے پہلے
تم کو اپنے چہروں کے/مسخ ہونے کا عرفاں
ہو گیا تو کیا ہوگا

(ایک عجیب خوف)

میں نہیں جاگتا تم جاگو/ سیہ رات کی زلف
اتنی الجھی ہے کہ سلجھا نہیں سکتا کوئی

(میں نہیں جاگتا)

نئی نظم کا شاعر ایسی نادر اور انوکھی ترکیب اور تشبیہ استعمال کرتا ہے جو پہلے استعمال نہیں ہوئیں۔ ان نادر تشبیہات اور تراکیب سے نظم میں لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے ایک خاص طرح کی جدت اور تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔

نیم سگرٹ ترے پوروں میں دبی
سرخیِ لب نے نشاں چھوڑ دیا ہے جس پر
کہہ رہی ہے کہ حقیقت ہے فقط دود رواں
تو بھی خاموش ہے، میں بھی چپ ہوں
اور ہم دونوں یہی سوچ رہے ہیں دل میں
کاش منت کش اظہار نہ ہونا پڑتا

(منیب الرحمٰن)

سرخیِ لب نے نشاں چھوڑ دیا ہے جس پر......نیم سگرٹ ترے پوروں میں دبی...... نظم کا یہ حصہ اردو نظم میں انفرادیت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس سے پہلے شاید اردو شاعری میں ایسی مثال نظر نہیں آتی کہ نیم جلی سگریٹ جو پوروں میں دبی ہے اور لپسٹک نے اس پر اپنا نشان چھوڑ دیا ہے۔ یہ نظم اندرونی لطیف احساس کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس نظم میں عشق کا لطیف اور مترنم جذبہ تو ہے ہی ساتھ ہی مایوسی اور اداسی کا ہلکا سا احساس بھی ہے جو ساتھ ساتھ چلتا ہے جس سے نظم کی فضا میں ایک سحر اور پیچیدگی سی پیدا ہو گئی ہے۔ اس نظم میں اس عہد کے انسان کی پیچیدہ اور کشمکش سے بھری زندگی کا المیہ شاعر نے منظر نگاری کے حوالے سے بہت خوبصورتی سے بیان کر دیا ہے۔ منظر نگاری کے اعتبار سے یہ ایک غیر معمولی نظم ہے۔ شاعر نے لفظوں کے ذریعے بہت واضح تصویر بنائی ہیں۔ نظروں کے سامنے دو کردار آجاتے ہیں جو ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر یہ سوچتے ہیں کہ کاش منت کش اظہار نہ ہونا پڑتا۔ سگریٹ، پیشانی پر پسینے کی نمی، نظم کی فضا میں زندگی کے تلخ اور پیچیدہ احساس کو پرونے کی کوشش ہے۔

■

Dr. Mohd Shahid
Dept. of Urdu,
Aligarh Muslim Univrsity
Aligarh - 202001 (UP)
Mob.:9412273054
Email.: mskhanalig12@gmail.com

قیصر تمکین کی افسانہ نگاری

فیضان الحق

بیسویں صدی کے نصف آخر کے افسانہ نگاروں میں قیصر تمکین ایک اہم نام ہے۔ قیصر تمکین کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی لیکن انھوں نے انگلستان ہجرت کر کے اسے اپنا مستقل ٹھکانا بنا لیا۔ قیصر تمکین کے بیشتر افسانوں کا خام مواد ہندوستانی مسائل، فرقہ واریت، مشترکہ تہذیب کے زوال اور روایت سے منحرف مسلمان بچوں کی نفسیات سے تیار ہوا ہے۔ قیصر تمکین کا عہد تقسیم کے مابعد کا عہد ہے۔ یہی وہ دور ہے جب ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو پامال کرنے کے لیے انتہا پسند طاقتوں کی سازشیں شروع ہوئیں۔ قیصر تمکین نے ان سازشوں کو کامیاب ہوتے اور باہمی رواداری کو مٹتے دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے مرکزی موضوعات فرقہ واریت، قومی انتشار اور فسادات کے سبب رونما ہونے والے منفی نتائج ہیں۔ فسادات کے متعلق ان کے افسانوں کا دائرہ ہندوستان تک محدود نہیں بلکہ اسرائیل و فلسطین اور جرمن نازیوں کے مابین تنازعات تک پھیلا ہوا ہے۔ اس نوعیت کے نمائندہ افسانوں میں یہودن، کفارہ، یروشلم یروشلم، درگاہ شریف، اللہ اکبر اور ایک کہانی گنگا جمنی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

قیصر تمکین بیشتر مقامات پر فرسودہ روایتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ اس موضوع پر ان کا سب سے طویل اور عمدہ افسانہ 'ژینیت' ہے۔ فرسودہ اقدار کے خلاف بغاوت کا جذبہ اس افسانے میں کامیابی کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔ ان کی ترقی پسندی انھیں مذہب، ملک اور قوم کے دائروں سے پرے ہو کر غور و فکر کا موقع فراہم کرتی ہے۔ وہ جذباتیت اور انتہا پسندی کو نقصان دہ ثابت کرتے ہوئے اسے فساد کی جڑ قرار دیتے ہیں۔ یہ جذباتیت کس طرح بڑے بڑے نقصانات کو جنم دیتی ہے اس کی ایک مثال افسانہ 'ایک کہانی گنگا جمنی' کے کردار 'مولوی حقی' ہیں۔ جنھوں نے گلی کے ایک بندر پر انتقاماً لاٹھی چلا کر شر پسندوں کے لیے فرقہ وارانہ فساد برپا کرنے کے لیے ایک بڑا موقع فراہم کر دیا تھا۔

قیصر تمکین کے افسانوں کے بیشتر کردار خیالی دنیا کے بجائے آس پاس کے ماحول سے سروکار رکھتے ہیں۔

> **قیصر تمکین کے افسانوں کے بیشتر کردار خیالی دنیا کے بجائے آس پاس کے ماحول سے سروکار رکھتے ہیں۔ علامتی اور تجریدی افسانہ نگاری سے یقینا انھوں نے اثر قبول کیا ہے لیکن یہ رنگ ان کے افسانوں پر حاوی نہیں ہونے پاتا۔ ان کی یہ خواہش بھی نہیں تھی کہ انھیں ایک علامتی اور تجریدی افسانہ نگار کے طور پر یاد کیا جائے۔**

علامتی اور تجریدی افسانہ نگاری سے یقیناً انھوں نے اثر قبول کیا ہے لیکن یہ رنگ ان کے افسانوں پر حاوی نہیں ہونے پاتا۔ ان کی یہ خواہش بھی نہیں تھی کہ انھیں ایک علامتی اور تجریدی افسانہ نگار کے طور پر یاد کیا جائے۔ البتہ انھوں نے اپنے افسانوں کو سپاٹ بیانیہ اور طے شدہ انجام پر ختم ہونے سے بچانے کی کوشش ضرور کی ہے۔ یہ خوبی جدید معاشرے پر نظر رکھنے والے افسانہ نگار کے یہاں ہی پیدا ہو سکتی تھی۔ قیصر تمکین کے بقول ''ان کہانیوں میں کہیں کہیں یہ کوشش مستور ہے کہ ''پھر کیا ہوا؟۔ یہ تجسس اس بات کی علامت ہے کہ کہانی کبھی ختم نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اس کا طے شدہ انجام ہوتا ہے۔ جس طرح زندگی مختلف جہتوں میں آگے بڑھ جاتی ہے، اسی طرح کہانی بھی کہیں ختم ہو کر کہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔

قیصر تمکین کے بعض افسانے قدیم ہندو دیو مالا، اساطیر اور مابعد الطبیعاتی عناصر کی عکاسی بھی کرتے ہیں، لیکن ان کے کرداروں کی ارضیت، موجودہ معاشرے کی تصویر کشی اور رہن سہن جلد ہی قاری کو ایک جانی پہچانی دنیا میں داخل کر دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا ابہام تفہیم کی سطح پر چیستاں نہیں بننے پاتا۔ البتہ قارئین کے لیے ذہنی آسودگی کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید اسلوب میں ڈھلے ہونے کے باوجود ان کے افسانے 'کہانی پن' سے مزین ہیں۔

قیصر تمکین کی تخلیقات میں نو افسانوی مجموعے، دو ناولٹ، ایک خودنوشت اور تین تنقیدی کتابیں شامل ہیں۔ حالیہ دنوں میں ان کے نمائندہ افسانوں کا انتخاب ''گومتی سے ٹیمز تک'' منظر عام پر آیا ہے۔ اس انتخاب میں اٹھارہ افسانے شامل ہیں جس میں مختصر افسانوں کے ساتھ وہ افسانے بھی موجود ہیں جنھیں طویل انداز نگارش کی مثال کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح علامتی اور دیومالائی طرز اسلوب کے اہم افسانوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔

افسانہ 'سواستکا' کی قرأت ایک علامتی افسانے کے طور پر بھی ممکن ہے، لیکن افسانے میں موجود سریت سواستکا کو کسی مخصوص معنی کی علامت نہیں بننے دیتی۔ یہ افسانہ راوی اور اجنبی شناسا کے مابین ایک کش مکش کو سامنے لاتا ہے۔ اس کش مکش کی بنیاد پرانی اقدار کی شکست اور تہذیب نو کی بلاخیزی ہے۔ یہ صلیب اور سواستکا کے درمیان کا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سواستکا والا شناسا اجنبی املی کے درخت کے پاس صلیب جلنے پر فاتحانہ شان سے ہنستا ہوا باہر آتا ہے۔ افسانے کا آخری اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''آرام دہ وی سی 10 کے کیبن میں لیٹے لیٹے میں ملکوں ملکوں، شہروں شہروں ہوتا ہوا جب گھر پہنچا تو آنگن میں املی کا وہ درخت کٹ چکا تھا جس کے سایے میں ہم جوان ہوئے تھے۔ وہاں پر ایک صلیب جل رہی تھی۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ صرف دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ایک خوفناک قہقہے نے میرا خیر مقدم کیا۔ وہاں میرا منحوس شناسا، وہی پر اسرار اجنبی تھا۔ جس کے چہرے پر فتح مندی کی چمک تھی۔''

(گومتی سے ٹیمز تک، مرتبہ احسن ایوبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، سنہ 2021، ص 41)

یہاں املی کا درخت اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ راوی اپنے وطن میں صلیب (جو کہ جرمن نازیوں کی خاص علامت ہے) کے خلاف بغاوت اور مخالفت کی آگ جلتی ہوئی دیکھتا ہے۔ یہاں محض سواستکا کا لفظ علامت نہیں ہے، بلکہ صلیب اور سواستکا دونوں دو مختلف تہذیبوں کی علامتیں ہیں۔ کہانی کا مبہم کردار (شناسا اجنبی) ان پرانی اقدار کا واہمہ ہے جو انسان کے ذہن و دماغ سے کبھی محو نہیں ہوتیں اور وقتاً فوقتاً اپنی روایت سے انحراف کا خوف پیدا کرتی رہتی ہیں۔

افسانہ 'باب الابواب' انسانی بے حسی اور سرد مہری کے خلاف ایک بیانیہ ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار 'نادر علی' کی طرح بڑا پھاٹک اور اس کے پیچھے بسنے والی مخلوق بھی پراسرار ہے۔ بظاہر یہ افسانہ قدیم لکھنوی تہذیب وثقافت کی عکاسی کرتا ہے لیکن کہانی میں موجود سریت اس کی معنوی پرت کو گہرا کر دیتی ہے۔ یہ سریت کبھی انسانی بے حسی کی طرف لے جاتی ہے اور کبھی روایت شکنی کی طرف۔ اس میں عہد حاضر کی ترقیوں کے علائم بھی ہیں (مثلاً بجلی کا پٹر) اور عہد عتیق کی مضبوط مثالیں (مثلاً مسیح) بھی۔

افسانہ 'مرحبا' Irony Based افسانہ ہے۔ یہ ان لوگوں پر طنز ہے جو احساس برتری میں مبتلا ہو کر دوسروں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن جب وہی صورت حال ان کے سامنے آتی ہے تو منافقانہ رویہ اپناتے ہوئے اپنا دامن بچا کر نکل جاتے ہیں۔ 'دیدے' اور 'محمود ہومن' دو مختلف زاویۂ نظر کے ترجمان ہیں۔ محمود ہومن کے متعلق یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''محمود ہومن جب پڑھے لکھوں میں بیٹھتا ہے تو اس کی طبیعت افسردہ ہو جاتی ہے۔ جب وہ اچھے لوگوں سے ملتا ہے تو شرمندہ سا ہو جاتا ہے۔ جب کامیاب شخصیات کے قصے سنتا ہے تو کھسیانا ہو جاتا ہے۔ جب مسکراہٹوں اور قہقہوں کی سنہری چمکیلی دھوپ آس پاس بکھرتی ہے تو اس کے وجود پر گہرے منحوس بادل چھا جاتے ہیں اور سب سے زیادہ رنجیدہ تو وہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ننھے شرمگیں پودوں کی طرح لہلہاتی الہڑ اور البیلی لڑکیوں کو دیکھتا ہے۔ ''حسن ہم کو دردمند کیوں بنا دیتا ہے؟'' یہ سوال وہ اپنے آپ سے کرتا ہے اور کوئی جواب نہیں پاتا ہے۔ اس کا فرانسیسی دوست دیدے کہتا ہے: ''محمود ہومن تم میڈیوکر ہو۔'' (ایضاً، ص 48,49)

اس کے بالمقابل دیدے دوسری نوعیت کا فن کار ہے۔ وہ کہتا ہے:

''تم محمود ہومن شاعری اور حقیقت کی کھچڑی پکانے کی کوشش میں میڈیوکر بن جاتے ہو۔ یہ کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ سراپا غم ہو کر مسکرانا ہی اصل فن ہے۔''

لیکن بالآخر جب 'فریدہ' سیاہ فام مرد کی طرف بڑھ جاتی ہے اور اس کے دونوں پیر ٹخنوں تک خون کے حوض میں ڈوب جاتے ہیں تو دونوں میں سے کوئی آگے نہیں بڑھتا۔ اس وقت ثقافت کا پرستار دیدے اور قنوطیت کا بیمار محمود ہومن خاموش تماشائی بنے کھڑے رہتے ہیں۔ دیدے، جو بات بات پر محمود کو میڈیوکر بتاتا تھا، بے شرمی سے قہقہہ لگاتا ہے اور یہ تسلیم کر لیتا ہے کہ ہم دونوں ہی میڈیوکر ہیں۔ یہ سماجی خیر خواہوں کے کھوکھلے دعووں کی شکست ہے جو وقت آنے پر باطل طاقتوں کے سامنے گھٹنا ٹیک دیتے ہیں۔ قیصر تمکین نے یہاں تثلیث کا جو زاویہ قائم کیا ہے وہ دو خود پرستوں کو بے نقاب کرتا دکھائی دیتا ہے۔ فریدہ کا کردار ایک آئینے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے، جو دیدے اور محمود کو ان کا اصلی چہرہ دکھانے کا کام کرتا ہے۔

'سیر گل خوب نہ دیدیم'، یہ افسانہ ہجرت کے کرب، اجنبیت اور خونی رشتوں سے دوری کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ کہانی کے تینوں مرکزی کردار، منظر، ناظر اور صائمہ کی زندگیاں اسی انتشار کے سبب بے رنگ ہو جاتی ہیں۔ منظور صائمہ بجیا سے دوری برداشت نہیں کر پاتا۔ ایک لمحے کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ منظور کا صائمہ بجیا سے ناجائز رشتہ ہے، لیکن یہ رشتہ ایک پاکباز رشتہ تھا۔ یہاں حادثاتی طور پر ان دونوں کی علاحدگی فطرت سے کھلواڑ کے مترادف ہے، جو کہ دونوں کی تباہی کا سبب بنتی ہے۔ قیصر تمکین نے ہجرت کو صرف ملک اور جغرافیائی نقشے کی تقسیم نہ سمجھ کر اسے بہت سے رشتوں کی تقسیم کے طور پر بھی دیکھا ہے۔ یہ رشتے فطرتی ہیں، جن میں تقسیم کے غیر فطری عمل کے سبب علاحدگی پیدا ہو گئی اور دونوں کی تباہی کا سبب بنی۔

افسانہ 'خدا حافظ ابوالحسن' عقلیت پسند میڈیوکر ٹائپ لوگوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ افسانے کا آغاز نہایت دلچسپ اور دیومالائی ہے۔ لیکن کہانی میں ابوالحسن کی انٹری کے بعد افسانہ جنید اور ابوالحسن کے افکار و خیالات کو لے کر آگے بڑھتا ہے۔ ابوالحسن ایک عقلیت پسند مفکر ہے۔ اس نے اپنی پوری زندگی عقلیت کی تبلیغ کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مرنے کے بعد جسم کی تدفین کا بھی قائل نہیں تھا۔ اتفاقاً اجنبی ملک میں ابوالحسن کی موت ہو جاتی ہے۔ اب مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ ابوالحسن نے اپنی موت سے قبل وصیت کی تھی کہ اسے اس کے آبائی وطن میں دفن کیا جائے۔ 'جنید' جو کہ اس کا پرانا دوست ہے، اس وصیت کو لوگوں کی طرف سے گڑھی ہوئی بات سمجھتا ہے۔ وہ رات میں رقص کے دوران خاموشی سے ابوالحسن اور فوٹوگرافر 'ڈیونیز' کے تابوتوں میں ہیرا پھیری کر دیتا ہے۔ جس کے سبب فوٹوگرافر دفن کر دیا جاتا ہے اور ابوالحسن کی لاش جلائی جاتی ہے۔ جنید کا یہ رویہ عقلیت پسندی کے خلاف ایک تازیانہ ہے۔ ساتھ ہی ابوالحسن کی بیجا عقلیت پسندی کا نتیجہ بھی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ابوالحسن نے اپنی موت سے قبل واقعی اس طرح کی کوئی وصیت کی تھی تو اس کے کیا اسباب تھے؟ یہاں افسانہ نگار خاموش ہے۔ شاید اس لیے کہ عقلیت پسندوں کے منحرف رویوں پر اسے بھی حیرانی ہے۔

افسانہ 'یروشلم یروشلم' اس امر کا اثبات ہے کہ قدیم عمارتیں اور پرانی یادیں ہماری زندگی کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ ان کے ضائع کرنے سے انسانی تاریخ کا ایک بڑا حصہ حذف ہو جاتا ہے۔ افسانہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ کوئی بھی شے اپنے وجود کے اعتبار سے نئی یا پرانی نہیں ہوتی، بلکہ لوگوں کی ترجیحات بدلنے سے ان پر قدامت کا گمان گزرنے لگتا ہے۔ لیکن معیار بدل جانے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ اس افسانے کا موضوع قیصر تمکین کی ہندوستان دوستی اور ان کا عہد طفلی ہے۔ افسانہ نگار اپنے ماضی کا قدردان بھی ہے اور اس کے تحفظ کے لیے فکرمند بھی۔

افسانہ 'عہد گل ختم ہوا' طالب علموں کی ہوسٹل لائف

کے علاوہ سماج میں بڑھتی عدم رواداری کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ افسانے کے دو مرکزی کردار 'رام سنگھ' اور 'معجز' دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے کے باوجود ہم پیالہ وہ مشرب والی زندگی گزار رہے ہیں۔ رام سنگھ کیمپس چھوڑنا نہیں چاہتا اور معجز کو سند کی کوئی ضرورت نہیں۔ دونوں اپنے اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔ لیکن ان دونوں کی شراب نوشی اور نتائج سے بے خبری پرانی قدروں کی شکست کی علامت کے طور پر ظاہر ہوئی ہے۔ یہ افسانہ قومی منافرت کے دوستی پر اثر انداز ہونے کی مثال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم قوم سے دشمنی کی خبریں سن کر رام سنگھ شرمندہ ہو کر خودکشی کر لیتا ہے۔ اس وقت 'معجز' کو بھی مسلمانوں کی اپنی کوتاہیوں کا احساس ہوتا ہے۔ قیصر تمکین انتہا پسندی کے خلاف ہیں اور یہاں انتہا پسندی کے نتیجے میں خراب ہوتے دوستانہ تعلقات کے ذریعے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ حساس ذہن اور دردمند دل کبھی بھی انتہا پسندی کو قبول نہیں کر سکتے۔ رام سنگھ کی خودکشی قوم کے انتہا پسند رویے پر حد سے زیادہ شرمندگی اور صدمے کی مثال ہے۔

افسانہ 'باز پرس' اپنی مٹی سے وابستگی اور ایثار کو سامنے لاتا ہے۔ یہ ان لوگوں پر گہرا طنز ہے جو ہجرت یا فرار کو راہ نجات سمجھتے ہیں۔ یہاں افسانہ نگار اپنی زمین سے وابستہ رہتے ہوئے شہید کر دیے جانے کو ہجرت پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کے اندر ایک احساس فتح مندی ہے۔ اور اسی احساس کے ساتھ عالم ارواح سے وہ خط کے ذریعے ان لوگوں سے باز پرس کرتا ہے جو ہجرت کر گئے تھے یا ہجرت کے لیے بیتاب تھے اور مارے گئے۔ اس سلسلے میں وہ ادیبوں اور شاعروں پر بھی اظہار خیال کرتا ہے۔ ایک خط ملاحظہ کیجیے:

''رضوی صاحب!

''اصل میں ادیب و فن کار اگر محض سماجی رتبوں کا پروردہ نہیں ہے تو ایک ایسا مسلک اپناتا ہے جس میں 'مجنوں باشی' کی قدیم شرط اول ہی شرط آخر بھی ہوتی ہے۔ اسی بنا پر میرا خیال ہے کہ کوئی بھی شاعر اور ادیب جو اپنے ملک، اپنے زمین و آسمان اور اپنے شہریوں اور ہمسایوں سے بھاگ کر دوسرے ملکوں میں پناہ گزیں ہوتا ہے تو وہ سب کچھ تو ہو سکتا ہے مگر ایک مخلص ادیب و دانشور نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈاکو ہو سکتا ہے، سوویت یونین کا سولزے نٹسن ہو سکتا ہے، البانیہ کا اسماعیل قادری ہو سکتا ہے، اردو کا۔۔۔خیر چھوڑیے بھی۔ کہنا یہ تھا کہ بھاگنے والا سقراط، مسیح اور منصور نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ اس راہ فرار کے معنی ہی فقدان اخلاص کے ہیں۔'' (ایضاً، ص 141)

یہاں افسانہ نگار نے ایسے ادیبوں اور شاعروں کو نشانہ بنایا ہے جو ملک سے ہجرت کر جانے کو ہی مسئلے کا حل سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ قیصر تمکین خود بھی ایک مہاجر تھے، لیکن اس کے باوجود ان کا یہ خیال اہمیت ضرور رکھتا ہے۔ ان کے مطابق ادیب کا اصل کام ہجرت کرنا نہیں بلکہ مسائل سے نبرد آزما ہونا اور ان پر بے باکی سے اظہار خیال کرنا ہے۔ مکتوباتی انداز میں لکھا گیا یہ افسانہ یک طرفہ ہونے کے باوجود کافی دلچسپ اور Attacking نوعیت کا ہے۔

افسانہ 'سر مقتل' ضبط تولید کو زیر بحث لا کر آنے والی نسلوں کے تئیں ایک تشویش کو اجاگر کرتا ہے۔ راوی کا یہ خوف کہ اب ایسی نئی نسل پیدا ہی نہیں ہو سکتی جس کے لیے کوئی پیغام چھوڑا جائے، نسل نو کی اقدار دشمنی، اور رنگینیوں کی طرف ان کے میلان کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے کچھ جملے ملاحظہ فرمائیں:

''وہ دن گئے جب دن دن بھر کتب خانوں میں صرف یہ معلوم کرنے کے لیے بیٹھے رہتے تھے کہ اگلے وقتوں کے جانباز کس دھج سے سر مقتل گئے۔''

حقیقت یہ ہے کہ وہ نئی پیڑھی جس کا 'میں' منتظر ہوں اور 'وہ' متوالا تھا، اب ہماری تہذیب کے بطن سے پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔'' (ایضاً، ص 171)

بغیر کوئی آخری پیغام دیے پھانسی کے پھندے پر جھول جانے والا یہ شخص اصول پسند اور اپنی روایت کا امین ہے، جس کے بعد اس کا کوئی وارث نہیں۔ وراثت کے تحفظ کا فقدان جو کہ ہمارے عہد کا بڑا المیہ ہے اس افسانے کا مرکزی خیال بن کر ابھرا ہے۔

'نوجیون' ایک ایسا افسانہ ہے جو فسادات کے انسانی ذہن و دماغ پر پڑنے والے مہلک اثرات کی نشان دہی کرتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار 'عنایت' ہے۔ جو شر پسندوں کے ہاتھوں قتل کیے جانے کی کئی واردات دیکھ چکا تھا۔ وہ بالآخر اپنے آپ کو ایک مردہ تسلیم کر لیتا ہے۔ اسی غیر انسانی رویے کے سبب وہ مذہب سے بھی بیزار ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں بھی قیصر تمکین نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انتہا پسندی کس طرح امن پسند ذہنیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور فسادات سے اس شخص پر کیسے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہاں جو حالت 'عنایت' کی ہے، بیشتر امن پسند اشخاص اسی صورت حال میں گرفتار نظر آتے ہیں، اور یہی ہمارے سماج کی Irony ہے۔

'ژینت' اس انتخاب میں شامل سب سے طویل کہانی ہے۔ اسے طویل انداز نگارش کی ایک مثال بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ 'ژینت' متعصب اور قدامت پرست مسلم گھرانوں سے اٹھنے والی بغاوت اور احتجاج کی ان آوازوں کی کہانی ہے جو اپنے گھروں کے فرسودہ نظام کے خلاف بلند ہوتی ہیں۔ کہانی کے مرکزی کردار 'ژینت' اور 'عدو' بھائی کی زندگیوں کے اتار چڑھاؤ دوسروں کے لیے ایک تحریک اور ترغیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک معمولی غریب لڑکی ہونے کے باوجود ژینیت جس طرح بیرون ملک جا کر کامیاب آرٹسٹ بنتی ہے اور خوب پیسے کماتی ہے، یہ اس کی بے باکی کی مثال ہے۔ ژینیت کا کردار شروع ہی سے اپنی بہادری کا جلوہ دکھاتا نظر آتا ہے، جس کی پہلی نمائش احمد کے اسکول میں کچھ غنڈوں کی پٹائی کے وقت سامنے آتی ہے۔ ژینیت نے یہ ثابت کر دیا کہ دنیا میں اصل تقسیم صرف امیری اور غریبی کے مابین ہے۔ اس تقسیم سے نہ کوئی رشتے دار محفوظ ہے اور نہ ہی مساوات کا درس دینے والا کوئی فرد۔ ژینیت کا کردار لڑکیوں کی زندگی کے کئی پہلوؤں کو روشن کرتا ہے۔ اسی طرح 'عدو' بھائی کا کردار متمول مسلم گھرانوں کے ان لڑکوں کی مثال ہے جو کچھ دنوں تک روایتی نہج پر چلنے کے بعد اپنے شعور کو کام میں لاتے ہیں اور اس نہج سے انحراف کی جسارت کر بیٹھتے ہیں۔ اس قسم کے کردار ماحولیاتی تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے اپنے ذہن و دماغ کو تیار رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ژینیت بھی جب عدو سے ایک مدت کے بعد ملتی ہے تو اس کی فکر سے متاثر ہو کر اس سے قریب ہو جاتی ہے۔ عدو کی ماں اور دوسرے لوگوں کی ہزار کوششوں کے باوجود افسانے کے اخیر میں عدو اور ژینیت کی ایک دوسرے سے جذباتی ہم آہنگی محض اتفاق نہیں، بلکہ ناسازگار ماحول میں دو مثبت روحوں کے ملاپ کی علامت ہے۔

زبان و اسلوب کی سطح پر یہ اعتراف ضروری ہے کہ قیصر تمکین کے افسانوں کی زبان بہت سلیس اور رواں ہے۔ وہ صحافی بھی ہیں اور انگلستان میں رہنے کی وجہ سے وہاں کی زبان اور کلچر سے بخوبی واقف بھی۔ لیکن ان کی زبان نہ تو انگریزی زدہ ہے اور نہ ہی ان کا بیانیہ صحافت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ انھوں نے اسلوب کی سطح پر کئی تجربے کیے ہیں لیکن کسی بھی عنصر کو اپنے آپ پر حاوی نہیں ہونے دیا ہے۔ وہ ایک کہانی کار ہیں اور کہانی کار کی حیثیت سے علامت، دیومالا، ابہام اور داستان سے بھی استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔

■

Faizanul Haque
F-11/18, Third Floor
Jogabai Extn, Near Nooh Masjid, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Mob.:8800297878

کیتھی رسم الخط کا نوحہ

زبیر احمد بھاگلپوری

رسم الخط مافی الضمیر کے تحریری اظہار کا وسیلہ ہے۔ فی الوقت Summer Institute of Linguistics کی رپورٹ کے مطابق دنیا میں 4065 رسم الخط کا استعمال ہو رہا ہے جبکہ wikipedia کی رپورٹ کے مطابق دنیا میں کم از کم 3866 زبانیں ایسی ہیں جن کا اپنا باضابطہ تحریری نظام ہے۔ ہمارے ملک کے اندر The People's Linguistic Survey of India کی رپورٹ کے مطابق چھوٹی بڑی تقریباً 780 زبانیں بولی جاتی ہیں اور تقریباً 66 رسم الخط زیر استعمال ہیں۔

دنیا کے قدیم ترین رسم الخط کی بات کی جائے تو میسوپوٹامیہ کی تہذیب میں تقریباً 3400 سال قبل مسیح خط میخی (cuneiform script) وجود میں آیا جسے مسلمہ طور پر قدیم ترین رسم الخط تصور کیا جاتا ہے۔ زبان و رسم الخط کے تقریباً پانچ ہزار سالہ تاریخی سفر میں ہزاروں رسم الخط وجود میں آئے اور معدوم بھی ہو گئے جس کا واضح سبب یہ رہا کہ اہل زبان کا اپنی زبان اور اس کے رسم الخط سے عملی رشتہ ٹوٹتا رہا اور رسم الخط طاق نسیاں میں گم ہوتے رہے۔ وادی سندھ میں دریافت ہونے والا ہندوستان کا قدیم ترین تصویری رسم الخط ہو یا برہمی یا کھروشٹھی رسم الخط، سب کے سب استعمال کنندگان کی بے اعتنائی کے سبب مرور ایام کے ساتھ صفحۂ ہستی سے مٹتے چلے گئے۔ انہی میں سے ماضی قریب کی تاریخ کا حصہ بننے والا ایک 'کیتھی' رسم الخط بھی ہے جو تقریباً چار سو برسوں تک خصوصاً یوپی اور بہار کے گھر گھر میں چھایا رہا۔

آغاز و ارتقا: دیوناگری کی مانند بائیں سے دائیں سمت لکھے جانے والے 'کیتھی' رسم الخط کے ظہور اور ارتقا کے حوالے سے سوامی شنکر آنند نے اپنی کتاب The Indus people speakers میں لکھا ہے کہ اپنشد عہد میں زراعت سے وابستہ ایک برادری ہوا کرتی تھی جسے ''کیتھ'' کہا جاتا تھا۔ ماہر لسانیات راجیشور جھا نے اپنی ایک تحقیقی کتاب 'متھلا بھارتی'' میں لکھا ہے کہ 'کیتھی' رسم الخط اسی برادری سے منسلک ہے۔ اسی طرح اشوک کمار ورما کی تحقیق کے مطابق شمالی ہند خصوصاً یوپی اور بہار میں آج بھی 'کایستھ' ذات کے لوگ بڑی تعداد میں موجود ہیں اور معاشی اور علمی نقطۂ نظر سے انتہائی ترقی یافتہ ہیں۔ ان کے مطابق محرری ان کا قدیم آبائی پیشہ رہی ہے۔ انہی لوگوں کو 'کیتھی' رسم الخط ایجاد کرنے کا شرف حاصل ہے۔ ایک انگریز محقق جارج ابراہم گریرسن نے اپنی کتاب Linguistic Survey of India میں اس حوالے سے لکھا ہے:

''کیتھی رسم الخط اسی رسم الخط کا نام ہے جو شمالی ہندوستان میں 'کیتھ' یا 'کایستھ' نام کی محرر برادری میں رائج ہے۔ کم مروجہ حروف کے سبب یہ رسم الخط مکمل نہیں ہے، تاہم اس رسم الخط اور دیوناگری رسم الخط کے درمیان وہی رشتہ ہے جو نوشتہ انگریزی اور مطبوعہ انگریزی کے درمیان ہے۔ گجرات کے ساحلی علاقے سے لے کر کوشی کے کنارے تک پورے شمالی ہند میں عموماً کیتھی رسم الخط کا رواج ہے۔''

ایک دیگر روایت کے مطابق قدیم ہندوستان کی سولہ ریاستوں میں سے ایک 'مگدھ' ریاست تھی۔ بودھ کی مذہبی کتاب ''للت وستر'' کے مطابق مگدھ کا ایک خاص رسم الخط تھا۔ ماہرین لسانیات کے ایک طبقے کا نظریہ یہ ہے کہ مگدھ کے اسی قدیم رسم الخط کی تبدیل شدہ شکل 'کیتھی' ہے۔ اس طرح اس رسم الخط کا آغاز مگدھ کے دور حکومت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔

دائرۂ اثر (Scope): گریرسن کے متذکرہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ اس رسم الخط کا استعمال گجرات سے لے کر شمالی ہند کے مشرقی علاقے تک ہوا کرتا تھا۔ اپنی کتاب 'متھلا بھارتی' میں راجیشور جھا نے لکھا ہے کہ کیتھی مشرق بعید میں موجودہ آسام تک پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ آسام کی موجودہ زبان کے فروغ میں کیتھی کا اہم رول رہا ہے۔ خود ہوین سانگ نے لکھا ہے کہ ساتویں صدی میں کامروپ (آسام) کی زبان اور رسم الخط اور مگدھ کی زبان اور رسم الخط (کیتھی) میں بہت ہی کم فرق تھا۔ آسام کا کیتھی رسم الخط وہاں کے کایستھوں کے یہاں قدیم دستاویزات اور زائچوں میں ابھی بھی دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ قدیم مگدھ کے بودھ مذہب کے روحانی پیشوا اپنا روحانی نظام لے کر تبت گئے تھے۔ وہ نظام کیتھی رسم الخط میں ہی تھا۔ آج بھی نیپال کے قدیم باشندے، جو عموماً نیپال کے ادے پور ضلع میں رہائش پذیر ہیں، اپنی عملی زندگی میں کیتھی رسم الخط کا ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح واضح ہو گیا کہ یہ رسم الخط اپنے عہد شباب میں پورے شمال ہند کے علاوہ نیپال اور تبت تک پھیلا ہوا تھا۔

کیتھی اور سرکاری سرپرستی: ''تاریخ شیر شاہی'' کے مطابق لگان وصولی کے لیے شیر شاہ کے دور حکومت میں کئی عہدیدار بحال کیے جاتے تھے جن میں ایک عہدہ 'کارکن' کا ہوتا تھا۔ اس عہدے پر بیک وقت دو کارکن مامور کیے جاتے تھے جن میں سے ایک ہندی نویس اور دوسرا فارسی نویس ہوا کرتا تھا۔ ہندی نویس کارکن زمینی دستاویز کیتھی رسم الخط میں لکھا کرتے جس کے سبب ریاست کی ہندو رعایا کو زمینی معاملات میں فائدہ ہوتا تھا۔ اس طرح برطانوی دور حکومت سے پہلے ہی کیتھی کو سرکاری رسم الخط کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ شیر شاہ نے باضابطہ طور پر حکم جاری کیا تھا کہ سرکاری فرمان اور اعلانات فارسی رسم الخط کے ساتھ ساتھ کیتھی میں بھی درج کیے جائیں۔ 1540 میں شیر شاہ سوری کے ذریعے دان پتر یا وقف نامہ میں فارسی زبان کے ساتھ ساتھ کیتھی رسم الخط استعمال کیا گیا ہے۔ شیر شاہ وہ واحد مسلم حکمراں ہوئے جنہوں نے ہندو رعایا کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے سرکاری دستاویزات کو فارسی کے ساتھ کیتھی میں بھی لکھنے کا حکم دیا۔ اس طرح واضح ہے کہ اس رسم الخط کو شیر شاہ کے دور میں سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔

برطانوی دور حکومت میں 1880 میں اس وقت کے لفٹی ننٹ گورنر سر ایشلے ایڈن کے ذریعے جاری ہدایت کے بعد کیتھی رسم الخط بہار کا سرکاری رسم الخط بن گیا۔ ایشلے کے حکم کے بعد بہار کی عدلیہ میں کیتھی کا ہی استعمال شروع ہوا۔ چونکہ بہار کی رعایا کا بیشتر حصہ کیتھی پڑھنے لکھنے والے لوگوں پر مشتمل تھا اور ان کے لیے یہ رسم الخط سہولت بخش تھا، ایشلے نے فارسی کی جگہ کیتھی کو عدالتوں میں استعمال کا حکم صادر کیا۔ جنوری 1881 تک فارسی کی جگہ کیتھی نے لے لیا تھا۔ شیر شاہ نے سرکاری طور پر فارسی کے ساتھ ساتھ کیتھی کے استعمال کی اجازت دی تھی لیکن ایشلے کی خاصیت یہ تھی کہ اس نے عدالتوں اور دستاویزات میں صرف

کیتھی کے استعمال کا حکم دیا۔ اس سے قبل 1875 میں ہی محکمہ عوامی تعلیم کے ڈائرکٹر جے بی بیمسفیلڈ نے کیتھی رسم الخط کی معیار بندی (Standardization) کا حکم دیا تھا۔

کیتھی رسم الخط کے فروغ میں ڈاکٹر گریرسن کا رول کافی اہم رہا۔ 1880 میں وہ بہار سرکل کے انچارج انسپکٹر آف اسکولس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1881 میں انھیں کیتھی حروف ڈھالنے کا کام سونپا گیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ لفٹی نینٹ گورنر سر ایشلے ایڈن بہار کی کچہریوں سے فارسی کو ختم کر کے کیتھی یا ناگری رسم الخط بحال کرنا چاہتے تھے۔ گریرسن اس سے پہلے ہی کیتھی رسم الخط سے متعلق مواد اکٹھا کر چکے تھے لیکن اسی اثنا میں وہ بیمار پڑ گئے۔ نتیجتاً یہ کام کچھ وقتوں کے لیے ملتوی کرنا پڑا۔ صحت یابی کے بعد 25 جنوری 1881 کو انھوں نے اس رسم الخط کے حروف ڈھلوائے اور کام کی تکمیل کے بعد ایک رپورٹ بھی تیار کی جو سرکاری تمہید سمیت ''کلکتہ گزٹ'' میں شائع ہوئی۔

بہار کی عدالتوں میں کیتھی کی منظوری کے بعد انگریز حاکموں کے لیے خصوصاً جن کا تعلق عدالتی امور سے تھا، کیتھی رسم الخط سیکھنا ایک طرح سے لازمی ہو گیا۔ اس تقاضے کی تکمیل کے لیے گریرسن نے A handbook of 'Kaithi charector' نام کا کتابچہ شائع کیا۔ اس طرح گریرسن کی کیتھی رسم الخط کے فروغ کے حوالے سے کی گئی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

کیتھی کا استعمال: گریرسن نے جب کامیابی کے ساتھ کیتھی رسم الخط کے حروف کو ڈھلوانے کا کام پورا کرلیا تو نجی پبلیشرز نے بھی اس کے استعمال میں دلچسپی دکھائی جس کے نتیجے میں اس رسم الخط میں اشاعت کا کام بھی بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ عدالتوں میں بڑے پیمانے پر اس رسم الخط کا استعمال شروع ہوا۔ اس وقت بہار کا شاید ہی کوئی رجسٹری آفس ہو جہاں کثیر تعداد میں کیتھی میں لکھی دستاویز دستیاب نہ ہو۔ اس حوالے کی تفصیلات 1939 میں شائع ایس. کے. داس کی کتاب "Selection of Hindustani documents from the court of Bihar" میں درج ہیں۔

اودھ میں سرکاری اسکولوں کی کتابیں بھی 1875 میں کیتھی رسم الخط کی معیار بندی کے بعد شائع ہونے لگیں۔ پٹنہ کے کھڑگ ولاس پریس اور لکھنؤ کے منشی نول کشور پریس کے ذریعے کیتھی میں بڑی تعداد میں کتابیں چھپنے لگیں۔ سرکاری رسم الخط کا درجہ حاصل کرنے کے بعد کھڑگ ولاس پریس نجی زمرے کا اولین پریس تھا جس نے کیتھی ٹائپ اور فونٹ استعمال کرنے کا آرڈر حاصل کیا تھا۔ یہ پریس نجی زمرے کے کام کے ساتھ ساتھ سرکاری دستاویزات بھی شائع کرتا تھا۔

کیتھی رسم الخط کا سرکاری سرپرستی کے سبب خوب فروغ ہوا، تاہم اسے دیوناگری رسم الخط کی آب و تاب نہیں حاصل ہو سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پرائمری سطح کے اسکولوں کے لیے تو کیتھی میں کتابیں شائع ہوتی تھیں لیکن ثانوی سطح کے اسکولوں میں اب تک دیوناگری میں ہی کتابیں استعمال ہو رہی تھیں۔ اس بات کی تصدیق برطانوی افسر بارنلے کی رپورٹ بھی کرتی تھی جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ کیتھی کے استعمال کے بارے میں اب تک پوری طرح سے غور و فکر نہیں کیا گیا ہے۔ دیوناگری سے کیتھی کے پچھڑنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ کیتھی کا فونٹ کم تعداد میں تیار کیا گیا تھا اور اس کے اعراب بھی نسبتاً کم تھے جس کے سبب دیوناگری اس کے مقابلے زیادہ ترقی کر پائی۔

حالانکہ 1881 میں سرکاری سطح پر یہ فیصلہ لیا گیا تھا کہ پرائمری اور ثانوی اسکولوں کی کتابیں کیتھی میں شائع ہوں گی۔ ایسا اس لیے ہوا کہ اودھ اور بہار میں کیتھی بہت مقبول تھی، لیکن شمال-مغربی ریاست یا اودھ ریاست کے ذریعے اس کے برعکس پالیسی اپنائی گئی اور سرکاری فیصلے کے باوجود دیوناگری کو ترجیح دی گئی اور بعد میں دیوناگری کے حق میں سرکاری طور پر فیصلے بھی لیے گئے۔

ادھر سرکار سے منظوری کے بعد سرکاری ملازمین کو اس رسم الخط سے روشناس کرانے کی ضرورت پڑی۔ اسکولوں کے ایسے اساتذہ جو اب تک کیتھی سے نابلد تھے، ان کو بھی یہ رسم الخط سکھانے کے لیے کئی رہنما کتابیں شائع کی گئیں۔ مثلاً گریرسن کی A Kaithi handbook، امبیکا پرساد کی ''کیتھی چتر مالا'' اور ہنومان پرساد کی ''کیتھی ورن مالا'' وغیرہ اہم رہیں۔

دیگر سرکاری محکموں کے علاوہ مردم شماری کے لیے بھی کیتھی کا استعمال ہوتا تھا۔ 1874 میں ہنری ویورلی کے ذریعے لیے گئے فیصلے کے بعد مردم شماری کا فارم جہاں بنگلہ، ہندوستانی، فارسی اور اڑیا وغیرہ میں شائع ہوتا تھا، وہیں کیتھی رسم الخط میں بھی اس کی اشاعت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ انگریزی حکومت نے نہ صرف زمین کے وثیقوں کی کیتھی میں اشاعت کی اجازت دی بلکہ لگان کی رسید بھی شائع کی گئی۔ پیشہ ورانہ معاملات میں بھی کیتھی کا استعمال بڑے پیمانے پر ہوتا تھا اور اس کے لیے استعمال کی جانے والی رسیدیں بھی کیتھی میں لکھی جاتی تھیں۔ اس مختصر تفصیلات سے واضح ہے کہ کیتھی رسم الخط سرکاری اور عوامی دونوں سطحوں پر کثرت سے صدیوں تک خصوصاً شمالی ہند میں استعمال کیا گیا۔

زوال کے اسباب: متذکرہ رسم الخط آزادی کے بعد تک استعمال ہوتا رہا تھا لیکن رفتہ رفتہ شمالی ہند کا یہ اہم رسم الخط صفحۂ تاریخ کا حصہ بن گیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی وجہ تو خود سرکاری پالیسیوں کی خامی تھی۔ شمال، شمال-مغربی ریاست اور اودھ میں سرکاری افسران کے ذریعے کئی بار کیتھی کی مخالفت کی گئی لیکن بہار میں ایسی صورت حال نہیں تھی۔ کیتھی کی مخالفت کا بیج 1847 میں اس وقت پڑا جب حکومت نے آگرہ ضلع کے دیہی اسکولوں میں کیتھی کی جگہ دیوناگری کو وسیلۂ تعلیم بنا دیا۔ اسی طرح 1852 میں ریونیو کے صدر بورڈ نے حکم دیا کہ تمام دیہی دستاویز میں ناگری رسم الخط کا ہی استعمال کیا جائے۔ سال 1870 اور 1880 کی تعلیم سے متعلق رپورٹ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حکومت نے یہ حکم جاری کر رکھا تھا کہ ایسے کسی بھی پٹواری کی بحالی نہ کی جائے جو صرف 'کیتھی' جانتے ہوں یعنی ناگری سے واقف نہ ہوں۔ اس طرح رفتہ رفتہ کیتھی کا زوال شروع ہوا۔

ادھر اودھ میں سرکاری پالیسی قدرے زیادہ ہی کیتھی مخالف رہی۔ 1871 میں عوامی تعلیم کے ڈائرکٹر کولن برانگس نے یہ آڈر پاس کر دیا کہ دیہی اسکولوں میں درجہ 2 تک، قصباتی اسکولوں میں درجہ 3 تک اور ضلع اسکول میں درجہ 6 تک کیتھی کی پڑھائی نہیں ہوگی۔ اس کے بعد 1975 میں جے. بی. بیمسفیلڈ ڈائرکٹر بنے جنھوں نے اسکولوں میں پھر سے کیتھی کی تعلیم شروع کرنے کی کوشش کی۔

انگریز حاکموں کے علاوہ چند داخلی عناصر نے بھی کیتھی مخالف مہم میں حصہ لیا۔ الہ آباد سے شائع ہونے والے روزنامہ 'پردیپ' نے 1883 میں اور کانپور سے نکلنے والے روزنامہ 'برہمن' نے 1888 میں ہی کیتھی کے خلاف آرٹیکل شائع کر کے ہوا بنانے کی کوشش کی اور ناگری کو رائج کرنے کی وکالت کی۔ لیکن سرکاری تعاون کے بغیر بھی کیتھی 1947 کے بعد تک عوامی استعمال میں رہی۔ آج ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا ایک وافر حصہ اپنے دامن میں سمیٹے کیتھی ماضی کی تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔

ماخذات:

One Language two sdrypt Christopher R. Ring

2 کیتھی لپی کا اتہاس۔ بھیرولال داس

Linguistic survey of India, by : J. A Grierson 3

The Indus people speakers, Shankaranand Swamy4

5 اکھر مالا۔ گنا کر مولے

■

Zubair Ahmad Bhagalpuri
Urdu Section
Bihar Legislative Council (MLC)
Patna - 800001 (Bihar)
Mob.:9334899643

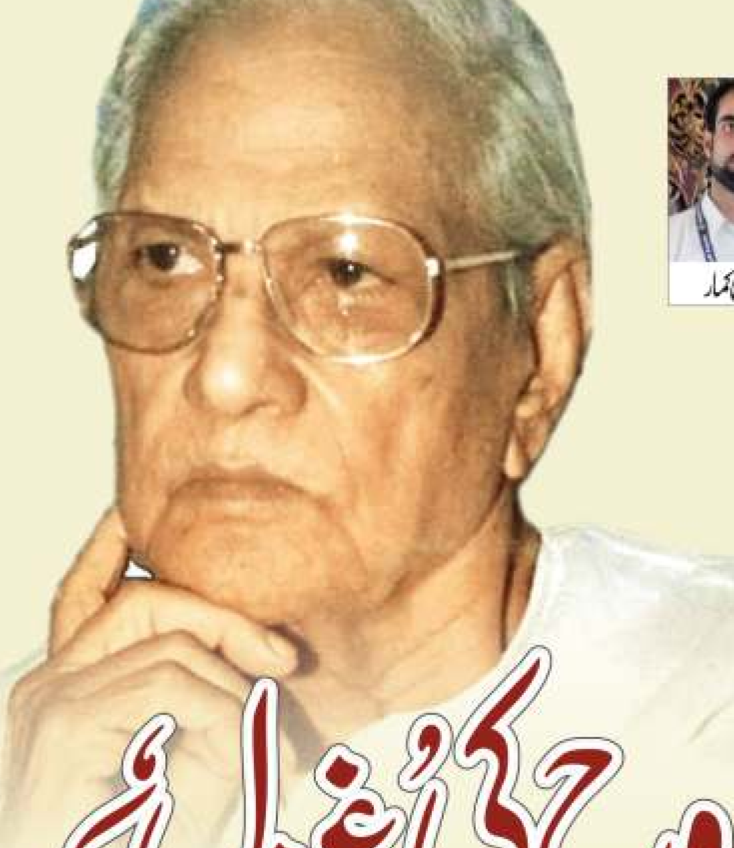

مجروح کی غزل کے

چند امتیازی پہلو

غلام نبی کمار

مجروح سلطان پوری صفِ اول کے غزل گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ جدید اردو شعرا میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ اردو کے جن شعرا نے خداداد صلاحیت پائی تھی ان میں مجروح بھی شامل ہیں۔ انھوں نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں شعر گوئی کا آغاز کیا تھا تاہم کم گوئی کے سبب وہ اپنے شعری سرمائے میں خاطر خواہ اضافہ نہ کر سکے۔ مجروح صاحب کی خوش بختی تھی کہ انھیں جگر مراد آبادی جیسا رہنما مل گیا جو انھیں مشاعرے کی طرف لے گئے۔ جگر مراد آبادی اپنے زمانے کے نوجوان نسل کے باصلاحیت شعرا کو اپنے ساتھ مشاعروں میں لے جایا کرتے تھے جیسا کہ قول مشہور ہے کہ 'ہیرے کی پرکھ جوہری جانے' کے مصداق جگر مراد آبادی مجروح کی صلاحیت کو بھانپ چکے تھے۔ چوں کہ مشاعرے کو مقبول بنانے کے لیے اچھے ترنم کا ہونا بھی ضروری ہے گویا مجروح اس کا اچھا انتخاب تھے جو اچھی شاعری، خوبصورت لب و لہجے اور عمدہ ترنم کے ساتھ شعر پڑھنے کا ہنر جانتے تھے۔ یہیں سے مجروح کی شہرت و مقبولیت اور عزت و وقار میں اضافہ ہونے لگتا ہے اور ان پر فلموں میں کام کرنے کے دروازے کھلتے ہیں۔ مجروح اپنی کم بختی کا ذمے دار اپنی قسمت کو ٹھہراتے ہیں۔ وہ اس بات سے دل شکستہ ہوئے تھے کہ صحیح وقت پر انھیں کوئی رہنما نہ مل سکا جو ان کا حوصلہ بڑھاتا اور ان کے پیش پیش رہتا۔ مجروح اردو شاعروں کی اس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں جو خود کو مشاعروں تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس بات کو ملحوظ رکھا کہ شاعری ادب کا ایک اہم حصہ ہے اور اس کی ادبی سطح اور معیار کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اسی لیے مجروح بڑے شوق کے ساتھ ادبی رسائل و جرائد کو اپنا کلام اشاعت کے واسطے بھیجتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج مجروح کا جتنا بھی شعری سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے وہ فلمی نغموں تک محدود نہ رہ کر ہمارے شعری ادب کا ایک اٹوٹ حصہ بن گیا ہے۔

مجروح سلطان پوری کا پہلا مجموعہ کلام 'غزل' کے عنوان سے 1953 میں انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع ہوا۔ بعد میں اس مجموعے کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ لیکن بعد کے ایڈیشن پہلے ایڈیشن ہی کا متبادل روپ ہوتے تھے جو وقتاً فوقتاً 'غزل' ہی کے عنوان سے شائع ہوتے رہے۔ مجروح نے 1991 میں اسی مجموعہ کلام کو پھر معمولی ترمیم و اضافے کے ساتھ 'مشعلِ جاں' کے نام سے شائع کیا۔ جس میں محض چند غزلوں اور نظموں کا اضافہ کیا گیا۔ جب کہ متفرق اشعار اور چند نظمیں جو پہلے ایڈیشن میں شامل ہیں اُن کو 'مشعلِ جاں' میں شامل نہیں کیا گیا۔ مجروح کا کُل غزلیہ سرمایہ تقریباً بیالیس غزلوں پر مشتمل ہے۔

اردو کے ترقی پسند شاعروں میں مجروح سلطان پوری کا نام سرفہرست رکھا جاتا ہے۔ مجروح ترقی پسند مصنّفین کے علمبرداروں میں بھی شمار ہوتے ہیں کیوں کہ مجروح زندگی بھر ترقی پسند تحریک کے اصولوں کی پیروی کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی غزل گوئی کے ذریعے ترقی پسند خیالات اور رجحانات و میلانات کی بھرپور عکاسی کی۔ مجروح اس وقت بھی غزل کی تائید میں کھڑے رہے جب ترقی پسند ادب میں اسے مردود صنف قرار دیا جا رہا تھا، اسے ہدفِ ملامت سمجھا جاتا تھا اور یہاں تک کہ اسے 'وحشی صنفِ سخن'' بھی قرار دیا گیا۔ دراصل ترقی پسند حلقے میں غزل کے مقابلے میں نظم کو فوقیت دی جا رہی تھی۔ انھیں اعتراض تھا تو غزل کی تنگ دامنی پر، وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ غزل ان کے اصولوں پر کھری نہیں اترتی۔ اس بے بسی اور تنہائی کے عالم میں بھی مجروح نے ہمت نہیں ہاری کیونکہ انھیں خود پر اعتماد تھا کہ وہ ترقی پسند نظریات اور عصری مضامین کو غزل کے سانچے میں ڈھالنے کی بھرپور اہلیت رکھتے ہیں وہ اسی یقین اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھتے گئے اور ثابت کر دیا کہ غزل میں زندگی اور کائنات کے رنگارنگ موضوعات کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب مجروح ترقی پسند تحریک کے اہم رکن تسلیم کیے گئے اور ان کا کلام ترقی پسند ادب کے ترجمان رسائل 'عصری ادب' اور 'گفتگو' میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہونے لگا۔ مجروح کے کلام میں جو جاذبیت، جو معنویت اور جو لطافت ہے وہ اسے وسعتوں سے ہمکنار کرتی ہے۔ ان کے کلام میں اتنی تاثیر اور دلکشی ہے کہ وہ اردو کے ضرب المثل اشعار بن سکتے ہیں۔ جس کی بہترین مثال ان کا یہ شعر ہے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ترقی پسند اردو غزل کو عروج بخشنے میں مجروح سلطان پوری

نے ایک اہم کردار نبھایا ہے۔ان کا کوئی بھی ہم عصر غزل گو شاعر ترقی پسند شاعری کو اتنی بلندی تک نہ لے جا سکا۔مجروح کے کئی اشعار ان کی ترقی پسند فکری اساس کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ترقی پسند ادیبوں کا گروہ سمجھتا تھا کہ اس تحریک کے مقصد کی صحیح ترجمانی نظم کے پیرایہ اظہار ہی میں ممکن ہے۔مگر مجروح کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کچھ الگ رائے رکھتے ہیں:

''غزل کے میدان میں انھوں نے وہ سب کچھ کہا ہے جس کے لیے بعض ترقی پسند شعرا صرف نظم کا پیرایہ ہی ضروری اور ناگزیر سمجھتے ہیں۔صحیح طور پر انھوں نے غزل کے نئے شیشے میں نئی شراب بھر دی ہے۔''[1]

مجروح نے اپنے توانا اور پُرجوش لب و لہجے سے ترقی پسند رجحان میں ایک نئی حرارت ڈال دی۔ان کی غزلوں کے سامنے ان کے ہم عصر شعرا کی نظمیں بھی پھیکی پڑنے لگی تھیں۔اردو کے کئی بڑے شعرا جن کی ان کے زمانے میں اتنی قدر و منزلت نہیں ہوئی جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔ٹھیک اسی طرح کا ماحول مجروح سلطان پوری کے لیے پیدا کیا گیا تھا مگر مجروح کے پروازِ تخیل کا کمال تھا کہ فضا نے کروٹ بدلی اور تنقیص تعریف میں بدل گئی۔مجروح کی غزل کے کچھ اشعار جو ان کے ترقی پسند رجحان کے امتیازی پہلوؤں کو بہت خوبی کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں، یہاں ملاحظہ فرمائیے۔

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

ہشیار، سامراج کہ زنجیر ایشیا
ٹوٹے گی تیرے سلسلہ جان وتن کے ساتھ

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

اب زمین گائے گی، ہل کے ساز پر نغمے
وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے

مجروح اٹھی ہے موجِ صبا آثار لیے طوفانوں کے
ہر قطرۂ شبنم بن جائے اک جوئے رواں کچھ دور نہیں

مجروح سلطان پوری کی غزلوں میں اس نوع کے درجنوں شعر ہیں جو ان کی انقلابی فکر کی تائید کرتے ہیں۔ترقی پسند فکر کے ان اشعار میں انقلابی گھن گرج، پُرجوش و توانا لب و لہجہ، نئی سوچ، نئی فکر، نئی صبح کی آمد، ولولہ و عزم، آزادی اور بے باکی کی ایک نئی تاثیر دیکھی جا سکتی ہے۔مجروح کے ان اشعار میں جس جرأت مندی کا اظہار ہوا ہے وہ مادی، ذہنی، روحانی، سیاسی، سماجی، اخلاقی اور معاشرتی جبر و استحصال سے آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں۔شاعر نے اپنے شعروں میں جو روح پھونک دی ہے وہ ان کی آزادی فکر اور ایک نئی صبح کی آمد کا اعلان ہے۔مزدوروں اور محنت کش طبقوں کی حمایت میں ترقی پسندوں نے سماج کے ٹھیکے داروں کے خلاف جو علم بلند کیا تھا مجروح نے اسے مزید بلندیوں سے ہمکنار کرایا۔انھوں نے فنی، فکری اور موضوعی ہر سطح پر اس احساس کو اس طرح برتا کہ وہ نہ صرف ترقی پسندوں کے بلکہ اردو کے ممتاز ترین شعرا میں شمار ہونے لگے۔مجروح سلطان پوری کی ترقی پسند غزل کے حوالے سے ڈاکٹر تنویر احمد علوی لکھتے ہیں۔

''ترقی پسند Idialogy کے تحت انھوں نے فنی اقدار کو ترک نہیں کیا، غزل سے ان کی وفاداری میں بھی کوئی تزلزل نہیں آیا لیکن زمانے کے ساتھ ٹکرانے کے لیے ان کا ذہن ہمیشہ آمادہ رہا۔اس میں ان کی جرأت مندی کسی طرح شامل نہیں تھی۔بلکہ ان کے قلم و قدم کی حرکت کے برابر طے شدہ منزل اور روشن مرحلوں کی طرف بڑھتی گئی۔ان کی غزل ان کی زندگی اور ان کے ذہن کے مد و جزر کی نشانی بن کر سامنے آتی ہے۔''[2]

مجروح کی غزل گوئی میں کلاسیکی غزل کا رچاؤ بھی ملتا ہے۔ان کے ابتدائی عشقیہ اشعار میں کلاسیکی شعار صاف نظر آتا ہے۔ان کی ابتدائی شاعری کلاسیکی رنگ میں ڈھلنے کے باجود حال کے تناظر سے اپنا دامن نہیں چھڑاتی۔اچھے شاعر کی خصوصیت ہی یہی ہے کہ اس کی شاعری مختلف رنگوں سے مزین نظر آئے۔مجروح اس آزمائش میں پوری طرح کھرے اُترتے ہیں۔جب وہ کسی تحریک یا رجحان سے وابستہ نہیں ہوئے تھے تب ان کی غزلوں میں الگ سا خمار نظر آتا ہے اور جب انھوں نے ترقی پسند رجحان کو اپنایا تو ان کی شاعری پر ایک انوکھا مزاج حاوی ہوا۔اگر مجروح کی شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جائے تو ان کے یہاں جس چیز کی جھلک عموی طور پر دیکھنے کو ملتی ہے وہ ہے کلاسکیت۔جو چھاؤں بن کر ان کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔دراصل مجروح کا لہجہ، ان کی لفظیات، تشبیہہ و استعارے اور رمز و ایما وغیرہ میں کی گئی مشکل باتیں بھی ہمیں روایت کا پتہ دیتی ہیں اور روایت سے مدغم ہوکر شاعری جس طرف اشارہ کرتی ہے وہ انھیں کلاسکی شاعری کا دلدادہ بنا دیتی ہے اس ضمن میں چند شعر ملاحظہ ہوں۔

گو خاکِ نشیمن پر اب بھی ہیں گریہ کناں اربابِ چمن
جب برق تڑپ کر ٹوٹی تھی اس وقت کا عالم کیا ہوگا

اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہ صبح گاہی بھی

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ، ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

مہ و خورشید بھی ساغر بکف ہو کر اُتر آئے
بوقت بادہ نوشی جب نچوڑی آستیں میں نے

یہ شوقِ کامیاب، یہ تم، یہ فضا، یہ رات
کہہ دو تو آج روک دوں بڑھ کر سحر کو میں

مجروح کی ابتدائی دور کی کئی غزلیں کلاسیکی پن کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔یہ کلاسکی عنصر ہمیں مجروح کے کئی معاصرین مثلاً فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، زبیر رضوی، فراز احمد فراز، خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر وغیرہ کی غزلوں میں بھی نظر آتا ہے۔کلاسیکی غزل کا ایک اہم وصف اس میں پوشیدہ جمالیاتی حسن ہے جو نئی غزل میں مفقود نظر آتا ہے۔جس کی وجہ نئی غزل میں کیے جا رہے تجربے ہیں۔چناں چہ بدلتے وقت کے ساتھ غزل کی شعری ہیئت، اس کے موضوعات، ڈکشن اور لفظیات میں خاطر خواہ تبدیلی سے غزل کی صحت پر بھی بے کم و کاست اثر پڑا ہے۔البتہ آزادی کے بعد چند شعرا ہوئے جنھوں نے اپنی غزل میں کلاسیکی حسن پیدا کیا جن میں مجروح بھی شامل ہیں۔انھوں نے کئی کلاسیکی استعارات و ترکیبات اور لفظیات کا بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیا جو بعد میں ان کی شاعری کا امتیاز بن گیا۔

مجروح کی غزل گوئی میں کلاسیکی غزل کا رچاؤ بھی ملتا ہے۔ان کے ابتدائی عشقیہ اشعار میں کلاسیکی شعار صاف نظر آتا ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری کلاسیکی رنگ۔ میں ڈھلنے کے باجود حال کے تناظرسے اپنا دامن نہیں چھڑاتی۔ اچھے شاعرکی خصوصیت ہی یہی ہے کہ اس کی شاعری مختلف رنگوں سے مزین نظر آئے۔

اردو کے بیشتر معروف ناقدین نے مجروح کی غزل گوئی میں سیاسی رمزیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔بلکہ یوں کہیں کہ بیشتر ترقی پسند شعرا کے یہاں ہمیں سیاسی و سماجی طور پر متاثر ہونے کے واضح نقوش ملتے ہیں۔شاعری میں سیاسی رمزیت کی روایت میر سے ہوتی ہوئی جذبی، فیض اور مجروح تک پہنچ کر کمال کو پہنچتی ہے۔ڈاکٹر

محمد حسن ترقی پسند شعرا کے یہاں سیاسی رمزیت کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''1953 کے آس پاس جذبی کی غزل نے پھر فیض نے پھر مجروح نے آگھیرا اور ان سب کے یہاں تمام آرائش جمال کے باوجود کوشش تھی تو صرف ایک ... غزل کو نئی سیاسی رمزیت دینے کی، نئی وسعت بخشنے کی۔''[3]

چونکہ ترقی پسندوں کی لڑائی ہی سماج کے ٹھیکے داروں کے خلاف تھی جو مظلوم غریبوں پر طرح طرح کا ظلم و جبر کرتے تھے اور ان کے حق میں اُٹھنے والی ہر آواز کو دبانے کی کوشش کرتے تھے۔ نتیجے کے طور پر وہ جیل میں ڈال دیے جاتے۔ اس لیے بعض ترقی پسند شعرا نے شاعری سے تیز دھاری تلوار کا کام لیا اور نتیجتاً ان کے یہاں سیاسی طنز کی شعوری کوششیں شروع ہوئیں جس میں مجروح نے اہم کردار ادا کیا۔ اس حوالے سے چند شعر حاضر خدمت ہیں ملاحظہ ہو ۔

یہ جبر سیاست یہ انسان مظلوم آہیں مجبور فغاں
زخموں کی مہک داغوں کا دھواں مت پوچھ فضائے زنداں میں
ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے
ستم کو سرنگوں ظالم کو رسوا ہم بھی دیکھیں گے
چل اے عزم بغاوت چل تماشا ہم بھی دیکھیں گے
ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ
چاک کیے ہیں ہم نے عزیزو چار گریباں تم سے زیادہ

متذکرہ اشعار مجروح کی غزل گوئی میں سیاسی رمزیت کی بہتر مثال پیش کرتے ہیں جو علامتی بیانیہ اظہار کا خوبصورت پیکر بھی کہے جا سکتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی کتاب 'اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' میں لکھا ہے کہ مجروح کی تمام غزلیں گھوم پھر کر قفس، زنجیر، زنداں اور دار و رسن کے دائرے میں چکر لگاتی ہیں اور ان میں ایک ہی قسم کی کیفیتوں اور جانے پہچانے انداز میں سنی ہوئی آواز سے سابقہ پڑتا ہے، میں کتنی سچائی ہے اس کا اندازہ مجروح کی غزلوں کے مطالعے سے ہو جاتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی یہ کتاب 1972 میں شائع ہوئی تھی اور ظاہر ہے کہ مجروح کا شعری سلسلہ بیسویں صدی کے اخیر تک چلتا رہا۔ بے شک وہ اپنی شاعری میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ کر سکے تاہم اس قلیل عرصے میں مجروح نے جتنی بھی غزلیں لکھیں ان کا رنگِ سخن بھی بالکل منفرد ہے۔ بلکہ ان کی ابتدائی دور کی شاعری کا رنگ رومانی انداز لیا ہوا ہے۔ چونکہ ان تمام غزلوں کا شاعر ایک ہی ہے، اس کا طرزِ اظہار اپنا ہے اور وہ اپنا ایک مخصوص آہنگ رکھتا ہے اس لیے آوازوں میں مشابہت پایا جانا کوئی غیر فطری بات نہیں۔

مجروح کی شاعری کا ایک امتیاز اس میں پنہاں عشقیہ پن ہے۔ اردو شاعری میں عشقیہ و رومانی عناصر ابتدا ہی سے پائے جاتے ہیں۔ بلکہ ابتدائی شعرا کے یہاں عشق و محبت کی کیفیت کچھ زیادہ ہی انتہا کو پہنچتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ اردو شاعری خصوصاً اردو غزل میں حیات و کائنات کے مختلف موضوعات اور مسائل بھی جگہ پانے لگے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے سے قبل مجروح کی غزلوں میں عشق و عاشقی کے غالب اثرات نظر آتے ہیں۔ اس موضوع سے متعلق مجروح کے چند اشعار حاضر ہیں ۔

التفات سمجھوں یا بے رخی کہوں اس کو
رہ گئی خلش بن کر، اس کی کم نگاہی بھی
کہاں وہ شب کہ ترے گیسوؤں کے سائے میں
خیالِ صبح سے ہم آستیں بھگو دیتے
یہ انجامِ محبت دیکھ کر بھی وائے مجبوری
جلے گی شمع بھی محفل میں پروانے بھی آئیں گے
نہ مٹ سکیں گی یہ تنہائیاں مگر اے دوست
جو تو بھی ہو تو طبیعت ذرا بہل جائے

غزل کے شعر کی خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کا ہر شعر معنیاتی سطح پر جداگانہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جو شعر کی وقعت کے علاوہ اس کی وسعت میں بھی اضافہ کرتی ہے۔ مذکورہ اشعار میں عشقیہ رنگ صاف جھلکتا ہے جو مجروح کی رومانی حس کی دلالت کرتے ہیں تاہم اس کے علاوہ بھی ان کی غزلوں میں ایسے کئی اشعار ملتے ہیں جو جہاں عشقیہ اور رومانی و جمالی حظ کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں وہیں ان اشعار کو معنیاتی سطح پر مختلف انداز میں بیان کرنے یا برتنے کی گنجائش بھی موجود ہے۔

موجودہ معاشرے میں انفراد پر زیادہ زور دینے سے اجتماعی قدریں تہذیبی اور معاشرتی سطح پر زوال پذیر ہیں۔ یہ مسائل ہمارے سماج میں پہلے سے موجود تھے لیکن اب ان میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے اردو شعرا نے سماجی و معاشرتی قدروں کی اہمیت کو مختلف اوقات میں اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو انسان دوستی، مساوات، بھائی چارگی، مشترکہ تہذیب، اخوت، امن و امان اور انسانی تہذیب کی بقا کی جڑوں کو مضبوط کرنے اور ان کی حفاظت کا وسیلہ بنایا۔ مجروح کی شاعری میں بھی یہ موضوع اپنی شاہراہیں تلاش کرتا نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں کچھ شعر پیش کرتا ہوں ۔

ہم ہیں کعبہ، ہم ہیں بتخانہ، ہمی ہیں کائنات
ہو سکے تو خود کو بھی اِک بار سجدہ کیجیے
لیے بیٹھا ہے دل اِک عزم بیباکانہ برسوں سے
کہ اس کی راہ میں ہیں کعبہ و بتخانہ برسوں سے
نہ دیکھیں دیر و حرم سوئے رہروانِ حیات
یہ قافلے تو نہ جانے کہاں قیام کریں
غیروں کی خلش، اپنوں کی لگن، سوزِ غمِ جاناں، دردِ وطن
کیا کہیے کہ ہم ہیں کس کس کو سینے سے لگائے زنداں میں

مجروح سلطان پوری کے یہ اشعار دوریوں، نفرتوں، فتنوں، فسادوں اور قباحتوں سے آزادی کی ایک دلنشین آوازیں کہی جا سکتی ہیں۔ ان شعروں میں انسان کے اندر انسانیت جگانے کی ایک پرعزم کوشش ہوئی ہے۔ جو وحدتوں، فرحتوں اور مسرتوں کی حدوں سے سرشار کرتی ہے۔

جس طرح اردو کے دو بڑے قد آور شاعروں میر تقی میر اور مرزا غالب کو اپنی سخن وری اور استادی پر ناز تھا اور جس کے لیے وہ کہنے پر مجبور ہوئے تھے کہ

بقول غالب ۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اور میر فرماتے ہیں ۔

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

بالکل اسی طرح کے احساس اور اعتماد کا اظہار مجروح سلطان پوری کے اس شعر سے ہوتا ہے ۔

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

ایسے مرصع اور مضمون آفریں اشعار جو شائستگی، شگفتگی اور بے ساختگی کی عمدہ مثال پیش کرتے ہیں میر، غالب اور مجروح ہی کہہ سکتے ہیں۔ بے شک یہ تینوں شعرا الگ الگ زمانے میں کہے گئے ہیں تاہم ان میں شاعر کا انفرادی شعور، خود پر اعتماد اور فن میں یکتا ہونے کی دلیل موجود ہے۔

حواشی

1 اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک از خلیل الرحمٰن اعظمی، EBH، علی گڑھ، 2002، ص 154
2 تہذیبِ غزل کا شاعر: مجروح سلطانپوری، مرتب از ڈاکٹر زیبا محمود، EPH، دہلی 2012، ص 31
3 معاصر اردو غزل مسائل: مسائل و میلانات، مرتبہ از پروفیسر قمر رئیس، اردو اکادمی، دہلی، 2014، ص 16

■

Gh Nabi Kumar
Kumar Mohalla, Charari Sharief Budgam-191112 (J&K)
Mob.: 7006738304

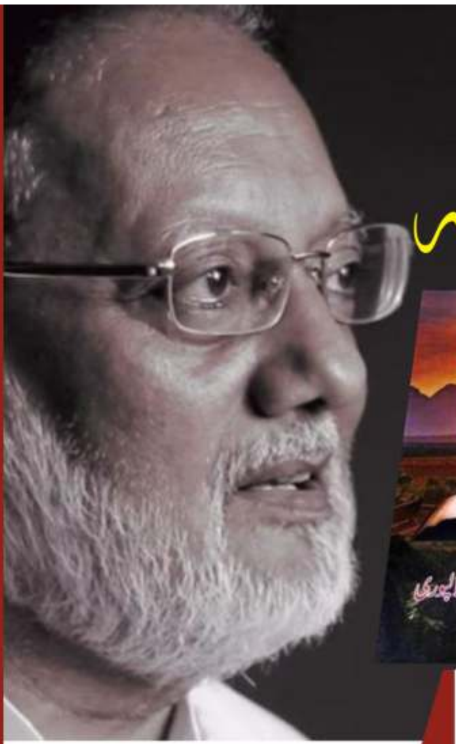

گیتا کا اردو ترجمہ انور جلالپوری کے حوالے سے

سعود عالم

گیتا ہندوستان کی ایک عظیم کتاب ہے۔اس کتاب کے بارے میں لوگوں کی عام رائے ہے کہ: گیتا ایک روحانی صحیفہ ہے۔ گیتا انسانی بھلائی کی عالمی دستاویز ہے۔ گیتا آدمی کوانسان بنانے کی بے انتہا کامیاب کوشش ہے۔ گیتا کو پڑھنے میں لذت ہے، سمجھنے میں سکون ہے اورعمل کرنے میں موکچھ یعنی نجات ہے اوراب دورحاضر میں گیتا شاعری بھی ہے اور دانشوری بھی۔

اس عظیم کتاب میں ارجن اور کرشن کے بنیادی کردار کے علاوہ بہت سارے کردار ہیں جن کا یہاں تفصیلی ذکر ناممکن ہے تاہم اس مقدس کتاب کا ماحصل ارجن کی اضطرابی کیفیت اوران کے استفسار کا بیان ہے۔

بقول شنکرآچاریہ:

بھگوت گیتا 18 باب پر مشتمل ہے جس میں تقریباً 701 شلوک مندرج ہیں۔

یہ کتاب پہلی بار 1809 میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کو ہند وبیرون ہند متعدد اعزازات سے نوازا گیا۔ چارلس وکنس (Charles Wikins) جو کہ Asistic Society کے اولین بنیاد گزاروں میں سے ہیں،انھوں نے 1885 میں اس کتاب کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا اور اسے لندن سے شائع کیا۔ شیلگل (Schlegel) نے 1823 میں اس کتاب کا لاطینی سے ہندی (دیوناگری رسم الخط) میں ترجمہ کیا۔ اس کا ایک ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ملتا ہے جس کے مترجم N.I.Novikov ہیں۔ جرمنی زبان میں اس کے ایک سے زائد ترجمے کا ہمیں پتہ چلتا ہے۔ ان میں C.R.S.Priper کا 1834 کا ترجمہ اور Lorinsor کا

گیتا ہندوستان کی ایک عظیم کتاب ہے۔اس کتاب کے بارے میں لوگوں کی عام رائے ہے کہ :گیتا ایک روحانی صحیفہ ہے۔گیتا انسانی بھلائی کی عالمی دستاویز ہے۔گیتا آدمی کو انسان بنانے کی بے انتہا کامیاب کوشش ہے۔گیتا کو پڑھنے میں لذت ہے ، سمجھنے میں سکون ہے اور عمل کرنے میں موکچھ یعنی نجات ہے اوراب دورحاضر میں گیتا شاعری بھی ہے اور دانشوری بھی۔

1869 کا ترجمہ کافی مشہور ومقبول ہے۔اس کے علاوہ بھی بہت سارے انگریزی ترجمے جابجا نظرآتے ہیں۔

فرانسیسی، جرمنی، انگریزی، ہندی کے علاوہ تقریباً دنیا کی تمام زبانوں میں اس کتاب کے ترجمے کیے جاچکے ہیں مزید برآں ہندوستان کی اکثر علاقائی زبانوں میں اس کتاب کے ترجمے منظرعام پرآچکے ہیں۔ان میں بالخصوص ہندی، اردو، فارسی اورعربی ایسی زبانیں ہیں جن میں سریمد بھگوت گیتا کے اولین نمونے ترجمے کی شکل میں ہمیں نظرآتے ہیں۔جس کی ایک لمبی فہرست ہے۔ذیل میں اُس کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جارہا ہے۔

1 کنہیالال الاخ وہاری (مترجم)،منثورترجمہ بعنوان 'گیان پرکاش' مطبوعہ گیانی پریس، اکبرآباد، آگرہ، اترپردیش 1863

2 منشی شیام سندیری لال بنارسی (مترجم)،مطبوعہ، نول کشور، اترپردیش، 1884

3 منشی دیوی پرساد (مترجم)،مطبوعہ، رام پریس، میرٹھ، اترپردیش، 1913

4 رام ساہے (مترجم)، مطبوعہ، نول کشور، لکھنؤ، اترپردیش، 1913

5 قاضی محمد نیر صدیقی (مترجم)، بعنوان 'اسرار معرفت' مطبوعہ سیوک سیام پریس، لاہور، 1915

6 پنڈت جناکی ناتھ مدن دہلوی (مترجم)، بعنوان 'فلسفۂ الوہیات' (منثور ترجمہ) پانچواں ایڈیشن، مطبوعہ، رام نرائن پریس، متھرا، یوپی، 1922

7 منشی جگن ناتھ پرساد عارف (مترجم)، بعنوان 'سرچشمۂ عرفان' مطبوعہ، میرٹھ، اترپردیش، 1925

8 ''بھگوت گیتا اورلوک مانیہ بال گنگادھر تلک کی رہسیہ گیتا' شانتی نارائن (مترجم)،پہلی کتاب میں 'گیتا پڑھنے کے آداب' سے روشناس کرایا گیا ہے۔جبکہ دوسری کتاب میں بھگوت گیتا کے اشلوک کا آسان اردو میں ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب امرتھ پریس، لاہور سے 1925 میں شائع ہوئی ہے۔

9 'سریمد بھگوت گیتا' مترجم، منشی کیدار ناتھ بعنوان 'راہ مغفرت' مطبوعہ، مہتاب پریس، دہلی 1926

10 بابو بھگوان داس بھارگو (مترجم)، مطبوعہ، نول کشور، لکھنؤ، اترپردیش، 1927

11 چودھری روشن لال (مترجم)،بعنوان 'گیتا امرت' معروف بہ 'اکسیرروح' (منظوم)

12 پنڈت یوگی راج نظر سُہانوی (مترجم)، بعنوان 'کلام

ربانی' (منظوم) مطبوعہ، محبوب المطابع، برقی پریس، جامع مسجد، دہلی

13 پنڈت روپ نرائن پانڈے (مترجم)، بعنوان 'سریمد بھگوت گیتا' مطبوعہ، لکھنؤ، اترپردیش، 1941

14 بنکٹ پرساد خلیق (مترجم)، بعنوان 'مخزن گیان اور آنند پرکاش'، ناشر، فرزند نرسنگھ راج کپور، مطبوعہ، اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد، دکن (تلنگانہ) 1945

15 بسویشور پرساد منور لکھنوی (مترجم)، بعنوان 'نسیم عرفان' (منظوم)، مطبوعہ، آدرش کتاب گھر، دہلی 1955

16 پنڈت لکشمی نارائن مشرا (مترجم)، منثور ترجمہ، مطبوعہ، انجمن ترقی اردو (ہند)، حیدرآباد، (تلنگانہ)

17 ستیہ پرکاش سری واستو (مترجم)، بعنوان 'گیتا ہندوستانی نظم میں' (منظوم)، ناشر، نوتم پرکاشن، شنکر بھون، شہدرا، دہلی، 1964

18 حسن الدین احمد (مترجم) بعنوان 'نغمۂ الوہیات' (منظوم)، ناشر، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی۔ 1975 (الخلاصہ: مترجم: ریٹائرڈ I.A.S. آفیسر ہیں۔)

19 چرن داس ریڈی (مترجم)، ناشر، شری بھگوتی آشرم، عادل آباد (تلنگانہ) 1983

20 سروانندکول پریمی (مترجم) (منظوم)، دہلی، 1992

21 STV.Appalachari (مترجم)، بعنوان 'نغمۂ الٰہی' (منثور) مطبوعہ، گیتا پریس، گورکھپور، اترپردیش، 2003 (Appalachari حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔

22 عبدالعزیز خالد (مترجم)، مطبوعہ، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی

23 خلیفہ عبدالحکیم (مترجم)، ترجمۂ گیتا (منظوم)، مطبوعہ، اتحاد پریس، لاہور

24 سلطان احمد صدیقی گورکھپوری (مترجم)، بعنوان 'گیتا منظوم' ناشر، ہیرالال بھٹناگر

25 مہاراشی شیوبھرت لال (مترجم)، سریمد بھگوت گیتا Vol.11 مطبوعہ، سلیمی برقی پریس، الہ آباد، اترپردیش

26 پنڈت بربھودیال عاشق لکھنوی (مترجم)، بعنوان 'غذائے روح' (منظوم)

27 سورج نرائن مہر دہلوی (مترجم)، بعنوان 'فلسفہ گیتا' (منظوم)

28 شان الحق حقی (مترجم)، سریمد بھگوت گیتا (منظوم) ناشر، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، 1994 / فاضل سنس، (pvt.) اردو بازار، کراچی، 2006

29 محمد اجمل خاں (مترجم)، بعنوان 'نغمۂ خداوندی' ناشر، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، یوپی، 1959، (پہلا ایڈیشن، ادارہ نوامیزالٰہیہ، الٰہ آباد، اترپردیش سے 1935 میں شائع ہوا)

30 خان بہادر مرزا ظفر علی خان اثر (مترجم)، بعنوان 'نغمۂ جاوید' (منظوم) ناشر، راج محل پبلشرز، جموں (جموں کشمیر)

31 خواجہ دل محمد (مترجم)، بعنوان 'دل کی گیتا' (منظوم) ناشر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2004 (پہلا ایڈیشن، آزاد بک ڈپو، امرتسر (پنجاب) سے شائع ہوا تھا)

32 انور جلال پوری (مترجم)، بعنوان 'اردو شاعری میں گیتا' (منظوم) عرشیہ پبلکشن، 2013

اردو میں سریمد بھگوت گیتا کے اَن گنت ترجمے ملتے ہیں جن کی گنتی سو سے تجاوز کر جاتی ہے۔ بھگوت گیتا کے ایک معروف مترجم انور جلال پوری کے حوالے سے غلام نبی خیال اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

''انھوں نے گیتا کے 80 تراجم دیکھے ہیں، جن میں ساٹھ نثر میں اور باقی منظوم ہیں۔ انھوں نے سات سو ایک شلوک، اٹھارہ ابواب سے ایک ہزار سات سو اکسٹھ اشعار میں ڈھالے ہیں۔''

(بحوالہ، بھگوت گیتا کے اردو تراجم، رسالہ آجکل، مئی 2016)

حالیہ دور کے مترجم انور جلالپوری کے علاوہ جن لوگوں نے اس فن میں طبع آزمائی کی ہے ان میں مشہور ومقبول مترجم خواجہ دل محمد، خلیفہ عبدالحکیم، منور لکھنوی، حسن الدین احمد، شان الحق حقی، محمد اجمل خاں، منیر بخش عالم، وینکٹ اپالا چاری، اجے مالویہ اور ان کے علاوہ سریمد بھگود گیتا کے مترجمین کی ایک طویل فہرست ہے۔ یہاں تفصیل میں نہ جا کر صرف انور جلال پوری کے حوالے سے بات کی جائے گی۔

پدم شری اور یش بھارتیہ انعام یافتہ شاعر انور جلال پوری اترپردیش کے ایک مردم خیز ضلع امبیڈکر نگر کے ایک چھوٹے سے شہر جلال پور میں 6 جولائی 1947 میں پیدا ہوئے۔ انور جلالپوری پیشے سے انگریزی کے استاد تھے لیکن انھیں شہرت ومقبولیت ایک شاعر اور ایک اچھے ناظم کی حیثیت سے ملی۔ خدائے واحد نے انور جلالپوری کی زبان میں ایسی تاثیر دی تھی کہ سامعین ان کی مسحور کن آواز سن کر دم بخود رہ جاتے اور انھیں داد سے نوازنے پر مجبور ہونا پڑتا۔ اس طرح انور جلالپوری نے اپنی نظامت اور منفرد آواز کی بدولت ہر خاص وعام میں اپنی جگہ بنائی۔ یہی تھی انور جلالپوری کی خاص پہچان ہے۔

انور جلالپوری نے شاعری اور نظامت کے علاوہ فن ترجمہ نگاری میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ انھوں نے سریمد گیتا کا منظوم ترجمہ 'اردو شاعری میں گیتا' (نغمۂ علم وعمل) کے عنوان سے کیا ہے۔

انور جلالپوری نے بھگوت گیتا کے ترجمے کے لیے جس بحر کا انتخاب کیا وہ مثنوی کے لیے سب سے موزوں اور مناسب ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ، نظامی کا سکندرنامہ، سراج کی بوستان خیال اور میرحسن کی سحرالبیان یہ تمام کلاسیکی مثنویاں اسی بحر میں لکھی گئی ہیں۔ وہ بحر، بحر متقارب مثمن/مقصور ومحذوف (فعولن فعولن فعولن فعل) ہے۔

انور جلالپوری کے ترجمے کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ہر باب کے شروع میں اس باب میں مذکور واقعے کی تخلیص آسان اور سرل زبان میں پیش کر دی ہے جس سے عام قاری کے لیے شاعری کی زبان مزید آسان ہوگئی ہے۔ بھگوت گیتا 18 باب پر مشتمل ہے جس میں تقریباً 701 آیتیں (اشلوک) مندرج ہیں۔ انور جلالپوری نے اسے 1761 اشعار میں منتقل کیا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت ان کے سامنے بہت ساری دشواریاں پیش آئیں جس کا ذکر آگے کہیں آئے گا تاہم یہاں یہ بتانا غیر مناسب نہ ہوگا کہ انور جلالپوری نے بعض اشلوک کا ترجمہ ایک شعر میں ہی کر دیا ہے اور بعض میں انھیں ایک سے زائد اشعار کا سہارا لینا پڑا ہے۔ مثال کے طور پر باب دوم میں شلوک نمبر 98 کو دیکھا جا سکتا ہے، جس میں شاعر ومترجم نے ایک اشلوک کا ترجمہ دو بیت میں پیش کیا ہے۔

کہ قبضے میں ہیں جس کے سارے حواس
بُرائی پھٹکتی نہیں جس کے پاس
وہی معتدل، عقل والا وہی
زمانے میں ارفع و اعلیٰ وہی

اسی طرح اسی باب سے ایک دوسری مثال شلوک نمبر 35 کو دیکھا جا سکتا ہے۔ شاعر نے یہاں بھی ایک شعر کی بجائے دو شعر میں ترجمہ کیا ہے۔

کہا جس کے دل میں نہیں خواہشیں
اسی پر تو رحمت کی ہیں بارشیں
کہ دل جس کا خوش، روح جس کی ہے خوش
وہی تو ہے دنیا میں بہتر پُرش

اس طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انور جلالپوری نے ترجمہ کرتے وقت قدیم وجدید دونوں روایت کی پاسداری کو برقرار رکھا ہے۔

انور جلالپوری نے اپنے ایک مضمون میں سریمد بھگوت گیتا سے اپنی ذاتی انسیت اور ذہنی لگاؤ کا تفصیل

سے ذکر کیا ہے۔ موصوف نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے یہ ترجمہ ہندی اور انگریزی کی مدد سے کیا ہے، نہ کہ سنسکرت سے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بنیادی طور پر سنسکرت زبان سے واقفیت میری نہ کے برابر ہے پھر بھی میں نے ہندی اور انگریزی کے ذریعے بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کی۔'' (ص:26)

دوران ترجمہ مترجم نے ہندی، اردو اور انگریزی کے دستیاب نسخے کے استفادہ شدہ نسخے کی ایک فہرست بھی دی ہے۔ جس کی تفصیل میں نہ جا کر میں یہاں صرف شاعر کی ان مضطرب و مضمحل کیفیت کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کروں گا جس سے ایک مترجم بالخصوص شاعر گزرتا ہے۔ ترجمہ خواہ نثر کا ہو یا نظم کا، دونوں کی اپنی کچھ بنیادی غرض وغایت ہوتی ہے، اس سے وہ بچ نہیں سکتا۔ منظوم ترجمہ میں بحر کی پابندی، ردیف کا اہتمام اور قوافی کا تتبع بسا اوقات ترجمہ میں نقص بھی پیدا کر دیتا ہے۔ خیالات من وعن ترسیل کی راہ میں حائل ہوجاتے ہیں۔ اس طرح منظوم ترجمہ اطناب کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس لیے منظوم ترجمہ علما و ناقدین کے نزدیک ایک دشوار عمل ہے۔ کیونکہ اس میں دریا کو نہیں بلکہ سمندر کو کوزہ میں بند کیا جاتا ہے۔ شعر کے ترجمے میں ایک مترجم کو کئی بنیادی باتوں پر دھیان دینا پڑتا ہے۔ مترجم کے لیے مصنف کے فلسفہ، طرز احساس، علمی لیاقت، نفسیاتی کیفیت اور اس کے فنی طریقۂ کار سے واقفیت ضروری ہے۔ مصنف کے عہد اور حالات سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ اسی طرح اُس زبان کی تاریخ سے بھی واقفیت ضروری ہے جس زبان (Source Language) سے ترجمہ کرنا اور جس زبان (Target Language) میں ترجمہ کرنا ہے۔ زبان کے قواعد، ساخت اور صوتیات سے بھی واقفیت ہونی چاہیے۔ مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے اس کے موضوع پر حاوی ہو، اس کی اصطلاحات، محاورے اور ضرب الامثال سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔ انھیں کیفیات کا اظہار شاعر و مترجم انور جلالپوری نے اپنے ترجمہ سے متعلق کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''سریمد بھگوت گیتا کو سمجھنے اور اسے اردو شاعری کا لباس پہنانے میں مجھے بڑی ذہنی محنت اور تحقیقی صلاحیت خرچ کرنا پڑی۔ مجھے شلوک کا ترجمہ اردو، ہندی اور انگریزی میں پڑھنا پڑا، پھر تشریح وتفصیل سے واقفیت حاصل کرنی پڑی، پھر تشریح کا خلاصہ دماغ میں محفوظ رکھنا پڑا اور بعد میں اس خلاصے کو شعری پیکر میں ڈھالنا پڑا۔'' (ص: 28-27)

متذکرہ بالا ترجمے کی دشواریوں اور آسانیوں کے پیچ وخم کے بیچ انور جلالپوری نے اپنی جگہ کس حیثیت سے بنائی ہے۔ اس کا اعتراف پروفیسر رمیش دیکشت نے اپنے ایک وقیع مضمون 'ساجھی سانسکرتک وراثت کا شاعر' میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''گیتا سنسکرت کی سرویشٹھم کاویہ رچناؤ میں ایک ہے۔ بھلے ہی انور صاحب نے اردو شاعری میں گیتا کا انوواد اس کے ہندی انوادوں کے آدھار پر کیا ہے، پرنتو انھوں نے سنسکرت کے مؤل پاٹھک کی آتما کو بچائے رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔''

وہ ایک دوسری جگہ انور جلالپوری کی زبان، اسلوب اور مرصع سازی پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

جناب انور جلالپوری کا بھاشا پر غضب کا نینترن ہے۔ ان کی بھاشا کی روانی گیتا کے شلوکوں کے معنوں کی پرت در پرت کھولتی چلی جاتی ہے۔ وہ کئی بار کسی ایک شلوک کو کئی اشعار میں سپشٹ کرتے ہیں تاکہ پاٹھک کے لیے اشلوک کا ارتھ سمجھنے میں زیادہ آسانی ہو کیوں کہ اس ترجمہ کا اُدیشیہ ہر شلوک کے مرم کو پاٹھک تک پہنچانا ہے، صرف اوپری ارتھ بھر ہی نہیں۔'' (ص: 19)

ہنومان پرشاد عاجز ماتوی بھی انور جلالپوری کے ترجمہ کی خوش اسلوبی اور انداز بیان سے متعلق کچھ یوں گویا ہیں:

''موصوف نے نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم زبان میں منظوم ترجمہ کر کے اپنی دور اندیشی اور بالغ النظری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ کم اردو جاننے والے اور ہندی داں طبقہ بھی اسے بآسانی پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔''

(بحوالہ، حرف چند، ہنومان پرشاد عاجز ماتوی، ص:25)

بھگوت گیتا ہمارے معاشرے کی ایک ایسی عظیم کتاب تصور کی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان جب چہار جانب سے گھرا ہوتا ہے تو اس کو صرف ایک راستہ نظر آتا ہے اور وہ راستہ مذہب ہے۔ انسان اپنی زندگی میں چاہے جتنا بھی گناہ کا مرتکب ہوجائے باوجود اس کے ان کے دلوں میں ایک مذہبی گوشہ ضرور مضمر و مستتر رہتا ہے۔ متذکرہ بالا باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس عظیم کتاب سے متعلق چند اکابرین کے کلمات اور ان کے خیالات سے آپ کو روشناس کرانے کی کوشش کریں گے اور یہ بھی باور کرانے کی کوشش کریں گے کہ اس کتاب کے سلسلے میں ان کی رائے کیا تھیں۔ شیخ عبدالغنی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"The Bagavad Gita 'The song of God' is the symbol of indian culture, tradition and religion. The holy book is well known in the world and it has been translated in almost all the imagaes of the world."

(Bagavad-Gita in Urdu paratnakirti, Vol,1, Issue-4.2014. ISSN-2322-0694)

سوامی تپیانند گیتا کے فلسفے کی وضاحت کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اس صحیفے کی زبردست پذیرائی کی وجہ یہ ہے کہ اس میں زندگی کے عملی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے جن پر قابو پانے کے لیے انسان کا یہ فریضہ بھی شامل ہے کہ بنی آدم ایک نامکمل سماجی نظام میں اپنا کام سرانجام دے تاکہ اسے تکمیل کا اعلا مرتبہ حاصل ہوسکے۔ گیتا اسی مسئلے سے شروع ہوکر اسی کے حل پر اختتام پذیر ہوتی ہے اور اس میں عقیدتی فلسفے کی پُر اثر ترسیل موجود ہے۔''

مہاتما گاندھی کا بھگوت گیتا سے دلی لگاؤ تھا اور وہ اسے عقیدت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جب بھی کسی مصیبت سے دوچار ہوتے سب سے پہلے بھگوت گیتا کی طرف رجوع کرتے اور اس کا سہارا لیتے۔ گاندھی جی ایک جگہ اپنے دلی جذبات کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''جب بھی شکوک وشبہات مجھے گھیر لیتے ہیں۔ جب ناامیدی میرے چہرے بشرے سے جھلکتی ہے اور مجھے افق پر امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی، میں بھگوت گیتا کا مطالعہ کرتا ہوں اور اسے سکون قلب عطا کرنے والی ایک راحت بخش تخلیق پاتا ہوں۔ میں اس عالم افسردگی میں فوراً ہی مسکرانے لگتا ہوں۔ میرے خیال میں جو بھگوت گیتا کا سہارا لیتے ہیں انھیں ہر دن اس سے حیات بخش سرور اور نئے معنے حاصل ہوں گے۔''

اسی طرح سوامی وویکانند کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سوامی جی 1888 سے 1893 تک کے دوران جب پورے ہندوستان کے دورے میں تھے، تب ان کے پاس صرف دو کتابیں تھیں، ایک The Imitation of Christ اور دوسری بھگوت گیتا۔

اگرچہ انور جلالپوری صاحب آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں تاہم وہ اپنے کارنامے کی بدولت ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ و تابندہ رہے گے۔

■

Dr.Saud Alam
B.114, Yadav Building
Okhla Main Market Jamia Nagar,
New Delhi- 110025
M0b:8076495936

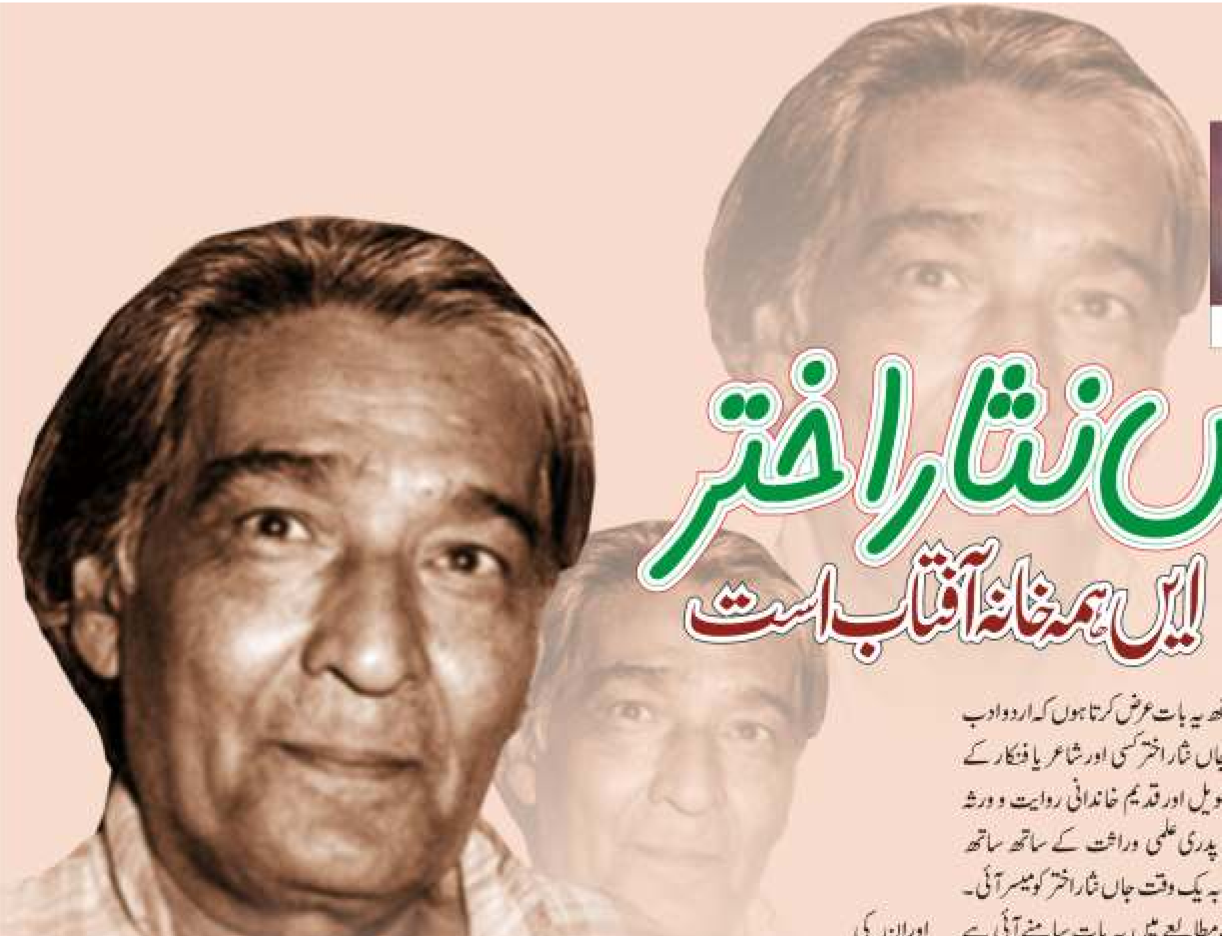

وسیم فرحت

جاں نثار اختر
ایں ہمہ خانہ آفتاب است

میں بہت ذمے داری کے ساتھ یہ بات عرض کرتا ہوں کہ اردو ادب کی تاریخ میں بجز جاں نثار اختر کسی اور شاعر یا فنکار کے حصے میں اس قدر طویل اور قدیم خاندانی روایت و ورثہ نہیں آیا۔ بلکہ خود پدری علمی وراثت کے ساتھ ساتھ سسرالی وارثت بھی بہ یک وقت جاں نثار اختر کو میسر آئی۔ انسانی نفسیات کے مطالعے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ کسی بھی انسان کی سیرت اور شخصیت کی تشکیل میں اس کا خاندان اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہم اور آگے بڑھیں تو پائیں گے کہ انسانی ذہنی ارتقا میں بھی خاندانی پس منظر کا خاصا دخل ہوتا ہے۔ جاں نثار اختر وہ خوش بخت فنکار ہیں جنھیں ان کی پیدائش سے ایک صدی قبل کا مکمل اردو و فارسی ادب خاندانی ورثے کے طور پر ملا۔ بات صرف یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ خود اپنی زندگی میں بھی شریکِ حیات صفیہ اختر کے وسیلے سے مجاز لکھنوی اور ان سے بھی بہت پہلے یہ سلسلہ صوفی شاعر عثمان ہارونی سے جاملتا ہے۔

یہاں فی الوقت جاں نثار اختر کے علمی خانوادے پر مجھے گفتگو مقصود ہے۔ خیرآباد کا نام سنتے ہی ذہن ریاض خیرآبادی، مضطر خیرآبادی، وسیم خیرآبادی و دیگر کی طرف جاتا ہے۔ یوپی کے ضلع سیتاپور کی ایک مردم خیز و ادب خیز بستی خیرآباد ہے۔ یہاں کی مٹی سے محض گیہوں ہی نہیں اگتے بلکہ دنیا شاہد ہے کہ اس مٹی نے لعل و گہر بھی بخشے ہیں۔ ان ہی جواہرات میں ایک نام جاں نثار اختر بھی ہے جن پر میر انیس کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

جاں نثار صاحب کا خانوادہ 'ایں ہمہ خانہ آفتاب است' ہے۔ علم و ادب اور تہذیبوں کی نگہداشت اس گھرانے کا وطیرہ رہا۔ ذیل میں جاں نثار اختر کے اہل علم و فضل بزرگوں اوران کی اولادوں کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں۔

میر سید تفضل حسین خان

میر تفضل حسین، جاں نثار اختر کے جدامجد تھے، ٹونک ریاست کی سفیری آپ کے ذمے تھی۔ میرزا غالب کے بے حد قریبی دوست رہے۔ غالب دہلی کے ساتھ اس دربار سے بھی وابستہ تھے۔ جیسا کہ اس دور کا مزاج تھا، دربار سے منسلک ہر شاعر قصیدہ خوانی سے انعام و اکرام کا متمنی رہا کرتا تھا، لہٰذا غالب بھی اس فیض سے بہرہ ور ہونا چاہتے تھے، بہ ایں ہمہ بقر عید (6 اکتوبر 1851 بروز پیر) کے موقعے پر میرزا غالب نے والیِ ٹونک نواب وزیر الدولہ بہادر (1834-64) کی شان میں قصیدہ لکھا جو میر تفضل حسین کی معرفت والیِ ٹونک تک پہنچایا گیا۔ میر تفضل حسین اور غالب کے درمیان قریبی تعلقات رہے۔ مذکورہ قصیدے کے طفیل جو انعام غالب کو میسر آیا اس کا ذکر غالب نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔ تاہم محترمہ کشور سلطان صاحبہ کے اس بیان سے میں اتفاق نہیں رکھتا کہ 'انہی (میر تفضل حسین) کے توسط سے میرزا غالب کا دربار ٹونک سے تعلق استوار ہوا' کیوں کہ مالک رام کے جس مضمون کا حوالہ کشور صاحبہ نے اپنی کتاب 'جاں نثار اختر۔ حیات وفن' میں درج کیا ہے اسی مضمون میں مالک رام فرماتے ہیں کہ "طالع یار خان، غالب کے گہرے دوست تھے، اور میرا خیال ہے کہ دربار ٹونک اور غالب کے درمیان جو تعلق قائم ہوا، اس میں بھی ان کا کسی نہ کسی پہلو سے ضرور ہاتھ رہا ہوگا۔"

(مضمون 'ذکرِ غالب' مشمولہ رسالہ آجکل دہلی، شمارہ بابت فروری 1963، ص 11)

میر تفضل حسین کے انتقال پر غالب نے شدید رنج کا اظہار کیا ہے۔ میرزا تفتہ کے نام اپنے خط مورخہ 23

> **جاں نثار اختر وہ خوش بخت فنکار ہیں جنھیں ان کی پیدائش سے ایک صدی قبل کا مکمل اردو و فارسی ادب خاندانی ورثے کے طور پر ملا۔ بات صرف یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ خود اپنی زندگی میں بھی شریک حیات صفیہ اختر کے وسیلے سے مجاز لکھنوی اور ان سے بھی بہت پہلے یہ سلسلہ صوفی شاعر عثمان ہارونی سے جا ملتا ہے۔**

فروری 1854 میں غالب رقمطراز ہیں:

''ہائے ہائے میر تفضل حسین خاں ہائے ہائے۔ رفتی و مراخبر نہ کردی۔ بر بیکسم نظر نہ کردی۔ یہاں یہ سنا گیا ہے کہ میر احمد حسین، بڑا بیٹا ان کا، ان کے کام پر مقرر ہوا اور میر ارشاد حسین بدستور نائب رہے۔''

(اردوئے معلی، مطبوعہ اکمل المطابع، دہلی، مطبوعہ ص 59)

حافظ سید احمد حسین رسوا

میر سید تفضل حسین کے فرزند حافظ سید احمد حسین شاعری کے علاوہ قران کے حافظ تھے۔ فارسی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ فضل حق خیر آبادی کے داماد تھے۔ فضل حق خیر آبادی کی شہرت عالم گیر ہے۔ آزادی کی لڑائی میں کالے پانی کی سزا، غالب کے دیوان کی تدوین وغیرہ امور فضل حق سے منسوب ہیں۔ میر سید تفضل حسین کے انتقال کے بعد حافظ سید احمد رسوا دربار ٹونک سے وابستہ ہوگئے۔ ان کی اہلیہ حرماں اعلی پایے کی شاعرہ تھیں۔

حرماں

سید النسا حرماں، مولانا فضل حق خیر آبادی کی بیٹی اور حافظ سید احمد حسین کی اہلیہ تھیں۔ شعر کہنے کی خداداد صلاحیتیں رکھتی تھیں۔ ان کے دونوں بیٹے بسمل خیر آبادی اور مضطر خیر آبادی، اپنے وقت کے بے حد مشہور فن کار ثابت ہوئے۔ ان کا مندرجہ ذیل شعر بہت مشہور ہے۔

درد دل، درد جگر، کاوش دل، کاہش جاں
اتنے آزار ہیں اور ایک کلیجہ میرا

حافظ سید محمد حسین بسمل

مولانا فضل حق کے نواسے، حافظ سید احمد حسین رسوا اور حرماں کے بڑے فرزند، حافظ سید محمد حسین والی ٹونک امین الدولہ نواب محمد ابراہیم علی خان خلیل کے میر منشی تھے۔ اردو ادب میں بسمل خیر آبادی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ 'ملک الشعراء'، 'لسان الملک' کے خطابات سے نوازے گئے۔ میرزا غالب کے شاگرد تھے۔ بسمل 1857 سے چند سال قبل خیر آباد میں پیدا ہوئے۔ 1857 کا غدر اور علامہ فضل حق کے خاندان کی عملی شرکت۔ لہٰذا جنگِ آزادی کی پاداش میں ان کی تمام جائداد حکومت نے ضبط کر لی۔ یہ سچائی بھی اہل وطن کے نزدیک سورج سی عیاں ہے کہ علامہ فضل حق کو دی گئی کالے پانی کی سزا علامہ کے نزدیک ملک کی آزادی کا اولین خراج رہا۔ بسمل اپنی سوتیلی ماں کے پاس دہلی چلے گئے۔ انھوں نے بسمل کو تحصیل علم کے لیے میرزا غالب کے سپرد کر دیا۔ اس کی تفصیل امجد سندیلوی نے اپنی کتاب 'احوال غالب' میں درج کی ہے۔ غالب کی وفات کے بعد بسمل امیر مینائی سے اصلاح لینے لگے۔ بسمل لکھتے ہیں کہ 'میں ایک فقیر کا پوتا، ایک فقیر کا بیٹا اور ایک فقیر کا بھائی ہوں۔' (ماخوذ از مضمون 'مضطر خیر آبادی' از جاں نثار اختر مشمولہ کتاب 'شاہکار' مرتبہ وسیم فرحت مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2020 ص 128) خواجہ معین الدین چشتی سے بسمل کو گہری عقیدت تھی لہٰذا آخری عمر میں ملازمت ترک کر کے آپ نے اجمیر شریف میں سکونت اختیار کی۔ 1900 میں اجمیر ہی میں آپ کا انتقال ہوا اور وہیں دفن بھی ہوئے۔ انہی کے چھوٹے بھائی سید افتخار حسین رضوی بہ متخلص مضطر خیر آبادی، جاں نثار اختر کے والد ہیں۔

سید محمد افتخار حسین رضوی مضطر

افتخار الشعراء، اعتبار الملک، اقتدار جنگ، خان بہادر سید محمد افتخار حسین رضوی مضطر خیر آبادی 1875 میں خیر آباد میں پیدا ہوئے۔ مولانا فضل حق کے نواسے، حافظ سید احمد حسین رسوا اور حرماں کے چھوٹے فرزند اور امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ نواب ٹونک کی ماتحتی میں اودے پور کے وکیل دربار عہدے پر فائز تھے۔ بسمل خیر آبادی کی وفات کے بعد والیِ ٹونک کے مشیرِ سخن ہوئے۔ ٹونک کے سول جج کا عہدہ بھی سنبھالا۔ 1904 میں ریاستِ گوالیار سے وابستہ ہوئے۔ گوالیار دربار کے وکیل، پھر گوالیار کے ضلعی جج اور بعد میں شیو پوری کے جج کی ذمے داریاں نبھائیں۔ عدالتِ دیوانی و فوجداری میں جج کے عہدے پر کام کرتے ہوئے اسی رعایت سے مضطر نے خوب شعر کہا ہے۔

نہ گیا کارگزاری میں بھی وحشت کا خیال
جس عدالت کا میں ناظم ہوں وہ دیوانی ہے

مضطر کی والدہ سید النسا حرماں دانشوران کے خاندان سے تھیں اور کمال کا علم رکھتی تھی۔ فنِ شعر اور عروض پر حرماں کو بلا کی قدرت حاصل تھی۔ مضطر نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے مکمل کی بلکہ ابتدائے سخن کے زمانے میں اصلاح بھی والدہ سے ہی لی۔ بعد کو اپنے بڑے بھائی اور شاگردِ غالب و امیر محمد حسین بسمل سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ ہر چند کہ دونوں بھائیوں کی افتادِ طبع میں بڑا فرق رہا۔ بسمل عارفانہ اور سوز و گداز والی شاعری کے قائل تھے اور مضطر معاملہ بندی کے گرفتار۔ لہٰذا یہ سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا اور پھر مضطر بھی اپنے بھائی کی طرز پر امیر مینائی سے اصلاح لینے لگے۔ مضطر کی طبیعت ہمیشہ رواں دواں رہتی تھی۔ بلکہ مکمل اردو شاعری میں دو واقعہ میں نے کہیں اور نہیں دیکھے۔ اول مضطر نے اپنی عدالت کے کئی مقدمات کے فیصلے منظوم کر ڈالے۔ دوم سیماب اکبر آبادی نے بھی 'شاعر' کا ایک مکمل شمارہ مع اشتہارات منظوم کر دیا تھا۔ بدیہہ گوئی میں مضطر کا یہ عالم تھا کہ جاں نثار اختر نے اپنے مضمون 'مضطر خیر آبادی' میں ایک واقعہ درج کیا ہے۔ 'ایک مرتبہ دربار میں مشاعرہ تھا۔ مضطر حسبِ معمول دربار میں حاضر ہوئے۔ مشاعرہ کا خیال نہ تھا لہٰذا غزل نہ لا سکے تھے۔ چونکہ نواب کے استاد تھے لہٰذا اصرار ہوا کہ پہلی غزل استاد پڑھیں گے۔ مضطر آداب بجا لاتے ہوئے کھڑے ہوئے اور جیب سے ایک کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور غزل پڑھنی شروع کر دی۔ ہر شعر پر داد و تحسین ملتی رہی۔ نواب صاحب نے غزل طلب کی، لہٰذا وہی سادہ کاغذ پیش کر دیا اور واقعہ سنایا کہ میں نے مکمل غزل فی البدیہہ کہہ ڈالی۔ اس پر نواب بہت خوش ہوئے۔''

(ماخوذ از مضمون 'مضطر خیر آبادی' از جاں نثار اختر مشمولہ کتاب 'شاہکار' مرتبہ وسیم فرحت بحوالہ بالا، ص 129)

جاں نثار اختر نے متذکرہ مضمون میں مضطر کے متعلق کئی ایک دلچسپ واقعات درج کیے ہیں جن کا یہاں محل نہیں۔ ابھی چند سال قبل جاوید اختر صاحب نے مضطر کا کلیات بہ عنوان 'خرمن' شائع کیا ہے۔ اردو کے عوامی بول چال میں بروئے کار لا جانے والے جتنے اشعار مضطر کے ہیں شاید ہی کسی اور شاعر کے حصے میں یہ بات آئی ہو۔ مضطر نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ بالخصوص ہندی زبان پر انھیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ اور اسی کی خوبو جاں نثار اختر میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ 31 مارچ 1937 کو انتقال کیا۔

نشتر خیر آبادی

مضطر کی پہلی بیوی سے دو بیٹے تھے جن میں سید اعتبار حسین برتر اور سید یادگار حسین نشتر شامل ہیں۔ برتر کے متعلق بہ تلاشِ بسیار مجھے معلومات نہ مل سکی۔ جاوید اختر صاحب کی اطلاعات کے مطابق نشتر ایک کوآپریٹیو بینک میں سپروائزر کے عہدے پر فائز تھے۔ خون کی خرابی کے عارضے سے 1968 میں انتقال ہوا۔ ان کے پسماندگان علی گڑھ میں بستے ہیں۔ رئیس احمد وارثی نشتر کے شاگرد رہے، جن کے پاس ان کا کچھ کلام جمع ہے۔

'اختر تابندہ' جاں نثار اختر:

'میانہ قد، گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، خمار آلود پلکیں، سلگتی ہوئی چمک دار آنکھیں، ستواں لمبی ناک، پتلے پتلے ہونٹ، نکلتی ہوئی ٹھڈی، کنگھے کی آرائش سے بے نیاز کانوں پر بکھرے ہوئے لمبے لمبے بال، نگاہوں میں درد مندی، ہونٹوں پر مسکراہٹ، چہرے پر معصومیت اور بھولپن، مزاج میں سادگی، طبیعت میں نزاکت و نفاست، فطرت میں قلندری، عادتوں میں لاپرواہی، باتوں میں بے تکلفی،

گفتگو میں شگفتگی، اندازِ بیان میں شائستگی، آواز میں نرمی، لب ولہجہ میں گھلاوٹ اور لوچ، بات چیت کے دوران بار بار انگلیوں سے زلفوں کو سنوارنے کی خاص ادا، چال ڈھال میں بے پروائی و بے نیازی، لباس میں قناعت پسندی، کُرتا اور چوڑی موہری کا سفید پاجامہ، کبھی کبھی کھلے بٹنوں کی نہرو کٹ واسکوٹ، پاؤں میں چپل، تعلقات میں رکھ رکھاؤ اور میانہ روی، بڑوں کے ساتھ عزت واحترام کا رویہ، ہم عمروں کے ساتھ بے تکلفی وخوش مذاقی، چھوٹوں کے ساتھ شفقت و محبت، ایک شفیق بزرگ، مخلص دوست ہمدرد ساتھی، شگفتہ طبیعت، بامروت اور ملنسار انسان، یہ تھے جاں نثار اختر۔'' آفاق حسین صدیقی نے جاں نثار اختر پر لکھی کتاب 'جاں نثار اختر۔ شخص وشاعر' میں یہ خوبصورت نقشہ کھینچا ہے۔

جاں نثار اختر کا خاندانی نام سید جاں نثار حسین اختر ہے۔ ان کی ولادت 18 فروری 1914 کو گوالیار میں ہوئی جہاں ان کے والد مضطر برسرِ روزگار تھے۔ جاں نثار اختر کی ابتدائی تعلیم گوالیار میں ہوئی۔ وکٹوریہ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ 1934 میں علی گڑھ کالج سے سائنس میں انٹر پاس کیا اور انگریزی و اردو ادب کے مضامین لے کر 1937 میں بی اے آنرز کی سند حاصل کی۔ 1939 میں ایم اے اردو فرسٹ ڈویژن میں کامیاب کیا۔ 'اردو ناول اور اس کا ارتقا' اس عنوان پر پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کیا لیکن اسی اثنا میں وکٹوریہ کالج گوالیار میں لیکچرر کے عہدے پر ان کا تقرر عمل میں آیا۔ علی گڑھ کی پر کیف فضا نے جاں نثار اختر پر گہرے اثرات قائم کیے۔ علی گڑھ میگزین کی ادارت مجاز لکھنوی سنبھالے ہوئے تھے لیکن ان کی دہلی ملازمت کے بعد یہ ذمہ جاں نثار اختر کو سونپا گیا جو اپنے آپ میں ایک اعزاز تھا۔ علی گڑھ میں جاں نثار اختر کی مقبولیت کا اندازہ اس واقعے سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو کشور سلطان صاحبہ نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ فرماتی ہیں: 'جاں نثار اختر کے دورانِ تعلیم علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں دیگر شعرا کے علاوہ جگر مرادآبادی نے بھی شرکت کی تھی اس زمانے میں جگر کی شہرت عروج پر تھی۔ اور کسی مشاعرے میں جگر کی موجودگی میں کسی دوسرے شاعر کا کامیاب ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ لیکن اس مشاعرے میں ایک عجیب انہونی ہوئی۔ جب جگر صاحب اپنا کلام سنا چکے تو مشاعرہ ختم ہونے کا اعلان ہوا۔ لیکن طلبہ نے اصرار کیا کہ جاں نثار اختر اپنی مشہور نظم 'گرلس کالج کی لاری' سنائیں۔ اختر نے نظم شروع کی۔ ابھی کچھ بند ہوئے تھے کہ وہاں کے اوپری حصے سے جہاں طالبات اور خواتین فروکش تھیں، کسی خاتون پروفیسر نے اختر کو نظم پڑھنے سے روکا۔ اختر بڑی سعادت مندی سے واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئے۔ لیکن لڑکوں نے اپنے غوغائے محشر خیز سے ہال سر پر اٹھا لیا۔ ایسے موقع پر لڑکوں کو کنٹرول کرنے کے خیال سے جگر صاحب سے استدعا کی گئی کہ وہ کوئی غزل سنائیں۔ جگر صاحب نے غزل شروع کی۔ لڑکوں نے ایک شعر خاموشی سے سننے کے بعد پھر طوفان اٹھایا۔ ان کی ضد تھی کہ جاں نثار کو نظم پڑھنے دی جائے۔ جگر صاحب کو مایوس ہو کر لوٹنا پڑا اور پروگرام ختم کر دیا گیا۔ اس واقعے سے بھی جاں نثار اختر کی شاعرانہ مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔''

(جاں نثار اختر: حیات وفن از ڈاکٹر کشور سلطان، بحوالہ بالا، ص 68)

1940 میں جاں نثار اختر گوالیار وکٹوریہ کالج میں اردو کے استاد مقرر ہو گئے، اسی دوران 25 دسمبر 1943 کو ہندوستان کا مایۂ ناز شاعر ایک بلند قامت خاتون صفیہ

سراج الحق سے رشتۂ ازدواج میں بندھ گیا۔ یہی صفیہ سراج الحق اردو ادب میں صفیہ اختر کے نام سے مشہور ہوئیں۔

صفیہ اختر

صفیہ اختر یا صفیہ سراج الحق ممتاز ترقی پسند شاعر مجاز لکھنوی کی ہمشیرہ تھیں۔ 25 جنوری 1918 کو ضلع بارہ بنکی کی مشہور بستی ردولی میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ صفیہ کے والد چودھری سراج الحق ملازمت کے بعد لکھنؤ منتقل ہو گئے لہٰذا صفیہ کا بچپن لکھنؤ کی ادب سے مالا مال فضا میں گزرا۔ بلا کی ذہانت رکھنے والی صفیہ نے علی گڑھ سے تمام ہی امتحانات نمایاں نمبرات سے کامیاب کیے۔ اور وہیں مسلم گرلز کالج میں اقتصادیات کی لکچرر ہو گئیں۔ جاں نثار اختر کی صفیہ سے ملاقات یہیں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد صفیہ علی گڑھ میں اور جاں نثار اختر گوالیار میں۔ بقول آفاق حسین صدیقی 3 سال دس ماہ تک یہ دونوں کبھی علی گڑھ میں، کبھی لکھنؤ میں اور کبھی گوالیار میں تعطیلات میں ملتے رہے اور اسی ملنے بچھڑنے سے محظوظ ہوتے رہے۔ اسی دوران جناب جاوید اختر اور جناب سلمان اختر کی لکھنؤ میں پیدائش ہوئی۔

1947 میں تقسیم ہند کے بعد گوالیار کے حالات خراب تر ہو گئے اور فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ سے جاں نثار اختر ستمبر 1947 کے تیسرے ہفتے میں بھوپال آ گئے۔ چند ماہ بعد صفیہ بھی علی گڑھ کی ملازمت ترک کر کے بھوپال آ گئیں۔ چند مہینوں میں ہی جاں نثار اختر کو حمیدیہ کالج بھوپال میں صدر شعبۂ اردو کی ملازمت مل گئی۔ اس کے بعد صفیہ اختر بھی اسی اردو شعبے میں درس وتدریس کرنے لگیں۔ لیکن جاں نثار اختر کی گردش ابھی رکی نہیں تھی۔ 1949 میں بھوپال کا انضمام واقع ہوا اور حکومت ترقی پسندوں کے خلاف ہو گئی۔ لہٰذا پھر جاں نثار اختر کو بادل نخواستہ بھوپال چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ 19 دسمبر 1949 کو بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے۔ صفیہ اختر چھوٹے بیٹے سلمان کے ساتھ بھوپال میں تھیں، جاوید اختر لکھنؤ میں اور بے سروساماں جاں نثار اختر بمبئی میں۔ اس آئے دن کی کشاکش نے صفیہ کی صحت پر برا اثر ڈالا۔ صفیہ رفتہ رفتہ اپنی غیر متعینہ موت کی جانب بڑھتی چلی گئیں۔ 17/ جنوری 1953 کو صفیہ نے اس جہانِ فانی کو الوداع کہا۔ ایک وفا شعار بیوی اور ایک لاچار و عالم کس مپرسی کا شکار خاوند۔ وہ تمام لازوال خطوط جو 'زیرِ لب' اور 'حرف آشنا' میں آراستہ ہیں، اسی دورانیہ کی دین ہیں جن میں جذبات صائب کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا طوفان نظر آتا ہے۔ القصہ مختصر کہ صفیہ اختر خلاق طبیعت کی خاتون رہیں۔ 'حرف آشنا' اور 'زیرِ لب' ان خطوط کے مجموعوں کے علاوہ 'اندازِ نظر' کے عنوان سے ایک تنقیدی مضامین کا مجموعہ بھی شائع

ہوا جس کی تقریظ باقر مہدی جیسے سخت نقاد نے لکھی اور کھلے طور پر صفیہ کی تنقیدی قوت کا اظہار کیا۔

خدیجہ اختر

خدیجہ اختر یا خدیجہ ہارون کی پیدائش 24 اکتوبر 1930 کو بھوپال کے ایک علمی خانوادے میں ہوئی۔ ان کے والد ہارون میاں مفتی و عالم تھے۔ بجائے خود خدیجہ بھی اردو ادب کا ستھرا ذوق رکھتی تھیں۔ لہٰذا ان ہی خاتون کے وسیلے سے جاں نثار اختر نے اپنی دو شاہکار نظمیں ادب کو عطا کی ہیں۔ اول 'تمہارے شہر میں' اور دوم 'خدیجہ کے نام'۔ خدیجہ اختر نے جاں نثار اختر کے آخری لمحے تک ساتھ نبھایا۔ جاں نثار اختر کا شعری مجموعہ 'گھر آنگن' کا انتساب

بھی خدیجہ اختر سے کیا گیا ہے۔ کشور سلطان لکھتی ہیں کہ 'خدیجہ ہارون کی پہلی شادی شمس اللطیف نامی بھوپال کے مشہور ہاکی کھلاڑی سے ہو چکی تھی جو پاکستان چلے گئے تھے اور اسی بنا پر خدیجہ نے ان سے عدالت سے طلاق لے لیا۔ لہٰذا 17 ستمبر 1956 کو خدیجہ ہارون اور جاں نثار اختر کی شادی ہوئی۔ غرض کہ جاں نثار اختر کی ازدواجی زندگی صفیہ اختر کے ساتھ 9 سال ایک ماہ اور خدیجہ اختر کے ساتھ 24 سال چھ ماہ کے عرصے پر محیط ہے۔ صفیہ اختر سے جاں نثار اختر کی اولادوں میں جاوید اختر اور سلمان اختر ہیں، خدیجہ اختر سے شاہد اختر، عنیزہ اختر اور البینا اختر ہیں۔

چلیے اب جاں نثار اختر کے پسماندگان کا بھی مختصر تعارف پیش کروں۔

جاوید اختر:

17 جنوری 1945، لکھنؤ میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ سنیما میں کہانی کار کی حیثیت سے ابتدا کی اور بتدریج نغمہ نگاری تک پہنچ گئے۔ فی زمانہ ہندوستانی سنیما کے سب سے اچھے اور سب سے مہنگے گیت کار کے طور پر انھیں جانا جاتا ہے۔ بلا کا مطالعہ رکھتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کے مزاج سے خوب واقف ہیں۔ لہٰذا ان کے نغمات میں اردو زبان کی چاشنی جا بجا نظر آتی ہے۔ نثر نگار ہوتے ہوتے شاعری شروع کی اور اپنے فطری شاعر ہونے کا لوہا منوالیا۔ موصوف کے تا حال دو شعری مجموعے بہ عنوان 'ترکش' (1995) 'اور لاوا' (2011) منظر عام پر آ چکے ہیں۔ 'ترکش' کا دیباچہ قرۃ العین حیدر نے تحریر فرمایا تھا۔ جاوید صاحب اردو ادب کے قدیم سرمایے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اردو فارسی کے ہزار ہا اشعار ازبر ہیں اور ان کے برملا استعمال پر آپ قادر ہیں۔ انگریزی ادب پر بھی باریک نظر ہے۔ 1972 میں آپ نے فلمی اداکارہ ہنی ایرانی سے شادی کی لیکن یہ رشتہ 1984 تک ہی چل سکا۔ ہنی ایرانی سے دو اولادیں زویا اختر، فرحان اختر ہیں یہ دونوں بھی ہندوستانی سنیما سے جڑے ہیں۔ آگے جاوید اختر کیفی اعظمی کی بیٹی شبانہ اعظمی سے رشتۂ ازدواج میں جڑ گئے۔ جاوید اختر کا ادبی سفر تا حال جاری ہے۔

سلمان اختر

سلمان اختر عرف اویس 31 جولائی 1946 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ اور علی گڑھ سے حاصل کی۔ بعد از آں چندی گڑھ سے ڈاکٹری تعلیم مکمل کی۔ 1972 میں آپ امریکہ چلے گئے جہاں آپ میڈیکل کالج میں درس و تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ تا حال آپ کے اردو و انگریزی کی 13 کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سب سے اہم ان کا اولین شعری مجموعہ 'کو بہ کو' ہے۔ اہم اس لیے بھی کہ اس شعری مجموعہ کا پیش لفظ خود ان کے والد جاں نثار اختر نے بڑے فخر کے ساتھ تحریر فرمایا تھا۔ نئی آواز پبلی کیشنز، دہلی سے نومبر 1976 میں یہ مجموعہ شائع ہوا جس کے پانچ سال بعد جاں نثار اختر اس دنیا سے چل بسے۔

سلمان اختر صاحب کے دو اشعار جو جاں نثار اختر نے اپنے پیش لفظ میں یہ کہتے ہوئے درج کیے تھے کہ 'چند شعر اس کے ضرور سنانا چاہتا ہوں جن پر مجھے رشک آتا ہے کہ یہ میں نے کہے ہوتے'، تبرکاً یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

ہم بہت دن جیے ہیں دنیا میں
ہم سے پوچھو کہ خودکشی کیا ہے

کھڑکیاں دیر سے کھولیں یہ بڑی بھول ہوئی
میں یہ سمجھا تھا کہ باہر بھی اندھیرا ہوگا
زندگی ہے وہ کش مکش جس میں
خود سے ہارے تو سب سے ہار گئے

سلمان اختر مع اپنی دو اولادوں، کبیر اختر اور نشاط اختر امریکہ میں مقیم ہیں۔

شاهد اختر

خدیجہ اختر صاحبہ سے پہلی اولاد شاہد اختر ہیں۔ آپ کی پیدائش بھوپال میں ہوئی۔ فی الوقت بمبئی میں ملازمت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر لتا اختر شریکِ حیات ہیں۔ اکلوتی اولاد شیزی اختر ہیں۔ بڑے زندہ دل آدمی ہیں۔

عنیزہ اختر

جاں نثار اختر صاحب کی پہلی بیٹی۔ لاڈلی بیٹی۔ یہ وہی بیٹی ہے جس پر جاں نثار اختر نے اپنی لافانی اور طویل نظم 'آخری لمحہ' لکھی تھی۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں،

تم مری زندگی میں آئی ہو
میرا اک پاؤں جب رکاب میں ہے
دل کی دھڑکن ہے ڈوبنے کے قریب
سانس ہر لحظہ پیچ و تاب میں ہے
ٹوٹتے بے خروش تاروں کی
آخری کپکپی رباب میں ہے
کوئی منزل نہ جادۂ منزل
راستہ گم کسی سراب میں ہے
تم کو چاہا کیا خیالوں میں
تم کو پایا بھی جیسے خواب میں ہے
تم مری زندگی میں آئی ہو
میرا اک پاؤں جب رکاب میں ہے

عنیزہ اختر کی پیدائش بھوپال میں ہوئی۔ اپنے شوہر سلمان انصاری کے ساتھ شکاگو میں ملازمت کرتی ہیں۔ اولادوں میں ایمن اور احمد ہیں۔

البینا اختر

جاں نثار صاحب کی دوسری بیٹی جنھیں گھر میں فینی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ آپ کی پیدائش بمبئی میں ہوئی۔ فینی صاحبہ گھریلو خاتون ہو کر اپنے خاوند اشوک شرما جی اور بیٹے ایبر کے ساتھ بمبئی میں مقیم ہیں۔

■

Waseem Farhat (Alig)
Editor : Sah Mahi 'Urdu'
'Adabistan' Near Wahed Khan
Urdu, D, Ed, College, Walgaon Road
Amrawati - 444601 (MS)
Mob.:937022321

سمری بختیار پور کا علمی، ادبی منظر نامہ

محمد خوشتر

نگر نگر اردو

سمری بختیار پور علاقے کی اہم اور معتبر شخصیت جو اپنے آپ میں انجمن تھی اور ہرکوئی انھیں اپنا رہبر و رہنما تسلیم کرتاتھا۔90 کی دہائی سے قبل جتنے بھی مسلم پڑھے لکھے ہیں سب کسی نہ کسی طرح ان کے شاگر دہی رہے ہیں اور ان کا علاقے پر احسان عظیم بھی ہے اگر ایسی شخصیت کا تذکرہ نہ کیاجائے توتعارف سمری بختیار پور بالکل ادھورا رہ جائے گا۔

سہرسہ شہرضلع سہرسہ کا انتظامیہ ہیڈ کوارٹر بھی ہے۔ کوسی ڈویژن کا ایک حصہ اورکوسی کمشنری کا ہیڈ کوارٹر بھی ہے۔ اسے ۱/اپریل 1954 کوضلع بنایا گیاتھا۔ سہرسہ سے ایک ضلع 1981 میں مدھے پورہ نام سے بنایا گیا۔ سہرسہ پہلے لوک سبھا حلقہ ہوا کرتا تھامگراب یہ سوپول، مدھے پورہ اور کھگڑیا لوک سبھا حلقے میں تقسیم ہوگیا ہے۔

سمری بختیار پور کی جانی مانی شخصیت، مشہورو معروف سیاسی قائد اور زمیندارنواب چودھری محبوب علی قیصر صاحب ہیں، ان کے والد چودھری صلاح الدین حکومت بہار میں وزارت کی ذمے داری بھی نبھا چکے ہیں، 90 کی دہائی میں چودھری محمد صلاح الدین مالک حقیقی سے جاملے۔

سمری بختیار پور علاقے کی اہم اور معتبر شخصیت جو اپنے آپ میں انجمن تھی اور ہرکوئی انھیں اپنا رہبر و رہنما تسلیم کرتا تھا۔ 90 کی دہائی سے قبل جتنے بھی مسلم پڑھے لکھے ہیں سب کسی نہ کسی طرح ان کے شاگرد ہی رہے ہیں اوران کا علاقے پراحسان عظیم بھی ہے اگرایسی شخصیت کا تذکرہ نہ کیاجائے توتعارف سمری بختیار پور بالکل ادھورا رہ جائے گا۔ میری مراد حافظ وقاری مفتی عبدالرشید صاحب قبلہ چھپراوی سے ہے۔ مفتی صاحب نے تقریباً چالیس سال تک مدرسہ انوارالعلوم قادریہ سربیلہ میں دینی وعلمی اور فتاویٰ نویسی کی اہم ذمے داری نبھائی ہے۔

علاقے کے یہ چند گاؤں علمی، ادبی اورقومی ومذہبی خدمات کے لیے سہرسا ضلع میں بڑی شہرت رکھتے ہیں مخدوم چک (سمستی پور) اور اشرف چک (میاں چک) چکنی، بھادا، سمری، بھٹونی، لگماں، تریانواں، نصرت چکلہ، بھٹپورہ، پہاڑپور، رگھنیاں، سمستی پور، تھنہی، کلتوا، بتھمنڈل، ایٹہری، کمی، قاسم پور، ٹولوا، پہلام، پھمنیاں، گھوڑدوڑ، پورینی، مبارکپور، گورگانواں، پھنساہا، منگل ٹولہ، ہریوا، کھجر اہا، سونپورہ، کھموتی اورسمری بختیار پور ہیں۔

سمری بختیار پورعلاقے کے علما اپنی علمی وفکری صلاحیتوں سے بڑے بڑے اداروں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء، دارالعلوم دیوبند، مظاہرالعلوم، سبیل السلام، المعہد العالی، دارالعلوم حیدرآباد اورامارت شرعیہ، پھلواری شریف پٹنہ میں اپنے علم وفکر، درس وتدریس سے طلبا کو پروان چڑھا رہے ہیں تو بہت سے اہل علم علماء اخبارات ورسائل سے منسلک ہوکر مضامین بھی لکھ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر مفتی شاہد قاسمی (بھٹونی)، مولوی نثار احمد حصیر القاسمی (مبارکپور) اورظفر سعیدی (مبارکپور) نوشادنوری بھٹپورہ، ڈاکٹرشمشادقاسمی رگھنیاں کا نام لیا جاسکتا ہے۔

بہت سے علما کی اپنی علمی فکری تدریسی اور انتظامی صلاحیتوں سے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں دینی فرائض کی اہم ذمے داری کوبحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ الحاج مولانا ممتاز احمد اشرفی مصباحی جامعہ شمس العلوم گھوسی مئواتر پردیش میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں۔ ’مصافحہ ومعانقہ کی شرعی حیثیت‘، ’مسلم معاشرہ اور جہیز کی تباہ کاریاں‘ آپ کی تحریر کردہ کتابیں ہیں۔ مولانا مفتی فی الحال شیخ احمد کھٹو احمد آباد، گجرات میں شیخ الحدیث کے فرائض انجام دے رہیں۔ مفتی شبیر احمد اشرفی مصباحی (ایٹہری) مفتی اعظم گجرات کے عہدے پر فائز ہیں۔ آپ شیخ احمد کھٹو کے ناظم ومہتمم کے ساتھ ہی ساتھ شاہی جامع مسجد احمد آباد کے امام وخطیب بھی ہیں۔ مولانا طیب الدین اشرفی مصباحی مرحوم ’سیرت اشرفی‘ اور’شرح ماقال الاشرف‘ کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ تفسیر میں اچھی دسترس رکھتے تھے، اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ مفتی شمشاد مصباحی ایٹہری سے تعلق رکھتے ہیں کئی کتابوں کے مصنف ہیں

مرحوم 'سیرت اشرفی' اور 'شرح ماقال الاشرف' کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ تفسیر میں اچھی دسترس رکھتے تھے، اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ مفتی شمشاد مصباحی اٹھمری سے تعلق رکھتے ہیں کئی کتابوں کے مصنف ہیں مدھیہ پردیش میں اپنی صلاحیت کے جواہر لٹارہے ہیں۔

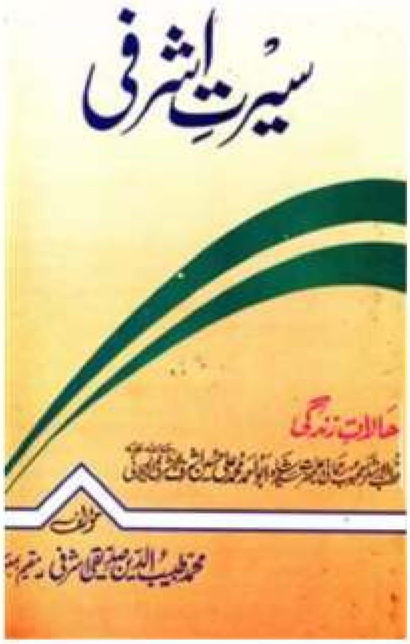

لھجراہا سے تعلق رکھنے والے مولانا داؤد حسین اشرفی مصباحی مرحوم دارالعلوم عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سٹی میں شیخ الحدیث اور صدرالمدرسین کے عہدے پر فائز تھے۔ مولانا نور عالم نور مصباحی کا تعلق گھوڑدوڑ گاؤں سے ہے اور فی الحال امبیکاپور چھتیس گڑھ میں علمی ودینی فرائض بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں، اس سے قبل جھارکھنڈ اور گجرات کی سرزمین پر بھی انھوں نے اپنے علم سے لوگوں فیضیاب کیا تھا۔ حسن اتفاق کہ شاعری سے بھی شغف رکھتے ہیں اور نور تخلص ہے آیئے ان کی شاعری کے بھی نمونوں کا جائزہ لیتے ہیں اور قلب و وجدان سے محسوس بھی کرتے ہیں۔ نور نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور نعت وحمد اور منقبت بھی۔

اگر مدینے میں پڑجائیں کچھ قدم مخصوص
تو سمجھو تیرے لیے ہوگیا ارم مخصوص
تم اپنے سجدوں کو آوارہ اب نہ ہونے دو
قیام وقعدہ کی خاطر ہوا حرم مخصوص
میں جس سے نعت حبیب خدا فقط لکھوں
مجھے بھی دے میرے معبود وہ قلم مخصوص
نبی کی نظر عنایت جو نور ہو جائے
تو ہوگا تو بھی زمانے میں محترم مخصوص

نور عالم نور مصباحی کے صاحبزادے رضا عالم بھی شاعری کا ذوق رکھتے ہیں ور اصلاح خود والد محترم سے لیتے ہیں، رضا کی ابتدائی شاعری کا نمونہ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

ہر عاشق احمد کے لب پہ یہ ترانہ ہے
اک میں ہی نہیں ان پر قربان زمانہ ہے

مولانا خورشید عالم مصباحی صوفی منش آدمی ہیں ادری میں بابا سے شہرت رکھتے ہیں، ضیاء العلوم ادری متواتر پردیش میں گزشتہ تیس سال سے طلبا کو مستفید کر رہے ہیں، ان کا گورگانواں سے تعلق ہے۔ مولانا ابوسفیان مصباحی صاحب دارالعلوم غریب نواز الہ آباد کے پرنسپل تھے منطق وفلسفہ پرعبور رکھتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں شاگرد ہیں۔ ان کی کوئی بھی تصنیف منظر عام پر نہیں آئی ہے، 27 رمضان المبارک 1442ھ کو ان کا حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے اچانک انتقال بھی ہوگیا تھا۔ مولانا عبدالمصور صاحب مصباحی مدرسہ رؤفیہ دھام نگر اڑیسہ کے صدرالمدرسین ہیں، آپ کو عربی خدمات کے صلہ میں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوزا جا چکا ہے، اڑیسہ کے علمی وادبی اور دینی لوگوں میں اپنی انتظامی اور اصلاحی شخصیت کے ساتھ پہچانے جاتے ہیں اور وہ لوگ آپ کو بڑے مولوی صاحب کے لقب سے پکارتے ہیں۔ مفتی حبیب الدین قادری علمی وتقریری صلاحیتوں کی وجہ سے اپنی شہرت آپ رکھتے ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے ان کا کلام کا کوئی دیوان اب تک شائع نہیں ہوسکا ہے۔ نموتاً ان کی ایک نعت پیش خدمت ہے۔

کوئی کاش جا کہ کہہ دے سالار کارواں سے
تیری یاد میں تڑپتا کوئی جا رہا ہے جاں سے
کوئی کاش جاکے کہتا رورو کے عرض کرتا
میری دکھ بھری کہانی طیبہ کے مہرباں سے
بیمار عشق ہوں میں میری دوا یہی ہے
کچھ خاک لاکے دے دو طیبہ کے آستاں سے
کوئی کاش آکے کہتا لو آگیا بلاوا
تیرا اے حبیب عاصی آقا کے آستاں سے

مفتی قاسم مصباحی، مفتی اعظم اڑیسہ کے لقب سے ملقب ہیں۔ مدرسہ رؤفیہ دھام نگر اڑیسہ میں دودہائی سے دینی وعلمی خدمات میں مصروف ہیں، سلجھی اور سنجیدہ تقریر کے لیے جانے جاتے ہیں بہت سے فتاوے ان کے نوک قلم سے تحریر کیے جاچکے ہیں۔ مولانا طاہر حسین مصباحی اشرفی اپنی خوبصورت آواز اور اچھی تقریر کے لیے جانے جاتے ہیں۔ شاعری بھی کرتے ہیں، تخلص عاصی ہے۔ عاصی نے زیادہ تر نعت ومنقبت ہی لکھی ہے، وہ بھی ضرورتاً۔ تاہم ان کی شاعری سے ایک نعت بطور مثال دیکھیں۔

کتنے نازک سے گھر میں رہتے ہیں
وہ میری چشم تر میں رہتے ہیں
روح میں وہ بسے ہوئے ہیں مری
بن کے خوشبو جگر میں رہتے ہیں
اس لیے چاند خوبصورت ہے
ان کے جلوے قمر میں رہتے ہیں
اس میں اک گھر نصیب ہوجائے
مصطفی جس شہر میں رہتے ہیں
مجھ سے عاصی کا بھی ٹھکانہ ہے
وہ شفاعت نگر میں رہتے ہیں

مولانا رفیق وارث مصباحی حافظ وقاری ہونے کے ساتھ ہی شاعری کا بھی شغف رکھتے ہیں گذشتہ کئی سالوں سے ساؤتھ افریقہ کی سرزمین پر دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ رفیق وارث مصباحی عمدہ مقرر بھی ہیں اور اچھے اناؤنسر بھی۔ نام ونمود سے ہمیشہ پرہیز کرتے رہے ہیں۔ ان کی شاعری سے چند اشعار بطور مثال ملاحظہ فرمائیں۔

کیا بیاں ہو اس زباں سے حسن خوباں آپ ہیں
ہم شبیہ غوث اعظم نور جیلاں آپ ہیں
وارث مسکیں ہے سائل در پہ بخشش کے لیے
ہو کرم سرکار میرے ابر نسیاں آپ ہیں

ماسٹر نذیر احمد مرحوم ایک بہترین شاعر تھے اور مشہور ومعروف شاعر شکیل بدایونی کے ساتھی تھے، آپ زیادہ تر اپنے نانیہال وسسرال سربیلہ گاؤں میں ہی رہتے تھے۔ ان کا انتقال بھی سربیلہ ہی میں ہوا اور وہیں مدفون بھی ہوئے۔ نذیر احمد کے زیادہ تر اشعار غیر محفوظ ہیں۔

مولانا ایوب عرف صابر القادری صاحب کا تعلق ہتھمنڈل گاؤں سے ہے۔ آپ گورنمنٹ ٹیچر رہے ہیں اور فی الحال وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہونے کے بعد شاعری کرتے ہیں اور علمی وادبی خدمات میں لگے ہوئے ہیں، انہوں نے مضامین بھی لکھے ہیں، نعتیہ اور حمد پر بھی ان کا قلم چلا ہے وہیں قطعات اور نظمیں بھی تحریر کی ہیں، ان کے کلام میں سے ایک غزل پیش خدمت ہے۔

رات بھر سونے نہ دیتی تھی مسرت عید کی
اس کی تو رہ رہ کے ہوتی دل میں حسرت دید کی
عید پر آئے گا اس کا کر رہے تھے انتظار
وہ نہیں آیا تو پھیکی سی ہے لذت عید کی
کون دیکھے ہے مجھے اس طرح کہ میں ہوں سوچتا
بانٹنا چاہے ہے وہ شاید مسرت عید کی
غیر جب دینے لگے مجھ کو مبارکباد تو
رفتہ رفتہ بڑھ گئی ہے جب تو شہرت عید کی

کون دیکھے ہے کہ کس کے دل میں کیا پنہاں ہے دوست
مجھ کو تو ہر صورت میں ہی ملتی ہے لذت عید کی
عید کے موقع پہ غربا، کا جو رکھتا ہے خیال
اصل میں حاصل ہے اس کو ہی مسرت عید کی
میرے دل میں تو نہاں ہر دم ہے صابر آرزو
کاش مل جائے ہر اک مومن کو برکت عید کی

سمری بختیار پور کے پہلے مسلم جنھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے فزیکس میں پی، ایچ ڈی کی ہے انھیں ڈاکٹر جنید احمد کے نام سے جانا جا تا ہے، جنید صاحب کم گوئی اور سادگی کے لیے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ انتقال سے چند ماہ قبل تک بھی لوگ ریاضی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کے لیے بلا مذہب وملت ان کے یہاں حاضر ہوتے تھے۔ اسفر فریدی اردو روزنامہ انقلاب کے بہار چیف بیورو ہیں اور اہم موضوع پر ان کے مضامین مختلف اخبارات ورسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ افضل مصباحی اور افسر عالم پی ایچ ڈی کر چکے ہیں اور اول الذکر بنارس ہندو یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر ہیں ان کی ایک کتاب 'اردو صحافت آزادی کے بعد' منظر عام پر آچکی ہے۔ ڈاکٹر مرشد اقبال ہریا گاؤں کے پہلے ایم بی بی ایس ہیں تو نقیب عالم گاؤں کے پہلے انجینئر۔ ابھی ہریا گاؤں کے اعجاز احمد نے جامعہ ہمدرد سے پی ایچ ڈی کی ہے اور امریکہ میں برسر روزگار ہیں تو جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دلی سے عربی زبان میں حامد رضا قادری پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ اسی طرح سے علاقے کے بہت سے افراد مختلف جامعات میں خدمات انجام دے رہے ہیں، یہاں پر تمام کو شمار کرانا مقصود نہیں بس دو ایک مثال کے لیے کافی ہیں، ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ہتھمنڈل سے تعلق رکھتے ہیں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی سے منسلک ہیں تو ڈاکٹر محمد علی جوہر کا چکنی سے تعلق ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ اردو میں فی الحال پروفیسر اور چیرمین ہیں۔ ڈاکٹر موصوف احمد اشرفی کا تعلق گھوڑدوڑ کی سرزمین سے ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے بعد روزگار سے منسلک ہوئے اور فی الحال صدر شعبۂ اردو ونود بہاری مہتو یونیورسٹی دھنباد میں اردو ادب کی خدمات میں لگے ہوئے ہیں۔ اشرفی نے ملک کے مختلف جامعات میں تین درجن سے زائد قومی اور بین الاقوامی سمینار میں بحیثیت مہمان مقالہ نگار کے شرکت کی ہے۔ دو کتابیں 'تحقیق وتنقید: سمت ورفتار' اور 'ادب کی تفہیم' پر یوپی اور بہار اردو اکیڈمی نے انعام سے بھی نوازا ہے۔ یوپی، بنگال اور جھارکھنڈ یونیورسٹی کے تقریری اور تحریری

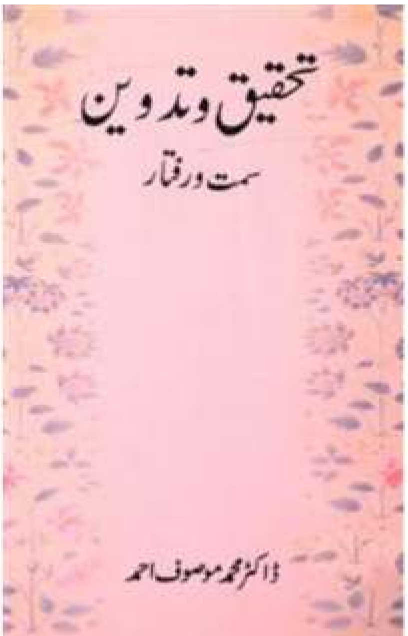

ممتحن کے علاوہ نیشنل سروس اسکیم کے پروگرام آفیسر، رسائل وجرائد کے ایڈیٹوریل ممبر وایڈوایزر بھی رہے ہیں۔ اسی علاقے کے تین طالب علم اپنی اپنی جامعہ میں سیاسی اعتبار سے بھی سرگرم ہیں ابوالفرح شاذلی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تو حامد رضا قادری جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں راقم الحروف (محمد خوشتر) یونیورسٹی آف حیدرآباد میں ہیں۔

نوجوان علما اور فارغین میں سے کچھ اہم کے نام یہ ہیں جو اپنی دینی، علمی وادبی اور سماجی ومعاشی، سیاسی اور فلاحی خدمات سے جڑے ہوئے ہیں۔ مولانا نعمان رضا برکاتی کا تعلق ہریا سے ہے، ابتدائی تعلیم گاؤں کے ادارہ دارالعلوم فیضان وارث سے ہی حاصل کی پھر حمیدیہ بنارس اور ضیاء العلوم اوری سے ثانوی درجے کی تعلیم لی۔ بعد میں کلکتہ کا رخ کیا اور فراغت تک ضیاء الاسلام ہوڑہ کلکتہ میں ہی اکتساب علم کیا۔ اپنی علمی ودینی اور خطیبانہ صلاحیتوں کی وجہ سے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تشریف لے جا رہے ہیں اور لوگوں کی علمی پیاس بجھا رہے ہیں ایک کتاب بنام 'حیات طیبہ سلطان الہند غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ' تحریر بھی کی ہے، سماجی خدمت بھی کرتے رہتے ہیں اور اسی سلسلے میں بنگلہ دیش کا دورہ بھی کیا ہے۔ مولانا اعجاز انجم اشرفی آپ بہترین خطیب ہیں، حق اور کھری بات کہنے میں یقین رکھتے ہیں۔ مولانا عمار احمد قادری مصباحی فراغت کے بعد سے ہی مختلف اداروں میں خدمات کی انجام دہی کے بعد فی الحال اسکول ٹیچر ہیں اور ہریا جامع مسجد کے خزانچی بھی۔ مولانا قمر عارف ازہری جامع اشرف کچھوچھہ شریف سے فراغت کے بعد عارف نے الجامعۃ الازہر مصر سے بھی علم حاصل کیا ہے۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ یہ پہلے سہرساوی ہیں جنھیں ازہری ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جامع اشرف کچھوچھہ شریف میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، فی الحال مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد سے ایم اے عربک کر رہے ہیں۔ مولانا رضوان احمد قادری کھجر اہا سے ان کا تعلق ہے جامع اشرف سے فراغت کے بعد ندوہ سے بھی خوشہ چینی کی ہے۔ فی الحال اپنے علاقے میں ملی خدمات میں سرگرم رہتے ہیں اور ہریا کنیا مکتب اسکول میں بحیثیت استاد خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مولانا شاہد رضا اور مولانا سرفراز، مولانا ابوالفتح آپ سبھی ہتھمنڈل گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں اور مولانا اکبر کچھمنیاں کے رہنے والے ہیں۔ مولانا شاہد رضا جامعی اشرفی کا تعلق چکنی گاؤں سے ہے اور فی الوقت مدرسہ عمادیہ پٹنہ کے پرنسپل ہیں۔ کھجر اہا سے تعلق رکھنے والے منہاج عالم علاقے کے لیے مثال ہیں جو کہ دارالعلوم فیضان وارث سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد (BPSC) بہار پبلک سروس کمیشن کا امتحان کامیاب کر کے عالم نگر چوسا ضلع مدھے پورہ میں بلاک ترقیاتی آفیسر (B.D.O) کی خدمات انجام دے رہے ہیں، ہنوز میری معلومات کے مطابق سہرسہ ضلع سے پہلے مسلم ہیں جس نے اس طرح کے مقابلہ جاتی امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر زاہد صاحب کا تعلق گھوڑدوڑ کی سرزمین سے ہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کی تعلیم مکمل کی اور آنکھ کے اسپشلیسٹ ڈاکٹر تسلیم کیے جا رہے ہیں۔ بہار گورنمنٹ میں ملازمت اور میڈیکل آفیسر ہیں اور سمری بختیار پور میں پرائیوٹ ہاسپٹل کے ذریعے عوامی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ذوالنورین سیفی کا تعلق ہریا گاؤں سے ہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کر رہے ہیں۔ وجیہ احمد تصور کا تعلق کچھمنیاں گاؤں سے ہے، بچپن ہی سے ان کی تحریریں پڑھتا آیا ہوں، جب کہ خاتون مشرق کا بول بالا تھا، فی الحال گورنمنٹ ٹیچر ہیں۔ سوشل سائٹ فیس بک پر بہت زیادہ ایکٹیو ہیں اور علاقے کی اہم خبروں کو اردو اور ہندی زبانوں کے ذریعے خوبصورت الفاظ وجملے میں پرو کر عام لوگوں تک بحسن وخوبی پہنچا رہے ہیں، مذکورہ سبھی اہل سمری بختیار پور کے لیے مستقبل کے سنہرے باب کا درجہ رکھتے ہیں۔

■

Md. Khushtar
Research Scholar, Dept of Urdu
School of Humanities
Hyderabad Central University
Hyderabad - 500046 (Telangana)
Mob.:8341116397

مشرقی علوم کے فروغ میں منشی نول کشور کی خدمات

شکیل احمد

علم و ادب کے محافظ منشی نول کشور کی پیدائش ایک برہمن گھرانے میں 3 جنوری 1836 کو ہوئی۔ ان کا آبائی وطن ریٹر گاؤں، ضلع متھرا، اتر پردیش تھا۔ لیکن بعد میں یہ گھرانا علی گڑھ منتقل ہو گیا تھا۔ ان کے والد بابو جمنا پرشاد بھارگو قصبہ ساسنی، ضلع علی گڑھ کے خوشحال زمینداروں میں شمار ہوتے تھے اور دادا منشی بال مکند انگریزی عہد میں آگرہ کے مہتمم محافظ خانہ تھے۔ یہ خاندان عہد مغلیہ سے ہی علم دوستی میں مشہور تھا۔ منشی نول کشور کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے وطن ساسنی کے مکتب سے شروع ہوئی جہاں انھوں نے عربی اور فارسی درسیات کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے آگرہ گئے اور پانچ سال حصول تعلیم کے بعد 1850 میں آگرہ کالج سے تعلیم کی تکمیل کی۔

منشی نول کشور کو طالب علمی کے زمانے سے ہی مضمون نگاری کا شوق تھا، انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کی ابتدا شمالی ہند کے مشہور اخبار 'سفیر آگرہ' سے کی اور سترہ سال کی عمر میں اس قدر شہرت حاصل ہو گئی کہ 'کوہِ نور' اخبار لاہور کے ایڈیٹر منشی ہرسکھ رائے نے انھیں اپنے اخبار میں کام کرنے کی دعوت دی۔ 1851 میں نول کشور لاہور چلے گئے اور چار سال تک کوہ نور اخبار سے وابستہ رہے۔ منشی جی 1856 میں اس ارادہ سے آگرہ واپس آ گئے کہ ایک مطبع قائم کر کے ملک و ملت کی خدمت انجام دیں۔ اسی دوران 1857 کی تحریک آزادی شروع ہو گئی جس نے ہندوستانیوں اور انگریز حکومت کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ منشی نول کشور ملک کے ان حالات سے بے حد متاثر اور فکر مند تھے۔

مطبع نول کشور کا قیام

جنگ آزادی کے ہنگامہ کے بعد منشی نول کشور آگرہ سے لکھنؤ آ گئے اور آغا میر کی ڈیوڑھی کے ایک مکان میں 1858 میں ایک مطبع قائم کیا پھر کچھ عرصہ کے بعد محلّہ رکاب گنج میں راجہ مان سنگھ کی کوٹھی میں جگہ حاصل کر کے باقاعدہ طباعت کا کام شروع کیا۔ اس مطبع کے ذریعے منشی نول کشور نے مشرقی علوم وفنون، تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کی بازیابی کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ آپ نے نادر و نایاب کتابیں مختلف کتب خانوں سے تلاش کرا کے انھیں تصحیح و حواشی کے ساتھ ازسرِ نو شائع کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ 1857 کی تباہی کے بعد منشی نول کشور مشرقی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کے تحفظ کا فریضہ انجام دیا۔ جیسا کہ سید سلیمان ندوی 14/جنوری 1937 کے اپنے ایک خطبہ صدارت میں کہتے ہیں:

''سب سے آخر میں لکھنؤ کے اس مطبع کا نام لیا جاتا ہے جس کی زندگی اب اسی برس کے قریب پہنچ گئی ہے۔ اس سے میری مراد نول کشور کا مشہور نول کشور پریس ہے۔ یہ غدر کے بعد 1858 میں قائم ہوا اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی علوم وفنون کی جتنی ضخیم اور کثیر کتابیں اس مطبع نے شائع کیں۔ ان کا مقابلہ ہندوستان کیا مشرق کا کوئی مطبع نہیں کر سکتا۔ ہماری زبان کی اکثر ادبی اور علمی کتابیں اسی مطبع سے چھپ کر نکلیں۔ شعرا کے دواوین، مثنویاں، قصائد، قصے، افسانے، داستانیں اور اس کی عام کتابیں سب اسی کوششوں کی ممنون ہیں۔''

(نقوش سلیمانی، سید سلیمان ندوی، مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڈھ 1939، ص:77)

مطبع نول کشور کی خدمات

منشی نول کشور نے اسلامی علوم کے ساتھ دیگر مذاہب کی کتابیں، علوم وفنون اور زبان و ادب کا عظیم الشان ذخیرہ شائع کیا۔ ایک شائع شدہ فہرست کے مطابق پانچ ہزار سے زائد کتابیں مطبع نول کشور سے شائع ہوئیں۔ ان کتابوں میں عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور ملک کی بیشتر علاقائی زبانوں کی کتابیں شامل ہیں؛ مثلاً اسلامی کتابوں میں قرآن مجید، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، فتاویٰ عالمگیری، تاریخ طبری اور تاریخ فرشتہ شائع ہوئیں تو دیگر مذاہب کی کتابوں میں منوسمرتی، گیتا، مہابھارت، رامائن اور ویدوں کے ساتھ گروگرنتھ، توریت، عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید شائع ہوئے۔ فارسی اور اردو ادبیات کی کتابوں میں مثنوی مولانا روم، قصائد عرفی، دیوان امیر خسرو، مرثیہ انیس، فسانۂ آزاد، داستان حمزہ، داستان الف لیلہ، دیوان غالب اور دیوان بیدل طبع ہوئیں تو اسی کے ساتھ سور، تلسی میرا اور کیسوداس کی کتابیں بھی شائع ہوئیں۔

منشی جی نے اپنے مطبع میں ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا تھا جہاں کتابوں کو ملک کی دیگر زبانوں میں منتقل کرنے کا نظم تھا۔ خاص کر ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے ہندو، اسلام اور سکھ مذہب کی مقدس کتابوں کا ترجمہ ہندی اردو اور گرومکھی زبانوں میں کرایا۔ اس طرح سے فارسی سے اردو میں ترجمہ کی گئی کتابوں میں مثنوی مولانا روم، سیر المتاخرین، تفسیر حسینی، آئین اکبری اور اخلاق جلالی وغیرہ ہیں، عربی سے جن کتابوں کے ترجمے شائع کیے ان میں فتاویٰ عالمگیری، احیاء العلوم الدین، مشکوٰۃ شریف وغیرہ اہم ہیں۔ سنسکرت سے رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا اور سکھ ساگر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ منشی نول کشور مذہب وملت کے امتیاز سے بلند ہو کر ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے حقیقی نمائندہ تھے۔

کتابوں کی اشاعت کے وقت منشی نول کشور ان کی تصحیح اور درستگی کے ساتھ ان کے احترام کا بھی خیال رکھتے تھے۔ قرآن مجید کی طباعت کے لیے منشی جی نے کارکنان کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ پاک وصاف ہو کر طباعت کریں اور خود بھی نہا دھو کر پاک و صاف مسند پر بیٹھ کر دھلی ہوئی صاف چادر اپنے زانو پر ڈال کر قرآن مجید کی کاپیوں کو دیکھتے تھے۔ تاکہ کسی قسم کی بے حرمتی نہ ہو۔ اس قدر اہتمام کی وجہ سے مطبع نول کشور سے شائع کردہ قرآن مجید اور دیگر اسلامی کتابوں کی فروخت ملک میں بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ عربی و فارسی زبانوں کی کتابوں کی مانگ تو پوری اسلامی دنیا سے کی جاتی تھی۔ مطبع نول کشور کی شائع کردہ مذہبی اور علمی کتابوں کو دیکھ کر افغانستان کے امیر عبدالرحمٰن نے 1885 میں لدھیانہ دربار میں منشی نول کشور سے کہا تھا کہ آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا یہ سفر اس وجہ سے کامیاب ہوا کہ آپ سے ملاقات ہو گئی، ہندوستان میں جو مسرت آپ سے مل کر ہوئی وہ کسی کام سے نہیں ہوئی۔ اسی طرح شاہِ ایران نے 1888 میں اپنی ہندوستان آمد کے دو مقاصد بتائے تھے ایک وائسرائے سے اور دوسرا منشی نول کشور سے ملاقات کرنا۔

مطبع نول کشور اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے ذریعے شائع شدہ کتابوں میں جو دیدہ زیبی، تنوع اور معیار تھا اس کی پوری دنیا میں پذیرائی ہوئی۔ منشی جی کتابیں طبع کرنے سے پہلے مستند علماء و دانشوروں سے ان

کی تصحیح کراتے تھے۔ ان کے اس کام میں ماہر مترجم، حواشی نگار اور شرح نویس کے ساتھ خوش نویسوں کی پوری ایک جماعت شامل تھی۔ ان کے مطبع کی شاخیں لاہور، کانپور، الہ آباد، پٹیالہ، اجمیر اور جبل پور میں بھی قائم ہوگئی تھیں، دہلی، کلکتہ اور پٹنہ وغیرہ میں ایجنسیاں قائم تھیں اور لندن میں ان کا نمائندہ ہوا کرتا تھا۔ مرزا غالب نے کہا تھا:

''اس چھاپہ خانہ نے جس کسی کا بھی دیوان چھاپا ہے اس کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔''

(نیا دور، منشی نول کشور نمبر، نومبر-دسمبر 1980، ص: 193)

مطبع نول کشور محض ایک اشاعتی ادارہ نہیں تھا بلکہ زبان و ادب، علوم و فنون اور علماء و دانشوروں کا سرپرست بھی تھا۔ منشی نول کشور نے مطبع نول کشور کو مختلف صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کا ذریعہ بنایا، مثلاً داستان نگاری اور قصہ گوئی کو آگے بڑھایا۔ ان کو اگر کسی کے بارے میں یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ کسی زبان کا ماہر یا کسی مخصوص صلاحیت کا حامل ہے تو اس کو نہایت عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ خود بھی بہت مردم شناس تھے۔ انھوں نے بہت سے گمنام اہل علم و فن اور زبان و ادب کے ماہرین کو تلاش کر کے مطبع سے وابستہ کیا۔ ان میں سے بعض تو اتنے مشہور و مقبول ہوئے کہ آج علمی و ادبی دنیا کو ان پر فخر ہے۔ ناظر کاکوروی نے لکھا ہے:

''لکھنؤ میں جس قدر مشہور حافظ، عالم، مؤرخ، ادیب اور شاعر اس مطبع میں بیک وقت جمع ہو گئے تھے ہندوستان کے کسی دوسرے مطبع کو نصیب نہ ہوئے۔''

(اردو کے ہندو ادیب، ناظر کاکوروی، مطبوعہ انوار بکڈپو، لکھنؤ، 1939)

اودھ اخبار

منشی نول کشور نے اردو صحافت کو بھی ایک معیار عطا کیا۔ انھوں نے مطبع نول کشور کے قیام کے چند ماہ بعد ہی 26 نومبر 1858 کو ایک ہفت روزہ 'اودھ اخبار' جاری کیا جو 1877 تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ اس اخبار کا مقصد سماج میں اخلاقی اور تعلیمی بیداری لانا تھا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے مضمون نگاروں، مراسلہ نگاروں، نمائندوں اور نامہ نگاروں کی باقاعدہ خدمات حاصل کیں۔ ہر جگہ کی خبریں بروقت مل جائیں اس کے لیے ملک کے مختلف صوبوں میں اودھ اخبار کے نامہ نگار مقرر کیے۔ اس زمانہ میں مشہور تھا کہ ریاستوں کی راجدھانی میں حکومت کے نمائندے رہتے ہیں یا نول کشور کے۔

(اخبار عالم، منشی وجاہت علی خاں، اشاعت نمبر، 17، اپریل 1980)

اودھ اخبار ہندوستان کے علاوہ لندن، فرانس اور دوسرے مغربی ممالک میں بھی پڑھا جاتا تھا۔ اس میں مضامین لکھنے والوں میں سرسید اور مرزا غالب جیسی عظیم شخصیتیں شامل تھیں۔ اخبار میں ادبی و علمی مضامین اور خبروں کے علاوہ شعرا کے کلام، افسانے، تنقید، تبصرے اور انجمنوں، مشاعروں، جلسوں اور ثقافتی تقریبات کی کارروائیاں بھی چھپتی تھیں۔ اخبار میں عوام کی آگاہی کے لیے سرکاری قوانین اور احکامات کے ترجمے بھی شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ عدالت اور میونسپل کمیٹی کی کارروائیوں اور ریلوے ٹائم ٹیبل کی اطلاعات کے ساتھ وقتاً فوقتاً بعض اشتہارات بھی چھپتے تھے۔ گارساں دتاسی دسمبر 1877 کے اپنے ایک خطبہ میں کہتے ہیں:

''یہ اخبار پچھلے سات سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ چنانچہ اس کی ہر اشاعت پچھلی اشاعتوں سے بہتر نظر آتی ہے۔ اس کی تقطیع اور صحافت کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ اخبار ہفتہ وار ہے اور چہار شنبہ کے روز شائع ہوتا ہے۔ شروع شروع میں اس میں صرف چار صفحے ہوا کرتے تھے اور وہ بھی چھوٹی تقطیع پر، پھر چھ ہوئے اور پھر سولہ اور اب وہ اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے کے مقابلے میں اس کی تقطیع بھی بڑی ہوگئی ہے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ ضخیم اخبار ہندوستان بھر میں اور کوئی نہیں۔''

(نیا دور، منشی نول کشور نمبر، نومبر-دسمبر 1980، ص: 193)

اودھ اخبار کے طرز پر منشی نول کشور نے بعد میں ایک انگریزی اخبار 'اودھ ٹائمز' بھی شروع کیا تھا۔ لیکن افسوس زندگی نے انھیں اتنا وقت نہ دیا کہ اسے بھی وہ اودھ اخبار کی طرح مقبول اور معیاری بنا سکتے۔ اس طرح جنوری 1885 میں انھوں نے 'اودھ ریویو' نامی ماہنامہ بھی شروع کیا تھا لیکن اگلے ہی ماہ 19 فروری 1895 میں منشی نول کشور کی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد صرف نو ماہ ہی اودھ ریویو نکل سکا۔

دیگر خدمات

منشی نول کشور نے رفاہ عام کے کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ اپنے مطبع کی شائع شدہ مطبوعات کو ملک کے مختلف تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کو مفت فراہم کیا کرتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کو درسی کتابیں منشی نول کشور نے مفت مہیا کرائی تھیں۔ انھوں نے بہت سے تعلیمی اداروں، یتیم خانوں اور اسپتالوں کو اپنی سخاوت سے فیض یاب کیا۔ 1885 میں نواب آغا میر کے محل کو خرید کر اس میں منشی نول کشور اسکول قائم کیا جسے 1887 میں حکومت کے سپرد کر دیا جو بعد میں گورنمنٹ جوبلی کالج بنا دیا گیا۔ محمڈن کالج علیگڈھ، آگرہ کالج جبلی کالج لکھنؤ اور بہت سے دوسرے اداروں کو گرانقدر عطیات دیے۔ لکھنؤ کے ڈفرن اسپتال کی عمارت انھیں کی دین ہے۔

سماج اور ملک کے لیے منشی نول کشور کی ان خدمات کے لیے انگریز حکومت نے انھیں 1877 میں 'قیصر ہند' تمغے سے سرفراز کیا اور 1888 میں سی آئی ای کی باوقار ڈگری سے نوازا۔ وہ لکھنؤ کے اعزازی مجسٹریٹ اور اودھ کے جیل خانوں کے اعزازی انسپکٹر بھی تھے اور انھیں گورنمنٹ پریس الہ آباد کا نگراں بھی بنایا گیا تھا۔ بھارت سرکار نے بھی ان کی خدمات کے اعزاز میں ان کی پچھترویں یوم وفات پر بطور یادگار ایک ڈاک ٹکٹ جاری کیا تھا۔ سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی نے منشی نول کشور کو 7 جنوری 1970 کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انیسویں صدی کا 'ہمارا دانشورانہ قائد' قرار دیا تھا۔ منشی نول کشور کے متعلق ان کے ہم عصر منشی وجاہت علی خاں، ایڈیٹر اخبار عالم نے لکھا تھا:

''منشی نول کشور صاحب ان کے اوصاف اور حالات لکھنے کی ضرورت نہیں عیاں راچہ بیاں۔ ہندوستان اور عرب و عجم اور انگلستان اور مصر و روم اور فرانس ان سب ملکوں میں ان کا نام روشن ہے۔ اس شخص کو اگر بانیِ کتب علوم و فنون کہا جائے تو بجا ہے۔ حسن و اخلاق اور محبت اور عالی ہمتی اور دوست پروری میں منشی صاحب موصوف ہزارہا آدمیوں سے افضل و اعلیٰ ہیں۔''

(اخبار عالم، منشی وجاہت علی خاں، اشاعت نمبر، 17، اپریل 1980)

خلاصہ کلام یہ کہ منشی نول کشور نے ہند اسلامی تہذیب کے ایک قدآور دانشور کی حیثیت سے برطانوی استعمار کی زد میں آئی ہوئی اس تہذیب کو اس بلندی پر لے گئے جس کے زیر سایہ ادب و شرافت اور ترسیل و ابلاغ کے نئے معیارات قائم ہوئے۔ منشی نول کشور کا عہد ہند اسلامی تہذیب کے لیے مشرقی علوم و فنون کا ایک تابندہ تحفہ ہے۔ اس تہذیبی بازیافت کے لیے منشی نول کشور کی اقدار و روایات کو تازہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

کتابیات

1. نورانی، امیر حسن۔ سوانح منشی نول کشور، پٹنہ: خدابخش پبلک لائبریری، 1995
2. قاضی، عبیدالرحمٰن: نول کشور اور ان کا عہد، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 2004
3. نورانی، امیر حسن۔ منشی نول کشور اور ان کے خطاط اور خوشنویس، نئی دہلی: NCPUL، 1994
4. چندر شیکھر، عبدالرشید۔ فہرست کتب مطبع نول کشور، نئی دہلی: دلی کتاب گھر، ایچ ایس آفسٹ، 2012
5. لال جی: جیون چرتر منشی نول کشور صاحب۔ لکھنؤ: مطبع منشی نول کشور، 1903
6. نورانی، امیر حسن: منشی نول کشور حالات اور خدمات۔ دہلی: مکتبہ صبح ادب، 1982

■

Dr. Shakeel Ahamad
Asst. Prof. Dept. of Islamic Studies
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad-50003
Cell.: 9811647505

اودھ کا بابائے صحافت
منشی نول کشور

سفیان احمد انصاری

شمالی ہند میں اُردو صحافت کا آغاز 1837 ہی میں ہوگیا تھا؛ اور مرزا پور (بنارس) سے اردو کا پہلا رسالہ 'خیر خواہ ہند' 1837 میں ایک عیسائی پادری آرسی ماتھر کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا تھا۔لیکن اودھ میں اُردو صحافت کا آغاز کرنے اور اُردو صحافت کو ترویج و فروغ دینے میں جن شخصیات کا نام سرفہرست ہے، ان میں منشی لال جی اور مولوی محمد یعقوب فرنگی محلی کے بعد ایک بڑا نام منشی نول کشور کا آتا ہے، جو خاص اہمیت کا حامل ہونے کے ساتھ اردو صحافت کے باب میں زریں حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے۔

منشی نول کشور کی ولادت کائستھ خاندان میں 3 جنوری 1836 کو ضلع علی گڑھ کے بستوئی میں ہوئی تھی۔ والد پنڈت جمنا پرشاد علی گڑھ کے زمیں دار تھے۔ منشی جی کی ابتدائی تعلیم کا آغاز زمانہ کے رواج کے مطابق مکتب میں ہوا؛ جہاں انھوں نے عربی، فارسی اور اردو سیکھی، اور دس سال کی عمر میں ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو گئے، پھر ثانوی تعلیم کے لیے 1822 میں پنڈت گنگادھر شاستری کے ذریعے قائم کیے گئے مشہور تعلیمی ادارہ آگرہ کالج میں داخل ہوئے، جہاں پانچ سال تک تعلیم حاصل کی۔ دوران تعلیم ہی مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوگیا تھا، چنانچہ دورطالب علمی ہی میں مضامین لکھ کر اخباروں میں شائع کرواتے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد میدان صحافت میں قدم رکھا؛ اور اپنی صحافتی زندگی کا آغاز 'سفیر آگرہ' نامی اخبار سے کیا۔

'سفیر آگرہ' کس کا اخبار تھا؟ کس نے نکالا تھا؟ اس سلسلے میں محققین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے؛ بعض تاریخ نگاروں کے مطابق 'سفیر آگرہ' خود منشی نول کشور نکالتے تھے، لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ صحیح اور درست بات یہ ہے، جیسا کہ دیگر محققین کی رائے ہے کہ 'سفیر آگرہ' کے ایڈیٹر اور مالک دیوان چند تھے؛ منشی نول کشور صرف اُس میں مضامین لکھتے تھے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جب سولہ سال کی عمر میں اُن کی تعلیم مکمل ہوگئی؛ تو 'سفیر آگرہ' سے مکمل طور پر منسلک ہوگئے۔

پھر جب لاہور میں منشی ہرسکھ رائے نے 14 جنوری 1850 کو 'کوہ نور' جاری کیا؛ تو انھیں ایک ایسے باصلاحیت شخص کی ضرورت پڑی جو 'کوہ نور' کے انتظام وانصرام میں اُن کا ہاتھ بٹاسکے، اس کے لیے انھوں نے منشی نول کشور کا انتخاب کیا، لہٰذا منشی نول کشور ایک سال تک 'سفیر آگرہ' سے منسلک رہنے کے بعد سترہ سال کی عمر میں 'کوہ نور' سے وابستہ ہوگئے؛ جہاں انھوں نے اخبارنویسی کے اسرار ورُموز کے علاوہ تجارتی اور کاروباری نکات وگُر بھی سیکھے۔ پھر 1867 میں 'کوہ نور' سے علیحدہ ہوکر اپنے وطن آگرہ واپس آگئے۔ اُن کا ارادہ تھا کہ آگرہ پہنچ کر اپنا اخبار نکالیں گے، لیکن لوگوں کے مشورہ (کہ یہاں فی الحال اخبار نکالنے کے لیے ماحول سازگار نہیں ہے) پر آگرہ سے اپنا اخبار نکالنے کا ارادہ ترک کر کے اودھ کے دارالسلطنت لکھنؤ کی راہ لی؛ اور وہاں ایک نئی زندگی کی شروعات کی۔ لکھنؤ کی زندگی میں بہت سے کارناموں میں بطور خاص مطبع نول کشور کا قیام اور 'اودھ اخبار' کا اجرا قابل ذکر ہے؛ جو دنیائے ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

1858 کے اوائل میں آگرہ سے لکھنؤ پہنچے، اور لکھنؤ میں اولاً محلہ آغا میر کی ڈیوڑھی میں ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر لے کر اس میں اپنا پریس لگایا۔ پریس کا نام 'مطبع اودھ اخبار یا مطبع نول کشور' تھا۔ کچھ عرصے کے بعد منشی جی نے اپنا یہ پریس گولہ گنج میں منتقل کردیا۔ پھر جب طباعتی کام بڑھنے لگا؛ تو کشادہ جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی؛ تو اس ضرورت کی تکمیل کے لیے مہاراجہ مان سنگھ بہادر والیِ اجودھیا کی کوٹھی کرایے پر لی، اور مطبع مذکور کو اس میں منتقل کردیا۔ پھر 1870 میں منشی نول کشور نے حضرت گنج میں واقع کوٹھی غالب جنگ خرید لی؛ جس کا احاطہ بہت وسیع تھا، اُس میں اودھ اخبار کا دفتر قائم کیا؛ اور مشہور شاہی عمارت 'مبارک منزل' خرید کر اُس کو اپنی رہائش گاہ بنایا۔

اس وقت ہندوستان پر برطانوی حکومت کا غلبہ تھا۔ اور پریس چلانا جان جوکھم میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ لیکن منشی نول کشور نے بڑی بہادری اور ہمت سے کام لیا؛ اور اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔ چنانچہ ابتدا میں انھوں نے چند مذہبی رسائل اور بچوں کے قاعدے چھاپے؛ اور انھیں خود ہی بیچنا شروع کیا؛ حتی کہ وہ خود اپنے کندھوں پر طبع شدہ مواد کے گٹھر اُٹھا کر بازار اور دفاتر تک لے جاتے تھے، اُن کی اسی محنت اور جدوجہد کی وجہ سے انھیں بھارت کا Caxton کہا جاتا ہے۔ انگریزوں کو منشی جی کی یہ سادگی اور جدوجہد بہت پسند آئی؛ اور انھیں انگریزی دفاتر کی اسٹیشنری کے ٹھیکے ملنے لگے۔

منشی نول کشور نے اپنے مطبع سے دنیا کی بہت سی زبانوں میں مختلف قسم کی کتابیں شائع کیں؛ جن میں عربی، فارسی، اردو، ہندی اور مذہب سے تعلق رکھنے والی کتابیں شامل ہیں۔ ہندو ہونے کے باوجود منشی نول کشور نے قرآن کی تفاسیر، احادیث کے مجموعے اور فقہ کی کتابیں جیسے سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ اور فتاویٰ عالمگیری

کے علاوہ مثنوی مولانا روم، قصائدِ عرفی، تاریخِ طبری، تاریخِ فرشتہ، دیوانِ امیر خسرو، مراثی انیس، فسانۂ آزاد، داستانِ امیر حمزہ، دیوانِ غالب، کلیاتِ غالب فارسی، الف لیلہ، آثار الصنادید (سر سید احمد خان)، قاطعِ برہان (غالب)، آرائشِ محفل، دیوانِ بیدل، گیتا کا اردو ترجمہ، رامائن کا اردو ترجمہ، بوستانِ سعدی وغیرہ جیسی بہت سی اہم اسلامی، غیر اسلامی اور ادبی کتابیں بطورِ خاص شائع کیں۔ اس سلسلے میں غالباً ان کے پریس کا سب سے بڑا کارنامہ 46 جلدوں میں داستانِ امیر حمزہ کی اشاعت ہے جسے دنیا کی سب سے بڑی داستان کہا جاتا ہے۔ اسی طرح تقریباً اٹھارہ ہزار صفحات پر مشتمل کتاب 'طلسم ہوش ربا' کی طباعت واشاعت بھی منشی نول کشور کی کتاب دوستی اور علم پروری کی بہترین مثال ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سی کتابوں کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ بھی کروایا۔

منشی جی ہندو ضرور تھے؛ لیکن وہ ہر مذہب کی عزت دل وجان سے کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ہندوؤں کی مقدس کتابوں کے ساتھ ساتھ قرآن پاک بھی شائع کیے۔ ان کے مطبع میں جب قرآن پاک کی پروف ریڈنگ کا وقت آتا؛ تو منشی جی خود وضو کرکے پروف ریڈنگ کرتے؛ اور دوسرے کارکنان کو بھی یہی مشورہ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ قرآن مجید کی طباعت کے وقت منشی جی اور مطبع کے دیگر کارکنان پاک صاف ہوکر اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر قرآن کی طباعت کے کام میں لگ جاتے تھے؛ کیوں کہ ان کے نزدیک قرآن پاک سب سے مقدس کتاب تھی؛ اس لیے وہ کوئی ایسا کام ہرگز نہیں ہونے دیتے تھے جس سے قرآن پاک کی کسی قسم کی بے حرمتی ہو۔

اسی طرح جہاں قرآن پاک کی جلد بندی ہوتی تھی وہاں کسی شخص کو حتی کہ خود نول کشور کو بھی جوتوں کے ساتھ داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ دو ایسے ملازم رکھے گئے تھے جن کا صرف اور صرف ایک ہی کام تھا کہ تمام دن ادارے کے مختلف کمروں کا چکر لگاتے رہیں؛ اور جہاں کہیں کوئی کاغذ کا ایسا ٹکڑا جس پر قرآنی آیت لکھی ہو؛ اُس کو انتہائی عزت واحترام سے اٹھا کر بوریوں میں جمع کریں؛ پھر ان بوریوں کو احترام کے ساتھ زمین میں دفن کر دیا جاتا۔ منشی نول کشور نے قرآن پاک کی طباعت و اشاعت کے وقت احترامِ قرآن کا جو معیار مقرر کیا تھا وہ کسی اور ادارے کو کبھی نصیب نہ ہوسکا، اس کے لیے منشی جی نے پہلے تو اعلی صلاحیت والے حفاظ اکٹھے کیے؛ اور ان کو زیادہ تنخواہوں پر ملازم رکھا تھا۔

ہندوؤں کی مقدس کتابیں بھگوت گیتا، رامائن اور اپنیشد بھی اُن کے مطبع میں چھپتی تھیں۔ سکھوں کی مقدس کتاب گروگرنتھ صاحب بھی اسی مطبع سے شائع ہوتی تھی۔ بھگوت گیتا، رامائن اور بہت سی دیگر کتابوں کا ترجمہ بھی اردو اور فارسی زبان میں انھوں نے کرایا تھا۔ قرآن مجید کے ترجمے بھی انھوں نے ہندی و دیگر زبانوں میں کروا کر شائع کیا تھا۔

مطبع نول کشور کے کتبِ مذکورہ کی طباعت واشاعت کی وجہ سے ایران اور افغانستان والے بھی منشی جی کی قدر کرنے لگے تھے؛ اور منشی نول کشور کے پریس کی شہرت ہندوستان سے باہر نکل کر دوسرے ملکوں میں بھی پھیل گئی تھی۔ چونکہ منشی نول کشور خود اُردو اور فارسی کے عالم تھے، اس لیے اُن کا پسندیدہ مشغلہ یا دستور تھا کہ جہاں کہیں انھیں کوئی اچھا مخطوطہ نظر آیا؛ اُسے حاصل کرکے زیورِ طباعت سے آراستہ کردیا۔

منشی جی کے مطبع کی کامیابی کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ہندوستان کی کسی بھی زبان کی کتاب اس میں شائع ہوکر نہ صرف پورے ملک میں بلکہ ملک سے باہر بھی خوشبو کی طرح پھیل جاتی تھی۔ معین اعجاز منشی نول کشور کے مطبع کی اہمیت اور شہرت بیان کرتے ہوئے ایک واقعہ لکھتے ہیں:

''1885 کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ لدھیانہ میں افغانستان کے بادشاہ امیر عبدالرحمٰن کے اعزاز میں لفٹنٹ گورنر کی جانب سے ایک دربار منعقد ہوا تھا۔ (جس میں) منشی جی کو شہزادوں سے زیادہ اہمیت دی گئی جس پر کچھ لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی، بلکہ احتجاج بھی کیا۔ اس پر لفٹنٹ گورنر نے فوراً کہا: یہ نامناسب بات آپ کچھ نہیں جانتے، اس پر آپ لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ یہ مشہور منشی نول کشور صاحب ہیں۔ شاہِ افغان نے جب ان کا نام سنا تو بڑی محبت سے پیش آئے اور بولے: کیا یہ وہی منشی نول کشور ہیں جنھوں نے جنوبی ایشیا میں علم وادب کی شمع روشن کی ہے؟ انھیں میرے پاس لے آیئے۔ جب منشی جی ان کے قریب پہنچے؛ تو بادشاہ تعظیماً کھڑے ہوگئے، پھر ان سے یوں مخاطب ہوئے: خدا کا شکر ہے، ہم نے آپ کو دیکھ لیا، ہندوستان میں جو مسرت آپ کو دیکھنے سے ہوئی، کسی کام سے نہیں۔[1]

اسی طرح معین اعجاز ایک دوسرا واقعہ بھی تحریر کرتے ہیں:

''1886 میں شہنشاہِ ایران بھی ہندوستان تشریف لائے، کچھ لوگوں نے ان سے تشریف آوری کا سبب دریافت کیا، تو انھوں نے کہا: میرے ہندوستان آنے کی سب سے بڑی غرض یہ ہے کہ منشی نول کشور اور وائسرائے ہند سے ملاقات کرسکوں۔''[2]

یہی وجہ تھی کہ مرزا غالب کو بھی منشی نول کشور سے ملنے کی خواہش ہوئی اور وہ دسمبر 1863 میں دہلی میں منشی جی سے صرف ملے ہی نہیں بلکہ منشی جی کے وفادار دوستوں میں شامل ہوگئے؛ اور مطبع نول کشور پریس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مطبع کی تعریف کرتے ہوئے ایک خط میں مرزا غالب یوں لکھتے ہیں:

''اس چھاپہ خانہ نے جس کسی کا بھی دیوان چھاپا ہے اس کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔''[3]

جب منشی نول کشور کو کسی مخطوطے یا نایاب اور قدیم نسخے کے بارے میں کسی سے معلوم ہوتا تو وہ اُس کے حصول میں ہمہ تن لگ جاتے، اور حاصل کرنے کے بعد پوری ایمانداری کے ساتھ اس کی طباعت واشاعت پایہ تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیتے تھے۔

1801 میں فورٹ ولیم کالج نے بڑے پیمانے پر اُردو کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا؛ لیکن اس فن کو منشی نول کشور نے جو ترقی دی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آسکی۔ جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

''سب سے آخر میں لکھنؤ کے اس مطبع کا نام لیا جاتا ہے جس کی زندگی اب 80 برس کے قریب پہنچ گئی ہے۔ اس سے میری مراد نول کشور کا مشہور نول کشور پریس ہے۔ یہ غدر کے بعد 1858 میں قائم ہوا؛ اور بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ مشرقی علوم وفنون کی جتنی ضخیم اور کثیر کتابیں اس مطبع نے شائع کیں۔ ان کا مقابلہ ہندوستان کیا مشرق کا کوئی مطبع نہیں کرسکتا۔ ہماری زبان کی اکثر ادبی اور علمی کتابیں اسی مطبع سے چھپ کر نکلیں؛ شعراء کے دواوین، مثنویاں، قصائد، قصے، افسانے، داستانیں اور درس کی عام کتابیں سب اسی کی کوششوں کی ممنون ہیں۔''[4]

منشی نول کشور نے اپنے مطبع میں ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا تھا؛ جس کے تحت کتابوں کو ملک کی دیگر زبانوں میں ترجمہ کرنے کا نظم تھا۔

مطبع نول کشور میں تقریباً بارہ سو کارکنان طباعتی کام کو بحسن وخوبی انجام دیتے تھے۔ تصنیفی کام کرنے والوں کو منشی جی معقول معاوضہ بھی دیتے تھے۔ اس کے علاوہ ملک کے کتب خانوں اور تدریسی اداروں کو وہ مفت کتابیں بھی فراہم کرتے تھے۔ جیسا کہ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) ماہنامہ نیا دور لکھنؤ کے منشی نول کشور نمبر کی اشاعت کے موقع پر ایڈیٹر کے نام ارسال کردہ پیغام میں تحریر فرماتے ہیں:

''عبدالرحمٰن خاں صاحب اور منشی نول کشور جب تک زندہ رہے، برابر اپنے مطبع سے چھپنے والی کتابوں کے نسخے دارالعلوم کو بھیجتے رہے، رودادوں میں نہ صرف ان کی دی ہوئی کتابوں کا ذکر موجود ہے بلکہ جا بجا ان کا

شکریہ بھی ادا کیا گیا ہے، اور لکھا ہے کہ منشی نول کشور صاحب مالک چھاپہ خانہ اعظم لکھنؤ اس امر میں زیادہ قابل شکریہ ہیں کہ باوجود بعد مسافت بہت سی کتب سے معاونت کی۔''[5]

اس کی تائید سوانح منشی نول کشور کی عبارت سے بھی ہوتی ہے، سیدامیر حسن نورانی تحریر کرتے ہیں:

''منشی نول کشور نے ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی درس گاہ کو نظرانداز نہیں کیا جو دارالعلوم کے نام سے 1866 میں قائم ہوئی تھی؛ جس کے روح رواں مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔ دارالعلوم کے نصاب میں عربی کی جو کتابیں شامل تھیں، ان میں سے اکثر دستیاب نہیں ہوتی تھیں، کیوں کہ طباعت واشاعت کا کام ابھی ابتدائی منزلوں میں تھا۔ منشی نول کشور نے مدارس اور اہلِ علم کی ضرورت کا احساس کرکے ایسی کتابوں کی طباعت شروع کردی تھی، متعدد کتابیں شائع ہو چکی تھیں، دارالعلوم کی طرف سے طلبہ کے لیے فراہمی کتب کی اپیل شائع کی گئی، بعض مطابع اور کچھ لوگوں نے بطور ہدیہ کتابیں دے دیں۔ جب دارالعلوم کی اپیل منشی نول کشور کی نظر سے گزری تو انھوں نے اپنی تمام مطبوعہ عربی کتابیں بلاقیمت بطور تحفہ پیش کردیں، جس کے لیے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے منشی موصوف کا شکریہ ادا کیا۔''[6]

اپنا مطبع قائم کرنے کے ساتھ ہی منشی نول کشور نے اپنے پہلے شوق اور دیرینہ آرزو یعنی صحافت کی طرف توجہ کی؛ اور 'اودھ اخبار' (اردو)، 'لکھنؤ ٹائمس' (انگریزی) اور 'اودھ ریویؤ' (اردو) جیسے اخبارات نکالنا شروع کردیا؛ لیکن ان میں 'اودھ اخبار' ہی ممتاز اہمیت کا حامل رہا، جو 26 نومبر 1858 کو انھیں کے مطبع سے جاری ہوا۔ جیسا کہ اس سلسلے میں ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری تحریر کرتے ہیں:

''منشی نول کشور نے بتیس برس کے سن میں 1858 میں لکھنؤ میں واقع کوٹھی مہاراجہ مان سنگھ بہادر ایک پریس 'مطبع اودھ اخبار' کے نام سے قائم کیا۔ پھر اسی سال انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار 'اودھ اخبار' کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔''[7]

یوں تو منشی نول کشور صحافت کی ابتدا 'سفیر آگرہ' سے کر چکے تھے، پھر 'کوہِ نور' اخبار سے وابستگی نے ان کی صحافتی صلاحیت کو مزید جلا بخشی، لیکن صحیح معنوں میں ان کی صحافت اُس وقت منظر عام پر آتی ہے، جب انھوں نے 'اودھ اخبار' کا آغاز کیا۔ یہاں لاہور کی صحافت کا تجربہ کام آیا؛ اور جلد ہی انھوں نے صحافت کے میدان میں اپنی دھاک بٹھا دی؛ اور 'اودھ اخبار' کو بلندیوں تک پہنچانے میں انھوں نے اپنی پوری صلاحیت صرف کردی، اور 'اودھ اخبار' کو روزانہ پہلے سے زیادہ دل کش اور خوبصورت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، بایں وجہ اودھ اخبار کا سرورق انتہائی جاذبِ نظر ہوتا تھا، اور صفحہ اول پر یہ ایک شعر بھی درج ہوا کرتا تھا۔

الٰہی جلوہ برقِ تجلی دہ زبانم را
قبول خاطر موسیٰ کلاماں کن بیانم را

منشی جی کی محنت اور کوشش کے نتیجے میں 'اودھ اخبار' نے بتدریج ترقی کے منازل اس طرح طے کرنے شروع کردیے کہ 'اودھ اخبار' پہلے پندرہ روزہ تھا، پھر ہفت روزہ ہوگیا؛ جو ہر چہارشنبہ کو شائع ہوتا تھا، بڑھتی مقبولیت کے باعث 1872 میں ہفتے میں دوبارہ طبع ہونے لگا، پھر 1876 میں سہ روزہ ہوگیا، اور 1877 میں روزنامہ ہوگیا۔ ابتدا میں 18x22 کے چار صفحات پر شائع ہوتا تھا، 1864 میں صفحات کی تعداد بڑھ کر 16 ہوگئی، اور سائز بھی 22x29 ہوگیا۔ پھر کچھ دنوں بعد صفحات بڑھ کر 48 ہوگئے۔

اودھ اخبار کے پندرہ روزہ اور روزنامہ ہونے کے بارے میں محققین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے؛ اس سلسلے میں حسن ابرار روزنامہ ہونے کی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اودھ اخبار ابتدا میں پندرہ روزہ رہا پھر ہفت روزہ رہا؛ بعد میں ہفتہ میں دو بار شائع ہونے لگا؛ اس کے بعد روزنامہ ہوگیا۔''[8]

لیکن ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری قول مذکور کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''راقم الحروف کو اودھ اخبار کی جو فائلیں 1862 سے دسمبر 1875 تک دیکھنے کا اتفاق ہوا، ان میں کوئی پندرہ روزہ یا روزانہ نظر سے نہیں گزرا۔ ان فائلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اخبار ہمیشہ ہفتہ وار ہی تھا۔''[9]

ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری کے قول مذکور کی تائید میں مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کے خطبے کا درج ذیل اقتباس بھی کافی اہمیت کا حامل ہے؛ وہ لکھتا ہے:

''یہ اخبار پچھلے سات سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ چنانچہ اس کی ہر اشاعت پچھلی اشاعتوں سے بہتر نظر آتی ہے۔ اس کی تقطیع اور صحافت کی تعداد بھی بڑھتی جارہی ہے۔ یہ اخبار ہفتہ وار ہے اور ہر چہارشنبہ کے روز شائع ہوتا ہے۔ شروع شروع میں اس میں صرف چار صفحے ہوا کرتے تھے اور وہ بھی چھوٹی تقطیع پر؛ پھر چھ ہوئے اور پھر سولہ؛ اور اب وہ اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے کے مقابلے میں اس کی تقطیع بھی بڑی ہوگئی ہے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ ضخیم اخبار ہندوستان بھر میں اور کوئی نہیں ہے۔''[10]

لیکن دیگر محققین کے مطابق 'اودھ اخبار' 1877 میں روزنامہ میں تبدیل ہوگیا تھا، اس طرح صحافتی دنیا میں اپنے معیار اور امتیازی شان کی وجہ سے 'اودھ اخبار' کو پہلے ڈیلی نیوز پیپر کا اعزاز حاصل ہے۔

منشی نول کشور نے اودھ اخبار کو ایک معیاری اخبار بنا کر پیش کیا تھا جس کے اصول انھوں نے خود متعین کیے تھے؛ یہی وجہ تھی کہ 'اودھ اخبار' کو ہندوستان اور ہندوستان سے باہر پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ کیونکہ اودھ اخبار میں اردو اخباروں سے ہی خبریں نہیں لی جاتی تھیں بلکہ گزٹ آف انڈیا، انڈین ڈیلی نیوز، فرینڈ آف انڈیا اور پائینیر جیسے انگریزی اخباروں کی خبریں اور اہم مضامین بھی ترجمہ کرواکر ''اودھ اخبار'' میں شائع کیے جاتے تھے۔

اس کے لیے منشی نول کشور نے بڑے بڑے شہروں میں کثیر تعداد میں اپنے نامہ نگار متعین کیے تھے جس کی وجہ سے ملک کی اہم ترین خبریں شائع کرنے میں اس اخبار کو اولیت حاصل ہوئی، ساتھ ہی بیرون ممالک کی خبریں بھی اس میں بروقت شائع ہوتی تھیں؛ کیوں کہ ملک سے باہر اس کے خبر نویس ایمانداری کے ساتھ اپنے کام کو انجام دیتے

منشی نول کشور نے اودھ اخبار کو ایک معیاری اخبار بنا کر پیش کیا تھا جس کے اصول انھوں نے خود متعین کیے تھے؛یہی وجہ تھی کہ 'اودھ اخبار' کو ہندوستان اور ہندوستان سے باہر پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد تھی.کیونکہ اودھ اخبار میں اردو اخباروں سے ہی خبریں نہیں لی جاتی تھیں بلکہ گزٹ آف انڈیا، انڈین ڈیلی نیوز، فرینڈ آف انڈیا اور پائنیر جیسے انگریزی اخباروں کی خبریں اور اہم مضامین بھی ترجمہ کروا کر ''اودھ اخبار'' میں شائع کیے جاتے تھے۔

تھے: نامہ نگاروں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اس زمانے میں کہا جاتا تھا کہ ہندوستان کے ہر شہر میں حکومتی کارندے رہتے ہیں یا اودھ اخبار کے نمائندے۔ بقول مولانا امداد صابری:

''تھوڑے ہی عرصہ میں ان کے اخبار نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ ملک بھر میں سچی، صحیح اور تازہ خبریں دینے کے لیے اودھ اخبار مشہور تھا۔ اس کے نامہ نگار تمام صوبوں اور ریاستوں میں پھیلے ہوئے تھے، مشہور تھا کہ ہندوستان کی مختلف راجدھانیوں میں یا تو حکومت کے نمائندے رہتے ہیں یا منشی نول کشور کے۔ اس اخبار نے منشی نول کشور کے نام کو چمکایا۔ حکومت میں بھی ان کی قدر ہونے لگی۔''[11]

اس طرح 'اودھ اخبار' پوری علمی دنیا میں اپنا نام روشن کیے ہوئے تھا اور اس نے ہندوستان کی اردو صحافت کے میدان میں ایک الگ پہچان بنالی تھی۔ عوام کو ان کے اخبار سے ملک اور بیرون ملک کی خبروں کے علاوہ رفاہ عامہ کی خبریں بھی برابر ملتی رہتی تھیں۔ ساتھ ہی اس میں سرکاری قوانین، احکامات، عدالتی کارروائیوں کی اطلاعات اور ریلوے ٹائم ٹیبل وغیرہ بھی ہوتا تھا جنھیں کبھی تو ترجمہ کروا کر اور کبھی ضرورت کے مطابق دیوناگری رسم الخط میں ہی شائع کر دیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کم عرصے میں ہی اخبار کی مقبولیت کا عالم یہ ہوا کہ اس کی تعداد اشاعت 12 ہزار تک پہنچ گئی، اور یہ نہ صرف ملک میں مقبول ہوا؛ بلکہ بیرون ملک میں بھی اس کی رسائی ہو گئی۔ چنانچہ گارساں دتاسی کو یہ اخبار مسٹر ایڈورڈ ہنری پامر بھیجا کرتے تھے۔

اودھ اخبار اُردو کا ایک مکمل اور مقبول ترین اخبار تھا؛ اور یہ صرف خبروں کے لیے مشہور نہیں تھا بلکہ اس میں بہت سے ادبی و علمی مضامین، ممتاز فارسی اور اُردو گو شعرا کے کلام، افسانے، تنقید و تبصرے اور بہت سے سرکاری اعلانات بھی شامل ہوتے تھے؛ اور ہر طرح کے موضوعات اور مضامین کا احاطہ کیا جاتا تھا؛ تاکہ ہر طرح کے لوگ اس اخبار سے مستفید ہو سکیں۔ اسی اخبار میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کا 'فسانۂ آزاد' قسط وار دسمبر 1878 سے دسمبر 1879 تک شائع ہوا، اسی طرح غالب کے خطوط اور سر سید احمد خاں کے مضامین بھی اس اخبار کی زینت بنتے رہے۔ اسی طرح منعقدہ ادبی محفلوں اور ثقافتی پروگراموں کی خبروں کو بھی اودھ اخبار کے صفحات میں جگہ ملتی تھی۔ علاوہ ازیں شہر میں جب بھی کوئی ادبی، سماجی سیاسی یا علمی شخصیت کی آمد ہوتی؛ تو منشی جی اُسے اپنے مطبع پر ضرور دعوت دیتے، اس کی حسب مرتبہ و حسب حیثیت ضیافت کا اہتمام کرتے: پھر اس کا تعارف اور اس کے پروگرام کی مفصل رپورٹ بھی اپنے اخبار میں شائع کرتے۔

منشی نول کشور کو اگر کسی کے بارے میں یہ معلوم پڑ جاتا تھا کہ یہ انسان کسی زبان کا ماہر اور ایک اچھا تجربہ کار ہے؛ یا وہ کسی مخصوص صلاحیت کا حامل ہے؛ تو اُس کو وہ بہت عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جس قدر اہل علم اور معروف ہستیاں ''اودھ اخبار'' کی ایڈیٹر ہوئیں، اُردو کے کسی دوسرے اخبار کو اب تک یہ فضیلت حاصل نہیں ہو پائی، چنانچہ 'اودھ اخبار' کے پہلے ایڈیٹر مولانا ہادی عالم شاہ اشک لکھنوی تھے؛ ان کے بعد شیو پرساد؛ پھر منشی غلام احمد تپش، منشی امیر اللہ تسلیم، سید امجد علی اشہری، منشی ہادی علی اشک، مفتی فخر الدین قدر بلگرامی، مولانا عبد المجید سحر کاکوروی، مولانا عبد الحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، نسیم دہلوی، سید جالب دہلوی، مرزا حیرت دہلوی، مرزا یاس یگانہ چنگیزی، نادر حسین نادر کاکوروی، نوبت رائے نظر، دوارکا پرشاد افق، منشی پریم چند، مولانا عبد الباری آسی، شوکت تھانوی، مرزا محمد عسکری، پیارے لال شاکر اور امین سلونوی وغیرہ جیسے نامور اور عظیم ادبا و شعرا نے یکے بعد دیگرے اس کی ادارت کے فرائض انجام دیے؛ اور ان حضرات کی صلاحیتوں نے اودھ اخبار کی بقا میں اہم ترین کردار ادا کیا۔

منشی نول کشور اپنے اخبار سے منسلک تمام افراد واشخاص کا خاص خیال رکھتے تھے؛ اُن کے غم اور خوشی میں برابر شریک ہوتے۔ کسی کے بیمار ہو جانے پر خود عیادت کے لیے جاتے؛ اس کا علاج و معالجہ کرواتے۔ امین سلونوی اُن کی ان صفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''منشی نول کشور اپنے ادارے میں کام کرنے والوں سے بڑا شاہانہ سلوک کرتے تھے۔ مثلاً سنا ہے کہ رتن ناتھ سرشار کے لیے یہ انتظام تھا کہ وہ چاندنی راتوں میں دریائے گومتی کے کنارے بیٹھ کر اپنی تخلیقات سپرد قلم کریں۔ وہاں جس چیز کی خواہش انھیں ہوتی وہ مہیا کی جاتی۔''[12]

اسی طرح اُس وقت مقالہ نگاروں اور نامہ نگاروں کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا؛ سب سے پہلے منشی جی نے اودھ اخبار کے مقالہ نگاروں کو معاوضہ دینے کی شروعات کی۔

'اودھ اخبار' ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار اور سماجی خدمات کا ترجمان تھا؛ ہندو مسلم دونوں قوموں کے تہواروں کے موقع پر خاص نمبر بڑی آب و تاب کے ساتھ نکالے جاتے تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر عبد السلام خورشید لکھتے ہیں:

''اودھ اخبار ایک خالص غیر فرقہ وارانہ اخبار تھا بظاہر ٹیپ ٹاپ سے اور مضامین دیکھ کر کچھ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے مسلمانوں کا اخبار تھا............اس کا کوئی خاص سیاسی مسلک نہ تھا ہمیشہ دامن بچا کر چلتا تھا۔''[13]

یہی وجہ تھی کہ 'اودھ اخبار' کی شہرت صرف ہندستان ہی میں نہیں تھی بلکہ اس وقت کے سپر پاور ممالک انگلینڈ و فرانس کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی اس کی ایک الگ پہچان تھی؛ اور ایک موقر اخبار کی حیثیت سے عوام میں اس کی شہرت تھی۔ اسی کے سبب 'اودھ اخبار' میں مقالہ لکھنے والوں کی کمی کبھی محسوس نہیں کی گئی، بلکہ ہمیشہ قابل اور باصلاحیت ارباب قلم کے مضامین و مقالات کا ہجوم رہتا تھا؛ جن میں سر سید احمد خان اور مرزا غالب جیسی اہم شخصیات بھی شامل تھیں۔

منشی جی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کتابوں کی طباعت اور صحافت میں صرف کیا۔ اور صرف ایک اودھ اخبار ہی نہیں بلکہ بہت سارے اخبار منشی جی نے اپنے مطبع سے شائع کیے؛ جن میں کوہ نور، پنجابی اخبار، اخبار عالم، اکمل الاخبار، وکٹوریہ اخبار، تہذیب الاخلاق، شعلہ طور، احسان الاخبار، علی گڑھ گزٹ، دبدبہ سکندری وغیرہ کا نام بطور مثال لیا جا سکتا ہے؛ لیکن دنیائے صحافت میں 'اودھ اخبار' سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

حاصل یہ کہ اودھ اخبار کے ذریعے منشی نول کشور نے تا حیات اُردو صحافت کی عظیم الشان خدمت انجام دی؛ اور اُن کا 'اودھ اخبار' 92 سال تک پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہا؛ لیکن بد قسمتی سے وارثان مطبع کے باہمی نزاع کے سبب 50-1949 میں ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

حواشی

1. ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، منشی نول کشور نمبر، ص 194
2. ایضاً، ص 194
3. ایضاً، ص 193
4. نقوش سلیمانی، ص 87، طبع اول 1939
5. ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، منشی نول کشور نمبر، ص 10
6. سید امیر حسن نورانی، سوانح منشی نول کشور، ص 178
7. ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، منشی نول کشور نمبر، ص 23۔ لیکن ڈاکٹر اکبر حیدری کی بتیس سال کی عمر میں پریس قائم کرنے والی بات درست نہیں ہے، درست یہ ہے کہ بائیس سال کی عمر میں منشی نول کشور نے لکھنؤ میں پریس قائم کیا؛ جیسا کہ تاریخ ولادت سے ظاہر ہے۔
8. ایضاً، ص 40
9. ایضاً، ص 23
10. ایضاً، ص 40
11. مولانا امداد صابری، تاریخ صحافت اُردو (جلد دوم، پہلا حصہ)، ص 112
12. ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، منشی نول کشور نمبر، ص 161
13. ڈاکٹر عبد السلام خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، ص 181

■

Sufyan Ahmad Ansari
Mohalla Nazirpura Purvi
Near: Qadir Montessori School
Bahraich - 271801 (UP)
Mob.:9839574196

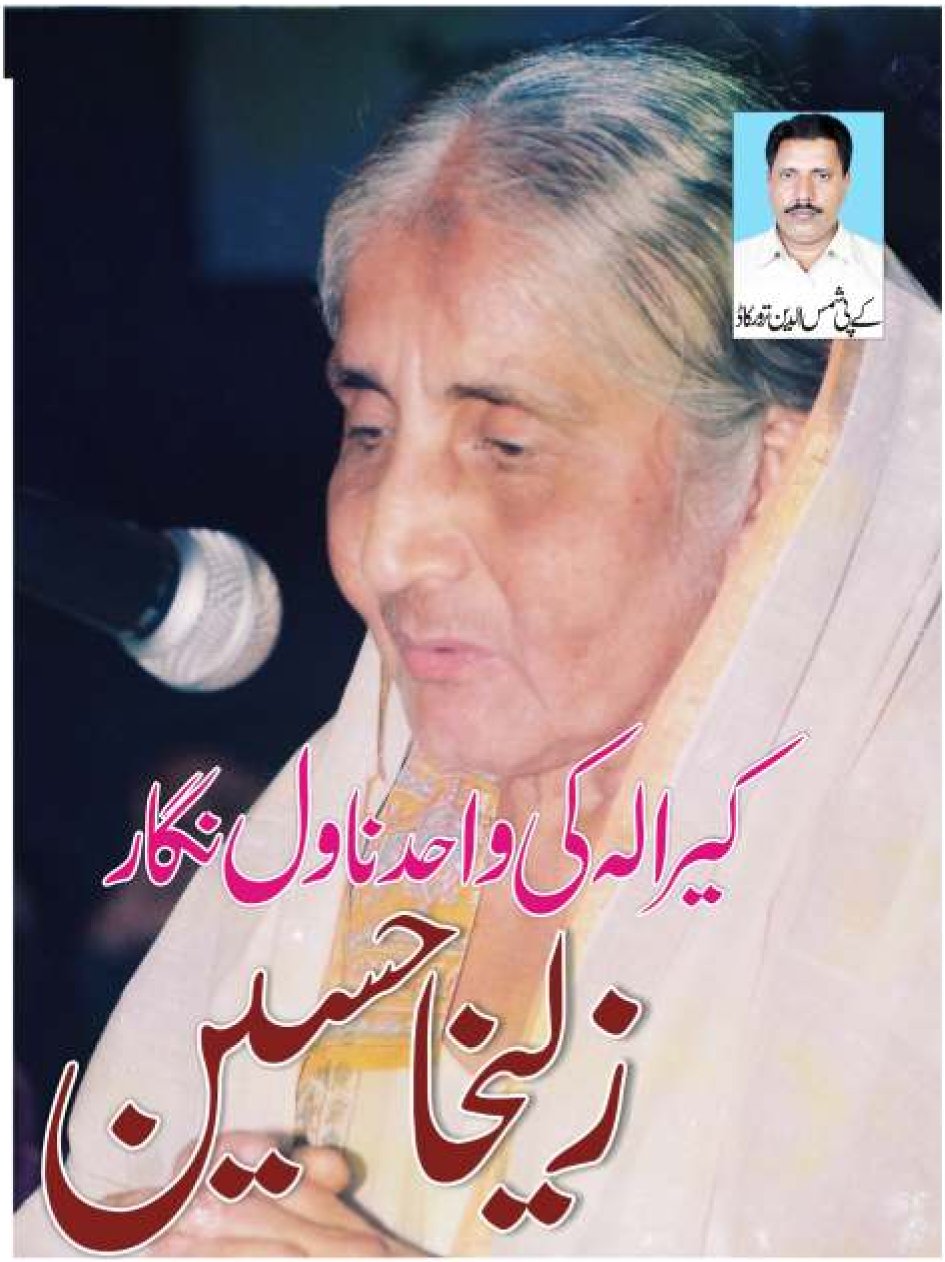

کیرالہ کی واحد ناول نگار
زلیخا حسین

کے پی شمس الدین ترورکاڈ

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ زبان اردو کو بھی ریاست کیرالہ میں ایک الگ حیثیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں مجھے یہ کہتے ہوئے بڑا فخر محسوس ہو رہا ہے کہ اردو زبان کی نشو ونما دوسری ریاستوں کی بہ نسبت یہاں بڑی تیزی سے ہو رہی ہے، لیکن اس کی ادبی ترقی دوسری ریاستوں سے پیچھے ہے۔ اس کا واحد سبب یہاں کے کسی بھی طبقے کے لوگوں کی مادری زبان اردو کا نہ ہونا ہے۔

اردو ادب کی بات کریں تو ویسے یہاں اردو کے شعرا مل ہی جاتے ہیں لیکن جب اردو فکشن کی بات آتی ہے۔ کیرالہ میں چھان بین کرنے کے بعد صرف ایک ناول نگار کے ہونے کا پتہ چلا ہے۔ جن کا نام زلیخا حسین ہے۔

زلیخا حسین 1930 میں کیرالہ کے ایک مشہور تاریخی اور ساحلی شہر کوچین میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم کوچین ہی کے ایک آسیہ بائی مدرسے میں حاصل کی۔ اسی مدرسے میں ملیالم اور عربی کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ ان دنوں کیرالہ کے مدرسوں میں پڑھانے کے لیے حیدرآباد سے اساتذہ آیا کرتے تھے۔ ان اساتذہ میں ایک رضوان اللہ بھی تھے۔ زلیخا حسین نے رضوان اللہ سے اردو میں مہارت حاصل کرلی۔ ان دنوں لڑکیوں کا گھروں سے باہر جا کر تعلیم حاصل کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ زلیخا حسین ایسے معاشرے کی پروردہ تھیں۔

زلیخا حسین کو کتب بینی کا بڑا شوق تھا۔ گھر میں رہ کر بہت ساری کتابوں کا انھوں نے مطالعہ کیا۔ اس سلسلے میں ان کو پریم چند، گلشن نندہ اور مہیندر ناتھ جیسے ناول نگاروں کے ناول پڑھنے کا موقع ملا۔

15 سال کی چھوٹی سی عمر میں ہی موصوفہ کی شادی کر دی گئی۔ شادی کے بعد ان کے شوہر نے جن کا نام حسین تھا زلیخا کو پڑھنے لکھنے کی پوری آزادی دے دی تھی۔ اس لیے زلیخا حسین کو اردو ناول، افسانے اور دوسری تخلیقات کے پڑھنے کا نہ صرف موقع ملا بلکہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں، افسانے وغیرہ لکھنے کا بھی موقع مل گیا۔ جو کچھ بھی وہ لکھ رہی تھیں وہ سب 'شمع'، 'خاتون مشرق' وغیرہ اردو ماہناموں میں شائع ہوتے رہے۔

شوہر کی طرف سے حوصلہ افزائی اور کھلی آزادی کی وجہ سے بیس سال کی عمر میں انھوں نے 'میرے صنم' کے نام سے ایک ناول لکھا جس کو دہلی کے چمن بک ڈپو والوں نے 1950 میں شائع کیا۔ یہ دور ملک کی تقسیم کی وجہ سے نازک ترین حالات سے گزر رہا تھا۔ اردو زبان پر ملک کی تقسیم کا بڑا زبردست اثر پڑا تھا۔ اردو زبان پر ساری مصیبتیں ٹوٹ پڑی تھیں۔ کئی وجوہات کی بنا پر زلیخا حسین اپنے ناولوں پر اپنا نام و پتہ لکھنے اور تصویر وغیرہ دینے سے کترا رہی تھیں۔ آزادی کے بعد زلیخا حسین نے تقریباً 28 ناول، 8 ناولٹ اور چند افسانے بھی تخلیق کیے ہیں۔ اس طرح انھوں نے کیرالہ میں اردو فکشن نگاری کی بنیاد رکھ کر اس کے آغاز میں اہم رول ادا کیا لیکن افسوس کہ اتنے سارے اردو ناولوں کی خالق اردو دنیا سے دور رہ کر گمنامی کی زندگی گزارتی رہیں۔ اس لیے انھیں ایک گمنام ناول نگار کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

عجیب بات یہ ہے کہ کیرالہ سے دور اردو دنیا کو نہ جاننے کی بات تو دور کی بات ہے ماضی قریب تک کیرالہ کے لوگوں نے بھی ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ جب 1970 میں ان کا ایک ناول 'تاریکیوں کے بعد' کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا اس وقت کیرالہ کے وزیر تعلیم سی۔ ایچ محمد کویا سے کسی نے ان کا تعارف کرایا تو انھوں نے اس ناول کا ملیالم میں ترجمہ کروا کر ملیالم کے ایک ہفت روزہ 'چندریکا' میں اس کو قسط وار شائع کروایا۔ یہ واقعہ ان کی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد یوپی اور دیگر ریاستوں سے ان کی اردو خدمات کے اعتراف میں اعزازات سے نوازنے کے لیے خطوط کے ذریعے دعوت نامہ بھیجے گئے۔ لیکن وہ کہیں بھی نہیں گئیں۔ ان سے سنا ہے کہ وہ کیرالہ سے باہر اگر کہیں گئیں تو وہ مدراس ہی ہے۔ سوائے مدراس کے انھوں نے کہیں اور کا سفر نہیں کیا۔

1989 تک وہ مسلسل لکھتی رہی ہیں۔ ان کے ناولوں کے نام یہ ہیں:

میرے صنم، آپا، صبا، اوہ بھولنے والے، پتھر کی لکیر، یادوں کے صنم، مارِ آستین، زندگی مسکرائی، آدمی اور سکے، روح کے بندھن، اپنے اور پرائے، ایک ہی ڈگر، آسمان تلے، وہ ایک فریاد تھی، رشتے کا روگ، لہولہو منجدھار، نصیب نصیب کی بات، تاریکیوں کے بعد، دشوار ہوا جینا، ایک خواب اور حقیقت، مرجھائی کلی، گر سہارے نہ ملتے، اپنا کون، کل کیا ہو، راہ اکیلی، حسرت ساحل، ایک پھول ہزار غم۔

زلیخا حسین کے ناولوں کا اسلوب نگارش کے لحاظ سے جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے ناولوں میں محاورے، ضرب الامثال اور روزمرہ کے ذریعے اپنے قارئین تک اپنی بات پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ کیرالہ میں رہتے ہوئے بھی انھیں اردو زبان پر قدرت حاصل ہے۔ ان کی زبان نہایت سلیس اور شستہ ہے۔ اسی صاف و شفاف زبان کے سہارے انھوں نے ساری انسانی زندگی کے جذبوں کو لطیف انداز میں نہایت خوش اسلوبی و فنی صناعی سے پیش کیا ہے۔ ان کے الفاظ چھوٹے چھوٹے عام فہم اور جملے سادہ اکہرے ہوتے ہیں۔ وہ مشکل الفاظ سے گریز کرتی ہیں۔ طول طویل اور بیانیہ جملے ان کی زبان کی نوک پر بھی نہیں آتے۔ ان کا اسلوب سیدھا سادہ اور رواں دواں ہے۔ ان کو یہ احساس شاید ہوگا کہ ان کے قارئین بہت کم پڑھے لکھے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے وہ نہایت سادہ اور سلیس زبان میں لکھتی تھیں۔ ان کی سادگی میں پُرکاری ہے۔ انھوں نے دیگر ناول نگاروں کی طرح اپنے کرداروں کو پیش کرنے کے لیے مبالغے سے کام نہیں لیا بلکہ حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہانی کے مناظر، مکالمے اور کرداروں کے عمل کے لیے ایسا اسلوب اختیار کیا جس میں قاری بھی زلیخا حسین کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں زلیخا حسین بحیثیت ناول نگار ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ان کے ناول اردو ادب میں قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

زلیخا حسین کا ذہن شیشے کی طرح صاف شفاف تھا جس کی جھلک ان کی تحریروں میں قدم قدم پر ملتی ہے۔ اس میں کوئی اُلجھاؤ یا پیچیدگی نہیں ملتی۔ مکالموں میں وہ عام لوگوں کی بول چال کی زبان استعمال کرتی ہیں۔ ہر فرقے اور ہر پیشے کے کردار کے لحاظ سے ان کی زبان اور لب و لہجے میں مکالموں کا اہتمام کرتی ہیں۔ زلیخا حسین کے اکثر ناول گھریلو معاشرتی ماحول کے ہی ہیں۔ ایسے ناولوں میں زلیخا حسین نہایت بے تکلفی اور بے باکی سے اپنی گھریلو اور معاشرتی زبان استعمال کرنے میں کامیاب دکھائی دیتی ہیں۔

زلیخا حسین کے ایک ناول 'آدمی اور سکے' میں واقعات کو ایسے فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ کہیں الجھاؤ نہیں ہے۔ پورا ناول قاری کی گرفت میں رہتا ہے۔ یہ ناول زبان اور اسلوب بیان کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ زلیخا حسین کے ناولوں کی خصوصیت یہ ہے کہ موصوفہ نے ایسا اسلوب اختیار کیا ہے کہ قاری ناول کو آخر تک پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اردو ماحول کی پروردہ نہ ہونے کے باوجود بھی ناول نگار کو اس بات پر پوری قدرت حاصل ہے کہ سماج کے مختلف طبقوں کی بول چال کی زبان اپنے کرداروں کے ذریعے ادا کرواتی ہیں۔

ایک اور اہم بات ان کے ناولوں کے مطالعے سے معلوم ہوتی ہے کہ وہ کیرالہ سے تعلق رکھتی ہیں پھر بھی شمالی ہند کے سماجی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس طرح ان کے ناولوں میں دہلی اور لکھنؤ کی تہذیب و تمدن کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے شمالی ہند کے ادیبوں کی تخلیقات کا کافی مطالعہ کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کیرالہ کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کو درشانے والے کوئی ناول یا افسانے اردو میں نہیں تھے۔

ناول 'نصیب نصیب کی بات' زلیخا حسین کے دیگر ناولوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ ناول کیرالہ کے پس منظر میں لکھا ہوا ناول ہے۔ اس ناول میں بہت ہی چابکدستی کے ساتھ کیرالہ کی منظرکشی کی گئی ہے۔ کیرالہ کے مشہور مقامات کولم۔ آلپی۔ ریناکلم وغیرہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے کردار کو اس ناول میں جگہ دی گئی ہے۔ مدراس کو بھی اس ناول میں اعلیٰ مقام دیا گیا ہے۔ حالانکہ ناول نگار نے اس ناول میں کیرالہ اور تامل ناڈو تہذیب کو نظر میں رکھ کر لکھا ہے لیکن اگر ہم غور سے اس ناول کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں اردو تہذیب زیادہ اور جنوبی ہند کی دراوڑی تہذیب کم دکھائی دیتی ہے۔

مجموعی طور پر زلیخا حسین کے ناولوں میں مکالمہ نگاری، منظر نگاری، اسلوب نگاری کا جائزہ لیں تو موصوفہ نے اپنی فنکارانہ چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔

اردو دبستانوں سے کافی دور کیرالہ جیسے سنگلاخ علاقے میں رہنے کے باوجود وہ اپنے کرداروں کی زبان سے وہی مکالمے ادا کراتی ہیں جو اردو کے مختلف علاقوں میں بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہی ان کے اسلوب کی خصوصیت ہے۔ یہی نہیں انھوں نے اپنے ناولوں میں سماجی زندگی کے مسائل کی اچھی اور بہترین عکاسی کی ہے۔ وہ اپنے ناولوں کی بنیاد مادی حقائق اور سماجی شعور پر قائم کرتی ہیں۔ انھوں نے براہِ راست زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں غور و فکر ہی نہیں کیا بلکہ ان کو افراد کے سماجی تناظر میں پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ناولوں میں ان کی خود کی زندگی کی چند جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

موصوفہ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد بالکل ٹوٹ سی گئی تھیں۔ ان کا بیٹا فاروق کسی حادثے میں پوری طرح زخمی ہو کر اپاہج ہو گیا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد وہ اس دنیا سے چل بسا۔ ان کی بیٹی بھی دماغی مرض میں مبتلا ہو کر وہ بھی اپنی ماں کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔ 23 سالہ ان کی پوتی بھی ٹرین حادثے میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اس طرح موصوفہ کو اپنی زندگی میں کئی صدمے اٹھانے پڑے۔ ان سارے غمگین اور دکھ بھرے حالات کے اثرات ان کی نگارشات پر جانے انجانے میں پڑنے لگے۔

لیکن افسوس کہ اردو دنیا سے جو شہرت و مقبولیت ان کو ملنی چاہیے تھی وہ نہیں ملی۔ تقریباً تمیں کے قریب ناولوں کی خالق زلیخا حسین کو اردو دنیا میں شہرت نہ ملنے اور گمنامی کی زندگی گذارنے کی سب سے بڑی وجہ ان کی دکھ بھری زندگی ہی تھی۔ اسی لیے قارئین کو بالکل اس کا علم ہی نہیں تھا کہ زلیخا حسین کون ہیں اور کہاں رہتی ہیں۔ جب اردو دنیا انھیں جاننے اور پہچاننے لگی تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ ان کی زندگی کے آخری ایام میں ان کی کچھ عزت افزائی کی گئی تھی۔ مرکزی حکومت کی طرف سے دیے جانے والے اردو زبان کی فیلوشپ کمیٹی میں ان کو شامل کیا گیا تھا۔ لیکن وہ اس کمیٹی میں کبھی نہیں جا سکیں۔ کیرالہ اردو ٹیچرز اسوسی ایشن نے ان کے اعزاز میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کر کے ان کی عزت افزائی کی تھی۔

زلیخا حسین نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ غموں میں دکھوں میں گزار کر بالآخر 15 جولائی 2014 کو کوچین میں اپنی ذاتی رہائش گاہ میں اس دارِ فانی کو خیر باد کہا۔ زلیخا حسین کے انتقال کے بعد کیرالہ میں اردو زبان و ادب کے میدان میں بہترین خدمات انجام دینے والے افراد کے لیے کیرالہ اردو ٹیچرز اسوسی ایشن کی طرف سے ہر سال ان کے نام پر ایک ایوارڈ بھی دیا جا رہا ہے۔ فی الحال ان کی خدمات پر کئی طلبا ایم فل اور پی ایچ ڈی کر چکے ہیں اور ابھی مزید تحقیق جاری ہے۔

■

Dr. K.P. Shamsuddin Tirurkad
Urdu Teacher, AM, High School
P.O: Tirurkad
Via: Angadippuram
Malappuram
Distt.: Kerala - 679321
Mob.:9847422682

خصوصی گفتگو

زبانیں محبت کا درس دیتی ہیں

ندیم راعی مرادآبادی

سعید رحمانی

صوبۂ اڈیشہ میں یوں تو اڑیا، بنگال تامل ہندی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ساتھ ہی یہاں اردو زبان و ادب کا بھی بول بالا ہے۔ جہاں اردو بولنے والوں کی آبادی بمشکل تمام 4 سے 5 فیصدی ہے یہاں اردو زبان و ادب کی بازیابی بھی ہو رہی ہے جس کے سنوارنے نکھارنے اور بقا کے لیے نجم الشعرا امجد نجمی، ڈاکٹر کرامت علی کرامت، اڈیشہ اسمبلی کے سابق ایم ایل اے پنڈت لکشمی نرائن مشرا (جنھوں نے بھگوت گیتا کا اردو میں ترجمہ کیا ہے)شیخ حبیب اللہ، خاور نقیب، مولانا ابوالقاسم، خالد العربی بالیسری، ڈاکٹر سلطان راجی، ڈاکٹر حفیظ نیولپوری، محمود بالیسری(افسانہ نگار)، زین الخیر، ڈاکٹر سیّد کفیل احمد قاسمی، مولانا محمد مسحور، ڈاکٹر نسیمہ بیگم، یوسف جمال(افسانہ نگار)، مختار راہی، کمار پرجاپتی، عبدالمجید فیضی، سیّد مصطفیٰ علی، عبدالمتین جامی، ناطق کنکوی، سیّد شکیل دسنوی، سیّد نفیس دسنوی، خالد رحیم، ارشد مینا نگری، عبدالرشید نقاد، عبدالحلیم حلیم، تحت النسا تحت، خاتون عجب، حکیم عبد الحلیم راقم، سیّد عبدالحلیم نقیب، عنایت اللہ جرار، عبداللطیف عارف، حفظ الباری حافظ سیّد نور الھدیٰ قائد، ترلوک ناتھ انجم، شمس الھدیٰ شمس، سیّدہ مصلحت، ضمیر خاں ضمیر، غلام رسول نسیم، اسماعیل شمسی، خلیل تاباں، ظہیر اللہ نور، رحمن کریم شاکر، حیدر نایاب، حافظ رفیق درد، عبدالصمد واصف، سیّد مسیح اللہ مسیح، غالب فہمی، بہار الدین ریاض کے علاوہ 'سر' کے نام سے معروف ریٹائرڈ ماسٹر صحافی ادیب، نقاد و شاعر سر سعید رحمانی (کٹک) ہیں جو اردو کے لیے ہمہ وقت سرگرم نظر آتے ہیں اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے اردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے پہلے پہل 2005 میں 8صفحات پر مشتمل اردو ہفت روزہ اخبار 'اڑیسہ' کٹک سے آغاز کیا جس نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی خاص طور سے 'گوشۂ اردو' نے ہر خاص و عام کے دل کو چھوا اور مقبولیت کے کئی آسمان سر کیے۔ دوست احباب و اردو شناس افراد نے آپ کو مشورہ دیا کہ وہ ماہ نامہ ادبی رسالہ نکالیں اور پھر اردو سہ ماہی 'ادبی محاذ' کا 2013 میں جنم ہوا جو ملک عزیز بلکہ بر صغیر میں اپنی کامیابی درج کرا رہا ہے جس کے ذریعے متعدد قلم کاروں نے مذہبی ادبی و سماجی کارگزاروں پر گوشے' کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ اب تک تقریباً 50 مخصوص گوشے منظر عام پر آکر پذیرائی حاصل کی ہے۔

میں ایک روز 'پری آنند وہار ایکسپریس' سے کاغذ قلم لے کر اڈیشہ کے معروف شہر کٹک سر سعید رحمانی کے دفتر 'ادبی محاذ' دیوان کا بازار پہنچ گیا محترم نے میرا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور میں نے اپنی آمد کی وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ میں ان سے اڈیشہ میں اردو زبان و ادب کی خدمات کے سلسلے میں انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ سر سعید رحمانی کی 85سال کی عمر ہے اور وہ اپنی سماعت کھو بیٹھے ہیں لہٰذا ان سے سوالات لکھ کر کیے گئے اور انھوں نے زبانی تمام سوالات کے جواب دیے۔

ندیم راعی مرادآبادی: صوبۂ اڈیشہ میں اردو اور اس کا مستقبل...؟

سعید رحمانی: اردو کے تعلق سے جہاں تک اڈیشہ کا سوال ہے سترویں صدی عیسوی تک اڈیشہ میں اردو تخلیقی زبان بن چکی تھی اس زمانے میں مولانا یعقوب چرخی کے پوتے خانِ دوراں سیّد محمود اڈیشہ کے صوبے دار تھے انھیں کے عہد میں مرزا عبدالقادر بیگ کا قیام کٹک میں کوئی تین سال رہا۔ مرزا غالب بھی ان کی شاعری کے معترف تھے جن کا اعتراف انھوں نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے۔

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

بہر حال اردو کا ارتقائی سفر اسی زمانے سے جاری و ساری ہے اپنے اپنے وقت میں مختلف ادیب و شاعر اردو کے ادبی سرمائے میں اضافہ کرتے رہے اور یہ سلسلہ ہردے رام جودت سے ہوتا ہوا مولوی سلطان راجی، شیخ امین اللہ چرخی، عبدالمجید بھوئیاں، محمد یوسف یوسف، معلم سنیلپوری، اشرف علی کنگی، جان محمد حازم، محمد محسن محسن اور مولوی رحمت اللہ رحمت تک دراز ہوتا چلا گیا ہے۔

ہندوستان کی آزادی کا سورج جب نمودار ہوا یہاں کی اردو شاعری بھی اپنے دورِ شباب تک پہنچ چکی تھی۔ جن شعرا نے آزادی سے پہلے شعری سفر کا آغاز کیا تھا وہ آزادی کے بعد بھی شاعری کرتے رہے اور تا حال یہ سلسلہ جاری ہے ایسے بیسیوں شعرا کی مثال دی جا سکتی ہے۔ نیز یہ بات بلا تکلف کہی جا سکتی ہے کہ اردو زبان و ادب نے یہاں کافی ترقی کی ہے یہاں کے ادیب و شاعر صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری اردو دنیا میں اپنی مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ نثری و شعری تخلیقات پر مشتمل اب تک بیسیوں مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کی پذیرائی ادبی حلقوں میں کی گئی ہے۔ نامساعد حالات کے باوجود اڈیشہ میں اردو کی پیش رفت جاری ہے اور اس کے شاندار مستقبل کی ضمانت دی جا سکتی ہے مگر شرط ہے کہ اردو والے اردو کے لیے اپنے فرائض سے کوتاہی نہ کریں۔

ن د م: آپ اردو کے مردم خیز خطۂ بنگال کے ساکن ہیں اور یہاں غیر اردو علاقے میں آ کر کس طرح اور کیسے بس گئے۔؟

س د: دراصل میرے والد محترم مرحوم مولانا فضل الرحمٰن کا شمار مٹیا برج کلکتہ (ویسٹ بنگال) کی برگزیدہ شخصیات میں کیا جاتا ہے میں ان کا سب سے چھوٹا بیٹا ہوں میری پیدائش 25 جون 1936 کو مٹیا برج میں ہوئی والد محترم کے انتقال کے بعد جب حالات ناسازگار ہوئے تو میری ساسو ماں مرحومہ مجھے مع اہلیہ اپنے ساتھ کٹک (اڈیشہ) لے آئیں اور اس طرح کٹک میرا وطن ثانی بن گیا۔

تعلیمی دور میں ہی میری دلچسپی شعر و ادب میں رہی

اور پھر ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا جب میں میٹرک میں تھا تو میری اولین نظم 'اے ننھی منی چڑیا' کے عنوان سے بچوں کے رسالے چاند ناگپور نے شائع کی۔ اس نظم کے تعلق سے خاص بات یہ ہے کہ میں نے اس پر کسی سے اصلاح نہیں لی تھی اس کے باوجود مدیر محترم حضرت طرفہ قریشی نے میری حوصلہ افزائی فرمائی اور اپنے ادارتی نوٹ میں لکھا تھا کہ اگر سعید رحمانی اپنی کوشش جاری رکھیں تو آگے چل کر اپنا نام روشن کر سکتے ہیں ان کی پیش قیاسی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی اور آج اردو ادب کے منظر نامے میں فہرست کے کسی گوشے میں میرا نام ضرور درج ہے البتہ آج بھی میں یوں کہتا ہوں۔

سعید یوں تو ہے اب اسّی برس کا لیکن
وہ اپنے حوصلے اب بھی جوان رکھتا ہے

1958 میں گریجویشن کیا درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہوکر ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر ترقی کر کے 1997 میں سبکدوش ہوا۔ جب شاعری کا باقاعدہ آغاز کیا تو حضرت امجد نجمی مرحوم اور علامہ شارق جمال ناگپوری کے تلامذہ میں شامل ہو گیا۔ مختلف رسائل واخبارات کی مجلس ادارت سے بھی وابستگی رہی اور اب خود اپنا رسالہ 'ادبی محاذ' نکال رہا ہوں.... عمر کے اس پڑاؤ پر بھی میں ابھی تھکا نہیں ہوں اور خوب سے خوب تر کرنے کی کوشش میں ہوں۔"

ن د م: آپ نظم اور نثر دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں کس طرح دونوں اصناف کو الگ الگ زمروں میں رکھتے ہیں.....؟

س د: نظم میں اوازن اور بحور کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے......اور نثر میں یہ بات نہیں، آزادی کے ساتھ جو بھی چاہے تحریر کر سکتے ہیں نہ بحر کی ضرورت نہ قافیہ نہ ردیف........؟ نثر و نظم میں یہ نمایاں فرق ہے......آج کچھ قلمکار نثر میں بھی شاعری کرنے لگے ہیں جو ردیف وقافیہ سے عاری ہے اور بحور سے آزاد......بہر حال یہ تجرباتی دور ہے آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ نثر میں کی جانے والی شاعری اہل ادب قبول کرتے ہیں کہ نہیں...؟ آج کل روایتی شاعری نہیں ہوتی جو عموماً حسن وعشق اور رخ و رخسار تک محدود ہے وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کا رجحان بھی بدلتا رہتا ہے روایت سے ہوتے ہوئے جدیدیت کے دور میں داخل ہو رہا ہے۔ آج کی شاعری زندگی کے تمام شعبوں کا محاصرہ کرتی ہے۔

ن د م: اس حقیقت کو کوئی فراموش نہیں کر سکتا کہ الفاظ اپنے اندر لا زوال قوت کا خزانہ رکھتے ہیں الفاظ کے ذریعے ادیب یا شاعر کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ جمالیاتی احساس کو فکری احساس میں تبدیل کرتا ہے الفاظ ہی کی وساطت سے یہ موقع میسر آتا ہے کہ آرٹ وکلاسیکی رچاؤ اس کے اندر پیدا ہوا ہے الفاظ ہی کی مدد سے ایک لطیف و نازک سانچے میں ڈھل کر غیر پختہ و جمالیاتی احساسات کو الگ الگ دیکھا جا سکتا ہے اور یہ فنی اسلوب آپ کی تخلیقات میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

س د: تقریباً 250 مضامین برصغیر کے مختلف ادبی رسالوں واخبارات کی زینت بن چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے۔ علاوہ ازیں پانچ مجموعہ منظوم ونثری جن میں پہلا 'روشن عبارت' (نعتوں وغزلوں) دوسرا، رحمتوں کے سائبان (نعتیہ) تیسرا 'فاصلوں کا موسم' (غزلیہ) چوتھا 'دربار مصطفےٰ میں' نعتیہ اور پانچواں 'نقطۂ نگاہ' جو مضامین پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ کئی کتابیں زیر ترتیب ہیں جن میں مضامین، کتابوں پر تبصرے اور شعری سرمایے شامل ہیں۔

ن د م: آپ کے یہ اشعار جو وقت کو آئینہ دکھاتے ہیں ہر عام وخاص کے زبان زد ہیں اگر میں یہ کہوں کہ یہ اشعار آپ کی پہچان ہیں تو مبالغہ ہر گز نہیں۔ آپ کی اس غزلیہ شاعری کا اچھوتا انداز کیا نعتیہ شاعری پر بھی اثر انداز ہے۔؟

میرے عقب میں مرے دوست ہیں سبھی لیکن
پریشاں ہوں کہ یہ پتھر کدھر سے آئے ہیں
لفظوں کو اپنے تول کر جب تک نہ دیکھ لوں
اس وقت تک زبان کو میں کھولتا نہیں

اور یہ کہ۔

میرے رفیق مجھ سے ناراض ہو رہے ہیں
لفظِ غزل کو تیکھا انداز دے رہے ہیں

س د: دراصل نعتیہ شاعری کے لیے شعری بصیرت، ادبی شعور اور بے پناہ عقیدت، والہانہ جذبہ وکیف درکار ہوتا ہے۔ اور دیوانگیِ رسولؐ بھی.....الحمدللہ ان تمام جذبوں سے میں معمور ہوں اور میری نعتیہ شاعری بھی اسی جذبے اور شوق سے پڑھی اور سراہی جاتی ہے جس جذبے وذوق سے غزلیہ شاعری... نعت کے دو تین شعر ملاحظہ فرمائیں۔

ہے بادباں پہ لکھا کلمۂ رسول اللہ
میرے سفینے کو طوفاں سلام کرتے ہیں
سجی ہیں ہونٹ کے ساحل پہ قندیلیں درودوں کی
میرے دل کے ورق پر جب سے اُن کا نام روشن ہے
انھیں آواز دی ہے دھوپ کے صحرا میں جب میں نے
تو سر پہ چھائی رحمت کی گھٹا آہستہ آہستہ
ہے میرے پیش نظر جب سے نبیؐ کی سنت
اپنے دشمن کو بھی میں دل سے دعا دیتا ہوں

ن د م: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہی ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہیں۔؟

س د: اردو کے ادارے زبان پر بے شک توجہ دے رہے ہیں اردو کتابیں بھی کثرت سے شائع ہو رہی ہیں جس کی خاص وجہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وادب اور اردو اکادمیوں کے ذریعے کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی تعاون ہے۔

ن د م: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے۔ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے۔؟

س د: اردو کا چہرہ مسخ ہونے کی کوئی مثال میری نظر سے نہیں گزری البتہ املا، میں کچھ تبدیلیاں نظر آنے لگی ہیں مثلاً پہلے لفظ لئے لکھا جاتا تھا اب "لیے" لکھا جاتا ہے۔ اس نوعیت کی متعدد تبدیلیاں 'املا' میں ہو چکی ہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔

ن د م: دیار غیر میں اردو زبان وادب کی صورت حال...؟

س د: مغربی ممالک میں اردو فروغ پا رہی ہے یونیسکو کی رپورٹ کے مطابق 450 ملین افراد اردو جانتے ہیں۔ مغربی ممالک میں اردو کی بستیاں ہیں اور سب سے پرانی لندن کی ہے۔ زبانیں محبت کا درس دیتی ہیں زبانیں تفرقہ نہیں سکھاتیں بلکہ ایک دوسرے کو قریب لاتی ہیں۔ ہندوستانی جب بولی جاتی ہے تو ہندوستانی ہوتی ہے اور اسے جب تحریر کیا جاتا ہے تو اردو ہوتی ہے۔""'دراصل اردو کو عالمی مقام ڈاکٹر علامہ اقبال کی فکر انگیز شاعری نے دلایا جن کی اردو تخلیقات کو 42 زبانوں میں ترجمہ کیا گیا مزید یہ کہ آج دنیا میں جدید ٹکنالوجی، اخبارات ورسائل کے ذریعے اردو زبان عوام سے رشتہ قائم رکھنے میں کامیاب ہوئی ہے اور اردو کی گلوبل پیمانے پر مانگ بڑھی ہے لہٰذا نئی نسل کو اردو لکھنے بولنے کے لیے بھر پور حمایت ملتی رہی ہے اردو کا دیار غیر میں فروغ پانے کا بین ثبوت یہ ہے کہ ایشیا کے زیادہ تر ممالک سے اردو اخبارات و رسائل شائع ہو رہے ہیں، ممالک خلیج، انڈونیشیا، ملیشیا، سنگاپور، ماریشس، سعودیہ عربیہ میں وہاں کی زبان کے بعد اردو زبان ہی از حد مقبول ہے۔ برما تھائی لینڈ، ترکی، مصر کی یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ کناڈا، جاپان، جرمن و یوروپین ممالک کے مقامی باشندے اردو سیکھنے کو اولیت دے رہے ہیں۔

■

Nadeem Raee Moradabadi
198, Chaudhry House, Galshaheed
Moradabad-244001 (UP)
Mob.: 8188937127
Email : nadeemraee@gmail.com

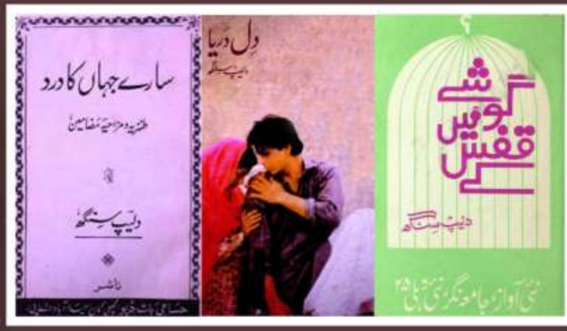

محمد امین نجار

دلیپ سنگھ بحیثیت مزاح نگار

دلیپ سنگھ طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ طنز و مزاح نگاری کے علاوہ ڈرامہ نگاری اور ناول نگاری میں بھی موصوف کو کمال حاصل تھا۔

دلیپ سنگھ کا جنم 2 جنوری 1932 کو گوجرانوالہ (موجودہ پاکستان) میں ہوا۔ ابتدائی تعلیم گھر اور گاؤں کے مقامی اسکول سے حاصل کی۔ ابھی 15-14 سال کے ہی تھے کہ ملک تقسیم ہوگیا اور دلیپ سنگھ گوجرانوالہ سے ہجرت کرکے دہلی میں آباد ہوگئے۔ ہجرت کے بعد بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور دہلی یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ابتدائی دور میں روزگار کے مسائل درپیش آئے۔ روزگار کے سلسلے میں مختلف کام کیے اور روزگار کے سلسلے میں بیرون ملک بھی گئے۔ 1984 میں آسٹریا میں سرکاری ملازمت کی میعاد پوری کرکے ہندوستان لوٹے۔ ہندوستان واپسی پر محکمہ وزارتِ خارجہ، ہند میں نوکری پانے میں کامیاب ہوگئے اور وزارتِ خارجہ کے ماہنامہ 'انڈیا پرسپیکٹیوز' کے چیف ایڈیٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ قابل ذکر ہے کہ یہ جریدہ نو زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ اردو ایڈیشن کو 'ہندوستانی تناظر' کے نام سے شائع کیا جاتا تھا۔ آخر کار 8 اگست 1996 میں دہلی میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کرگئے۔

دلیپ سنگھ کو بچپن سے ہی کتب بینی کا شوق تھا جس کے نتیجے میں 22 سال کی عمر میں ان کا پہلا مضمون شائع ہوا۔ رسائل میں لکھنے سے کچھ حاصل نہ ہونے کی وجہ سے دلیپ سنگھ جلد ہی ریڈیو اور ٹی وی سے وابستہ ہوگئے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے لکھے گئے ڈراموں کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ دوسو سے زائد بتائے جاتے ہیں۔ ان کے تحریر کردہ مندرجہ ذیل ٹی وی سیریل بہت مقبول ہوئے۔

تصویر کا دوسرا رخ، دل دریا، یہ دنیا غضب کی، دوسرا کیول، اپنی اپنی بنسی اپنا اپنا راگ، میرے تمھارے

1984 میں فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسین کے زور دینے پر دلیپ سنگھ دوبارہ طنز و مزاح کی طرف راغب ہوئے۔ جس کے نتیجے میں ان کے مندرجہ ذیل تین طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعے منظر عام پر آئے۔

1. سارے جہاں کا درد، مئی 1990، حسامی بک ڈپو، حیدرآباد
2. گوشے میں قفس کے، جنوری 1992، نئی آواز، نئی دہلی
3. اپنا کندھا اپنی لاش

طنزیہ و مزاحیہ مضامین کی کتب کے علاوہ دلیپ سنگھ کی مندرجہ کتب بھی شائع ہوئیں:

1. دل دریا، ناول 1992

دل دریا تقسیم وطن کے پس منظر میں لکھا گیا ناول ہے۔

2. موم کی گڑیا، ڈرامہ 1992
3. آوارگی کا آشنا، سفرنامہ 1994

اردو کے علاوہ ہندی اور پنجابی میں بھی ان کی کتب شائع ہوئیں:

1. جنم دن کی تلاش (ہندی میں ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
2. نہاتی دھوتی رہ گئی (پنجابی میں ان کے ڈراموں کا مجموعہ)

اس کے علاوہ دلیپ سنگھ نے انتخاب مضامین فکر تونسوی 1988 میں مرتب کی۔

دہلی یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا۔

دلیپ سنگھ کی امتیازی خصوصیت ان کی سادگی ہے۔ وہ سیدھے سبھاؤ سے بھی مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ اپنی تخلیق کی کہانی دلیپ سنگھ اس طرح سناتے ہیں:

"میرے اندر جب کوئی مضمون جنم لیتا ہے تو وہ مجھے پریشان نہیں کرتا کہ مجھے جلدی سے باہر نکال۔ وہ کہے بھی تو میں اس کی سنتا نہیں، لیکن اس کے خیال سے غافل نہیں رہتا۔ سوچتا رہتا ہوں کہ اس کی شکل وصورت خوبصورت بنانے کے لیے کیا ہتھکنڈے استعمال کروں چنانچہ میں اُسے اپنے خیالوں میں بھیس جاتا سنوارتا رہتا ہوں۔ جب سمجھتا ہوں کہ اس کی شکل وصورت ڈھنگ کی بن گئی ہے تو پھر اُسے جنم دیتا ہوں۔" (ماہنامہ 'آجکل' نئی دہلی، مئی 1992، ص 43)

دلیپ سنگھ کی پہلی مزاحیہ کتاب 'سارے جہاں کا درد' میں مضمون 'معذرت نامہ' میں انھوں نے تبصرہ نگاری کے اچھے گوشوں کو اُبھارا ہے اور موجودہ دور میں تبصرہ نگاروں کی تبصرہ نگاری پر ضرب لگائی ہے کہ وہ کس طرح کتاب کے ساتھ آئے ہوئے برفی کے ڈبے سے خوش ہوکر ممدوح کی بے جا تعریف میں مبالغے سے کام لیتے ہیں جب کہ وہ اس قابل نہیں ہوتے۔ اس ضمن میں اُن کا یہ اقتباس دیکھیے:

"جب مرزا صاحب اپنی کتاب میرے پاس تبصرے کے لیے لائے تھے تو ساتھ ہی برفی کا ایک ڈبہ بھی لائے تھے، برفی بڑی اعلیٰ قسم کی تھی ہوسکتا ہے کہ اس کی خوشبو نے کتاب کے بارے میں رائے میں مداخلت کی ہو۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ اچھے جہیز کے ساتھ ایک معمولی لڑکی ایک اچھی دلہن بن جاتی ہے اور ساس سسر کے علاوہ دلہا میاں کو بھی خوبصورت لگنے لگتی ہے۔ تبصرہ نگاری میں اگر مجھ سے کچھ غلطی ہوئی ہے تو محض برفی کی وجہ سے۔"

(سارے جہاں کا درد، ص 17-16)

مضمون 'ہم جو اپنی شرافت میں مارے گئے' میں دلیپ سنگھ نے شریف لوگوں کی حالتِ زار کا جائزہ لیا ہے کہ وہ اخلاق اور شرافت کے مارے دوسروں کی دل شکنی نہیں کرتے اور خود نقصان اُٹھا لیتے ہیں۔ اس مضمون میں ایک پروفیسر (ایم اے، پی ایچ ڈی) کی بیوی کو اکثر شکایت رہتی ہے کہ جب وہ رشتے داروں اور دوستوں کی

تیمارداری کے سلسلے میں سنگترے، کیلے اور موسمیاں وغیرہ اُن کے گھر پہنچا چکے ہیں تو اُن کے گھر فروٹ کیوں نہیں آتا۔ خدا کی کرنی ایک دن پروفیسر صاحب زکام میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور بیوی اسے اپنی دعاؤں کا صلہ سمجھتی ہے اورفوراً اپنے رشتے داروں اور دوستوں کو ٹیلی فون اور خطوط کے ذریعے مطلع کردیتی ہے کہ صاحب بیمار ہوگئے ہیں تو لوگوں کی قطار بن جاتی ہے۔ چونکہ ہندوستان کا ہر شخص خود کو ڈاکٹر تصور کرتا ہے اس لیے جو شخص بھی پروفیسر صاحب کی عیادت کے لیے آتا تو کوئی نہ کوئی نسخہ یا علاج ضرور بتاتا۔ اپنی موجودگی میں ہی اس پر فوراً عمل کرنے کو کہتا تو پروفیسر صاحب نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی شرافت کی وجہ سے خاموش رہ کر اُن کے بتائے ہوئے نسخوں کا استعمال کرتے رہے۔ مرض بڑھ کر مہلک بیماری کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور انتقال کرجاتے ہیں۔ اس سلسلے میں دلیپ سنگھ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ زکام تو اپنی جگہ قائم رہا لیکن مجھے گردے کا درد ہوگیا پتھری ہوگئی۔ جوڑوں میں درد ہونے لگا۔ نبض کی رفتار دھیمی پڑگئی اور دماغ میں خشکی ہوگئی۔ مطلب یہ کہ میری ننھی سی جان پر وہ آفتیں نازل ہوئیں کہ خدا کی پناہ۔ ان حالات میں میری جان نکلی نہیں بلکہ میری روح میرے جسم سے جان چھڑا کر بھاگی اور میں نے مرنے کے بعد سکھ کا سانس لیا۔''

(سارے جہاں کا درد، ص،22)

طنز ومزاح کو ایک نہایت ہی نازک صنف تصور کیا جاتا ہے۔ اس صنف میں طبع آزمائی کرتے وقت مصنف کو اس کے ساتھ پوری طرح سے ہم آہنگ ہونا پڑتا ہے دلیپ سنگھ نے اس میں طبع آزمائی کرتے وقت بڑی برجستگی یعنی سادگی سے کام لیتے ہوئے طنز ومزاح کے کامیاب رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ان کے مضمون 'جن کی واپسی' کا یہ اقتباس دیکھیے جس میں زبان وبیان کی سادگی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سیاسی نظام کو ہدف طنز بنایا گیا ہے۔

''میں نے کہا۔ ''حضور پھر کبھی سہی''۔ جن کہنے لگا:

''کیا میں سرکاری کلرک ہوں جو فائل کو پینڈنگ رکھ لوں۔ مجھے ابھی اسی وقت تیرے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ بول کیا کروں۔ اگر چاہے تو میں تجھے منسٹر بنا سکتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھ سے منسٹری کیسے ہوگی۔ حکومت کو چلانا کوئی معمولی کام تو نہیں۔'' جن ہنسا اور کہنے لگا:

''اے بھولے انسان، حکومتیں کیا منسٹر چلاتے ہیں منسٹر تو فقط اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ اپنے چند رشتے داروں اور دوست یاروں کی زندگی میں رنگ بھر سکیں۔''

(سارے جہاں کا درد، ص 34-33)

اس مضمون میں ہندوستانی بیوہ کی خستہ حالی اور امریکی بیوہ کی خوشحالی کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

'گوشے میں قفس کے' دلیپ سنگھ کی دوسری طنزیہ ومزاحیہ کتاب ہے اس میں مضمون 'جوس کا گلاس' میں دلیپ سنگھ نے اُن نام نہاد لیڈروں کے کردار پر روشنی ڈالی ہے جو محض لالچ کے لیے وزیر اعظم کے دفتر کے باہر عوام کی مانگوں کے حق میں بھوک ہڑتال کرتے ہیں جس سے انھیں شہرت بھی ملتی ہے اور معاشی امداد بھی۔ اس مضمون میں مصنف نے ایک کردار کو پیش کیا ہے جو اپنی ضروریاتِ زندگی مانگ کر پوری کرتا ہے اور جب اُسے جوس پینے کی خواہش ہوتی ہے تو بھوک ہڑتال پر بیٹھ جاتا ہے کیونکہ بھوک ہڑتال ختم کرانے کے لیے سنگترے کا جوش پلانے کا طریقہ رائج تھا۔ دلیپ سنگھ اس واقعہ کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

''میں جانتا ہوں کہ کوئی وزیر اعظم سارے ہندوستان کے لوگوں کو نوکری نہیں دلا سکتا۔ لیکن کوئی وزیر اعظم یہ بھی نہیں چاہتا کہ میرے جیسا کوئی من چلا بن آئی موت مرجائے۔ اس لیے ابھی وزیر اعظم کے گھر سے کوئی چھوٹا موٹا کرم چاری آئے گا۔ مجھے سمجھائے گا کہ ہم آپ کی مانگیں پوری کرنے کی پوری کوشش کررہے ہیں اس لیے بھوک ہڑتال ختم کردیجیے۔ میں مان جاؤں گا۔ پھر وہ ایک بڑے گلاس میں سنگترے کا جوس لے کر آئے گا کہ بھوک ہڑتال کو ختم کرانے کا یہی طریقہ رائج ہے۔'' (گوشے میں قفس کے، ص38)

'اپنا کندھا اپنی لاش' میں دلیپ سنگھ بڑے شہروں کی مصروفیات اور تنگ جگہ کا رونا روتے ہیں کہ دفنانے اور نذر آتش کرنے کے لیے آدمی نہیں ملتے اور نہ ہی جگہ ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ موجودہ بھیڑ بھاڑ سے مصروف اور تیز رفتار سماج میں وہ دن دور نہیں جب یا تو قبرستان اور شمشان میں پہلے بکنگ کرنی پڑے گی۔

''میں نے کلرک بھیج کر چکرورتی کا کام کروادیا۔ لیکن میرے دل میں ایک وسوسہ سا بیٹھ گیا کہ جب ہمارا شمشان جانے کا وقت آئے گا اور اگر کسی وجہ سے کلرک نہ ملے تو ہماری لاش شمشان کیسے پہنچے گی۔'' (گوشے میں قفس کے، ص67)

مضمون 'رنگ لائے گی ہماری پیش لفظی ایک دن' میں دلیپ سنگھ نے بتایا ہے کہ سہرے اور پیش لفظ میں بہت سی باتیں مشترکہ ہوتی ہیں:

''کیونکہ سہرے سننے اور پڑھنے والے دولھا کے رشتے دار اور یار دوست ہوتے ہیں اور سب کو پتہ ہوتا ہے کہ سہرا نویسی میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن پیش لفظ لکھنے والوں کو خطرہ درپیش رہتا ہے کہ ہوسکتا ہے اس پیش لفظ کو مصنف اور اس کے رشتے داروں کے علاوہ کوئی قاری بھی پڑھ لے۔ اس لیے کہنا تو اسے وہی پڑتا ہے جو سہرے میں کہا جاتا ہے لیکن کچھ اس طرح سے کہ اس پر ہجو کا گمان ہو۔'' (گوشے میں قفس کے، ص136)

دلیپ سنگھ نے جہاں بھی اپنی تحریروں میں عوامی زندگی کی تصویر کشی ہے وہاں اُن کی تنقیدی وادبی بصیرت کی جھلک بھی جگہ جگہ ملتی ہے۔ اس طرح دلیپ سنگھ کی ادب نوازی ان کے بیشتر مضامین میں نمایاں ہے۔ انھوں نے طنز ومزاح دونوں کو فنی مہارت سے استعمال کیا ہے۔ ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ظ۔ انصاری رقمطراز ہیں:

''آپ کی تحریر میں جو بے تکلفی ہے، قدرتی پن ہے، زیر لب تبسم بھی گویا اوروں کی خاطر۔ مزاح کے اندر سے ہلکی سی لکیر طنز کی پھوٹتی ہے اور سچویشن کے سادہ بیان میں جو پٹ آپ سرسوں کی ملا دیتے ہیں۔ ان صفات کی بدولت آپ کے ہاں نہ صرف تازگی، مٹی کی سوندھی مہک اور پنجاب کے آب ونمک کا مزہ ملتا ہے بلکہ یہ مزہ اوروں سے، میرا مطلب ہے کہ ہم قلم عزیزوں سے جُدا بھی کرتا ہے۔'' (گوشے میں قفس کے، ص7)

دلیپ سنگھ عصر رواں میں طنز ومزاح کی ایک بلند آہنگ شخصیت ہے جس کا منفرد اسلوب تابناک مستقبل کا ضامن ہے۔ ان کے تعلق سے ڈاکٹر مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''گذشتہ آٹھ دس برسوں میں دلیپ سنگھ نے جس برق رفتاری کے ساتھ طنز ومزاح کے میدان میں پیش رفت کی ہے اس سے بڑی امیدیں بندھتی ہیں، ان کی تحریروں میں طنز ومزاح کا نہایت لطیف اور متوازن امتزاج ہے اور سماج کے بہت سے گھناؤنے ناسوروں پر نشتر زنی کا فریضہ دلیپ سنگھ کے قلم نے انجام دیا ہے۔''

(آزادی کے بعد دہلی میں طنز ومزاح، ص26)

بالآخر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دلیپ سنگھ کے موضوعات وکردار اُن کی زندہ دلی اور خوش اخلاقی کے مظہر ہیں۔ اُن کے مضامین میں بوریت نام کی کوئی چیز نہیں۔ اُن کی قوتِ مشاہدہ نہایت تیز اور نفسیاتی مطالعہ بہت عمیق ہے۔ جس کی وجہ سے موضوع کے حقائق اور جزئیات پر اُن کی گہری نظر پڑتی ہے۔ ان کو اس انداز سے بے نقاب کرتے ہیں کہ قاری بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ دلیپ سنگھ کے مزاح کی سطح بلند ہے۔ طنز وظرافت کے متوازن امتزاج کے باعث ان کی تحریریں بالعموم پُرلطف ہیں۔ وہ زبان وبیان میں سادگی کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

■

Dr. Mohammad Amin Najar
R/O, Arwani Bijbehara
Anantnag- 192232 (J&K)
Mob.:7006028384
Email.: mohdamin170@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کر کے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

مسلم حکومت کے دوران ہندوستان میں علم کا فروغ (مسلمانوں کے ذریعے)

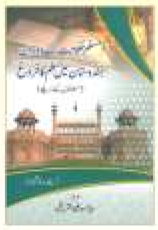

مصنف: نریندر ناتھ لا

مترجم: سید مسرور علی اختر ہاشمی

صفحات: 179، قیمت: 110 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: امتیاز احمد علیمی، S-2/5A، تیسری منزل فاطمہ اپارٹمنٹ، جوگابائی ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی

نریندر ناتھ لا ایک معروف مورخ تھے انھوں نے ہندوستانی تاریخ کا مطالعہ بہت ہی باریک بینی سے کیا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ، تہذیب وتمدن، قدیم اور جدید طرز تعلیم، ہندو راجاؤں اور مسلم دور حکومت دونوں کا اپنی تاریخی کتابوں میں جائزہ لیتے ہوئے انھیں اصل ماٰخذ کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی بیشتر کتابیں انگریزی زبان میں ہیں۔ ان کی ایک اہم کتاب Promotion of learning in India during Muhammadan rule (by Muhammadans) ہے جس کا ترجمہ سید مسرور علی اختر ہاشمی نے اردو زبان میں ''مسلم حکومت کے دوران ہندوستان میں علم کا فروغ (مسلمانوں کے ذریعے) کے نام سے کیا ہے۔ اس کتاب میں ہندوستان میں مسلم دور حکومت میں جس طرح علم کی شمع روشن کی گئی تھی اس کو تاریخی حوالوں سے پیش کرنے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔ علم کے فروغ اور اس کی توسیع کے سلسلے میں مسلمان بادشاہوں، امرا اور دیگر ہندوستانیوں نے جو کوششیں کی ہیں ان سب کا اجمالی جائزہ اس کتاب میں لینے کی کوشش کی گئی ہے اور تاریخی اعتبار سے یہ دکھانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ مسلم حکمرانوں، فرمانرواؤں، شہنشاہوں کی لمبی قطار محمود غزنوی سے بہادر شاہ ظفر تک کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو علم و ادب سے غافل رہا ہو، سب نے علم و ادب کی اپنے اپنے طور پر توسیع کرنے کے ساتھ اس کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کتاب کے لکھنے میں جن مستند تاریخی حوالوں، شواہد اور اصولوں کو بنیاد بنایا ہے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'میں نے یہ اصول اپنایا ہے کہ جہاں ایک ہی حقیقت مختلف مصنفوں نے مختلف ماخذوں کی بنیاد پر بیان کی ہے، اس پر اعتبار کر لیا جائے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ وہ حقیقت انھیں مصنفوں کے زمانے میں درج کی گئی ہو... میں نے نہ صرف یوروپین اور ہندوستانی مصنفوں کے حقیقی ذرائع اور ان کے ترجموں کو استعمال کیا ہے بلکہ بہت سے عربی، فارسی اور اردو مسودوں اور مطبوعہ متنوں کو لائبریری آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال اور بوہر کلیکشن آف دی کلکتہ امپریل لائبریری سے بھی

استفادہ کیا ہے جیسا کہ فہرست کتب سے ظاہر ہے۔' اس طرح اس کتاب میں پیش کردہ معلومات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک معتبر کتاب ہے جس میں مسلم فاتحین کے ذریعے علم وادب کے فروغ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

'حصہ اول مغلوں سے پہلے کا دور' کے عنوان سے ہے جس میں کل آٹھ ابواب ہیں۔ پہلا باب 'غزنی کا شاہی خاندان' کے نام سے ہے۔ اس میں جن مسلم فاتحین کی علمی کاوشوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سلطان محمود غزنوی اور ان کے جانشین شامل ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کو ہندوستان پر سترہ بار حملے کی وجہ سے ایک بت شکن کی حیثیت حاصل رہی ہے لیکن وہ علم اور اہل علم کا کس قدر قدرداں تھا اس کا اندازہ گزیدہ کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہر سال چار لاکھ دینار اہل علم اور شاعروں کو عطا کرتا تھا صرف یہی نہیں بلکہ اس نے علم کی مستقل ترقی کے لیے ادارے بھی کھولے تھے، جس میں عنصری جو ایک بڑا سائنس داں تھا جو مختلف علوم فنون میں دسترس رکھتا تھا اس کو غزنی کے دارالعلوم میں علمی شعبے کا صدر مقرر کیا گیا تھا۔ اسی طرح محمود کے جانشین مسعود نے بھی اپنے والد کی اس علمی روایت کو زندہ رکھا جو اس نے قائم کیا تھا۔

دوسرا باب 'غور کا شاہی خاندان' کے عنوان سے ہے۔ علم وادب کی جو ترقی سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کے دور میں ہوئی وہ غور کے شاہی خاندان میں کم دیکھنے کو ملتی ہے، علمی وادبی اعتبار سے اسے ایک تاریک دور کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہ عہد قتل وغارت گری، طویل جنگ وجدال اور شورش کا عہد رہا ہے۔

تیسرا باب 'غلام شاہی خاندان' کے نام سے ہے۔ غور خاندان کے جانشین غلام خاندان ہوئے غلام خاندان کے بانی قطب الدین ایبک نے چونکہ اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت نیشاپور کے ایک مدرسے میں حاصل کی تھی جہاں وہ عربی اور فارسی کا ماہر ہو گیا تھا، لیکن تعلیم وتعلم کے شعبے میں غلام خاندانوں میں قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، سلطانہ رضیہ، ناصرالدین، بلبن اور اس کے بیٹے کیقباد نے جو کچھ خدمات انجام دی ہیں ان کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھا باب 'خلجی شاہی خاندان' کے عنوان سے ہے۔ اس میں جلال الدین خلجی اور علاؤ الدین خلجی کے عہد حکومت میں جو بھی محلات، مساجد، مدرسے وغیرہ بنے جن میں اہل علم رہتے تھے ان کی جو بھی تھوڑی بہت علمی وادبی خدمات ہیں ان کا بھی تفصیلی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

پانچواں باب 'تغلق شاہی خاندان' ہے۔ اس میں غیاث الدین تغلق، محمد تغلق، فیروز تغلق وغیرہ کی علمی وادبی کاوشوں اور ان کی سرپرستی میں مختلف علوم وفنون کے ساتھ علم وادب کے شعبے میں جس طرح کی ترقی ہوئی اور اس کا فروغ ہوا اس کا تفصیلی احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چھٹا باب 'سید شاہی خاندان' کے نام سے ہے، اس میں صرف دو سید بادشاہ، یعنی خضر خاں جن کے نام پر خضر آباد ہے اور دوسرے مبارک جو اپنے مبارک آباد کو مکمل کرنے میں قتل ہو جانے کی وجہ سے زندہ نہیں رہے، ان دونوں کے سلسلے میں بہت ہی کم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

ساتواں باب 'لودھی شاہی خاندان' کے نام سے ہے جس میں بہلول لودھی اور ان کے بیٹے سکندر لودھی کی علمی، دینی اور اسلامی علوم وفنون کے فروغ میں جو نمایاں خدمات ہیں ان کا احاطہ کیا گیا ہے۔

آٹھویں باب جس کا عنوان 'چھوٹی مسلم بادشاہتیں' ہے، اس میں بہمنی سلطنت جسے علم وادب کے فروغ میں نمایاں حیثیت حاصل ہے، اسی عہد میں اردو زبان وادب کے ابتدائی نقوش ملنے لگتے ہیں اس کے بعد بیجاپور کی سلطنت، احمد نگر کی سلطنت، گولکنڈہ کی سلطنت، مالوہ کی سلطنت، خاندیش کی سلطنت، جونپور کی سلطنت، ملتان، سندھ، کشمیر اور گجرات، بنگال وغیرہ میں جس طرح علمی وادبی کارنامے مسلم فاتحین اور حکمرانوں کے ذریعے انجام دیے گئے ان سب کا مفصل ذکر اس باب میں کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ 'مغلوں کا دور' کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں کل چھ ابواب قائم کیے گئے ہیں جن میں پہلا باب 'مغل شاہی خاندان' ہے جس میں بابر اور ہمایوں کے ذریعے کی جانے والی علمی وادبی فتوحات کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرا باب 'شیر شاہ' ہے اس میں شیر شاہ سوری کی تعلیم سے متعلق منصوبہ بندی کا اجمالی بیان ہے۔

تیسرا، چوتھا اور پانچواں باب 'مغل شاہی خاندان' کے نام سے ہی ہے۔ اس میں بالترتیب اکبر اعظم، ماہم انگا اکبر کو دودھ پلانے والی آیا اور بیرم خاں اکبر کا نائب، جہانگیر، شاہ جہاں اور دارا شکوہ، اورنگ زیب، بہادر شاہ ظفر، محمد شاہ اور نادر شاہ کا حملہ اور شاہ عالم دوئم کے عنوان سے الگ الگ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب کہ آخری باب 'تعلیم نسواں' کے عنوان سے ہے۔ اس میں مسلم دور حکومت میں خواتین کی تعلیم و تربیت اور ان کے اندر علم کی شمع کو روشن کرنے کے لیے جس طرح کی کوششیں کی گئیں ان کا جائزہ لینے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔ مسلم دور حکومت میں ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کے ذریعے جس طرح کی کوششیں کی گئی ہیں ان کا تاریخی اعتبار سے جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب معلوماتی اعتبار سے اور مسلم فاتحین کے ذریعے کی جانے والی علمی و ادبی خدمات کو سمجھنے اور جاننے کے لیے انتہائی مفید ہے۔ مترجم نے بہت ہی اچھے انداز میں اس کا ترجمہ کیا ہے، ان سے اس طرح کی مزید کارآمد کتابوں کے ترجمے کی امید کی جا سکتی ہے۔ امید ہے علمی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیك اور جغرافیه، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفه، فنون لطیفه، قانون، کتب خانه داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اهم کتابیں شائع کی هیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پته پر حاصل کی جاسکتی هیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

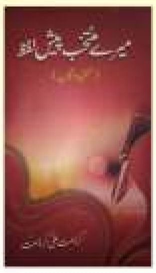

میرے منتخب پیش لفظ

مصنف وناشر: ڈاکٹر پروفیسر کرامت علی کرامت
صفحات: 480 قیمت: 500 روپے
پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ایم نصر اللہ نصر، شالیمار اپارٹمنٹ، 3A، ستین بوس روڈ
دانش شیخ لین، باکل تالہ، ہاؤرہ۔ 711109 (مغربی بنگال)

پیش لفظ اور مقدمے وہ تنقیدی اور تجزیاتی تبصرے وتحاریر ہیں جو کتاب کے آغاز میں شامل کی جاتی ہیں۔ اس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ پیش لفظ یا مقدمے وہ دریچے ہوتے ہیں جن سے جھانک کر قاری اس کتاب کی دنیا کا جائزہ لے سکتا ہے۔ اس کے رموز واسرار سے واقف ہوسکتا ہے۔ اس کے مفاہیم ومقاصد سے آشنا ہوسکتا ہے۔ یہ مقدمے وہ کسوٹی ہوتے ہیں جو کتاب کے کھرے اور کھوٹے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ خالص تقریظ نہ ہوں۔ یہ کتاب کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد لکھے جاتے ہیں۔ اس میں تقریظ کے ساتھ تنقید، صلاح ومشورے اور اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا اشارہ بھی ہونا لازمی ہے۔ کبھی کبھی ان میں ادبی تاریخ کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔ مبصر یا پیش لفظ نگار کا مطالعہ وسیع ہو تو وہ زیر مطالعہ کتاب کی خوبیوں اور کمیوں کو سلیقے سے واضح کرسکتا ہے جس سے قاری کو دوگنا فائدہ ہوسکتا ہے۔ ایک تو اس کتاب کے تعلق سے معلومات کی فراہمی دوسرا اضافی حقائق سے آگاہی۔

کرامت علی کرامت نے اپنے پیش لفظوں میں ان باتوں کا خاص خیال رکھا ہے۔ 'میرے منتخب پیش لفظ' میں شامل ان کے بیشتر مقدمے اور پیش لفظ اضافی معلومات کے حامل ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ وہ جلد کسی کی کتاب پر پیش لفظ یا مقدمہ نہیں لکھتے اور جس پر لکھتے ہیں اس کا بھرپور مطالعہ کرتے ہیں۔ جب اس کتاب میں کوئی خاص بات اپیل کرتی ہے تبھی اپنے خامۂ گہربار کو زحمت دیتے ہیں۔ ان کے سامنے کتاب کے دونوں پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ تعریف وتقریظ بھی حد میں رہ کر کرتے ہیں اور تنقید سے بھی کسی کو رنجیدہ خاطر نہیں ہونے دیتے۔ چند مثالیں دیکھیں:

"علیم صبا نویدی اپنی نئی نئی حرکتوں سے ہم اردو والوں کو اچنبھے میں ڈال دینے کے عادی ہیں۔ بیٹھے بٹھائے انہیں کیا سوجھی کہ انھوں نے اپنی آزاد غزلوں کا مجموعہ 'رد کفر' کے نام سے چھپوا لیا۔ گویا آزاد غزل کے منکروں پر کفر کا فتویٰ صادر کرکے ان کافروں کے عقائد کی رد میں اپنا یہ مجموعہ پیش کیا (جو اتفاق سے اردو میں آزاد غزل کا پہلا مجموعہ ہے) مظہر امام نے آزاد غزلوں کا انتخاب 'قید شکن' کے نام سے شائع کیا جو آزاد غزلوں کا پہلا انتخاب ہے۔ موصوف (علیم صبا نویدی) نے آزاد غزل سے متعلق مختلف تنقیدی مضامین کو یکجا کرکے 'آزاد غزل: شناخت کی حدوں میں' کے نام سے شائع کیا۔ یہ بھی اردو میں اپنے موضوع کی پہلی کتاب ہے۔ ان سب کے بعد اب علیم صبا نویدی اپنی طبع زاد ہائیکو نظموں کا مجموعہ 'ترسیلے' کی شکل میں لے کر حاضر ہوئے ہیں تو اسے بھی اردو والوں کو چونکا دینے والی کوشش سمجھتا ہوں۔" (ص 277)

اس ایک اقتباس سے قاری کو کئی باتوں کا علم ہوتا ہے۔ پہلی یہ کہ آزاد غزلوں کا اولین مجموعہ 'رد کفر' ہے جس کے خالق علیم صبا نویدی ہیں۔ دوسری آزاد غزلوں کا پہلا انتخاب 'قید شکن' ہے جس کے مرتب مظہر امام ہیں۔ تیسری یہ کہ آزاد غزل پر لکھے گئے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'آزاد غزل شناخت کی حدوں میں' ہے جس کے مرتب علیم صبا نویدی ہیں اور چوتھی بات یہ کہ 'ترسیلے' علیم صبا نویدی کے ہائیکو کا مجموعہ ہے جس کا پیش لفظ کرامت صاحب نے لکھا ہے لیکن ایک ہی پیراگراف میں انھوں نے اتنی ساری باتوں اور حقائق سے قارئین کو آشنا کردیا کہ اب پورا مقدمہ پڑھے بغیر قاری نہیں رہ سکتا بلکہ ایک نشست میں ہی پڑھنے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے کہ آگے چل کر موصوف نے ہائیکو کے آغاز وارتقا پر بھرپور روشنی ڈالی ہے، ساتھ ہی ترسیلے کا خوبصورت تجزیہ بھی پیش کیا ہے اور علیم صبا نویدی کی ہائیکو نگاری کا بھرپور جائزہ بھی لیا ہے۔ جس سے قاری استفادہ کرسکتا ہے۔

ایک اور ادبی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے 'مونس سخن' (عبدالمتین جامی) کے تعلق سے اس حقیقت کا خلاصہ پیش کیا ہے کہ آزاد غزل کی طرح آزاد رباعی کا بھی تجربہ کیا گیا۔ سب سے پہلے فیروز اور تفضیل احمد نے آزاد رباعی کا سلسلہ شروع کیا لیکن وہ اس کا کوئی ٹھوس اصول پیش نہیں کرسکے اس لیے اس میں کامیابی نہیں ملی۔ تقریباً 35 سال بعد عبدالمتین جامی نے دوبارہ تجربہ کیا اور نیا اصول قائم کیا جس کے تحت آزاد رباعی کی بحر کے چار مصرعوں کے تیسرے مصرعے کو نصف کردیا، جیسے تین مصرعے مفعول مفاعیل مفاعیلن فعولن اور تیسرا مصرع مفعول مفاعیلن رکھا۔ مثال دیکھیں:

اس نے مرا اندازِ تکلم چھینا / دریائے تفکر کا تلاطم چھینا
کیا اور رہا باقی / لب سے مرے خوشبو کا تبسم چھینا

ہر چند کہ کچھ تجربوں کے بعد یہ اصول بھی کامیاب نہ ہوسکا لیکن پذیرائی ضرور ہوئی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو ادب میں نئے تجربے بہت کم کامیاب ہوتے ہیں۔ اردو کے لوگ زیادہ تر روایت پسند ہوتے ہیں۔ قارئین بھی نئے تجربے کو جلد قبول نہیں کرتے جس کی وجہ سے نئے تجربے پھلنے پھولنے سے رہ جاتے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کرامت صاحب کی پیش لفظ نگاری میں ایسی بے شمار خوبیاں ہیں جن سے واقفیت اس کتاب کے بالاستیعاب مطالعے کی بعد ہی ہوسکتی ہے۔ ان کی تحریر کی ایک ایک سطر میں اتنی ساری معلومات عکس ریز ہیں کہ ڈھیر ساری کتابوں کے مطالعے کے بعد بھی قاری اس خزانے کو پانے سے قاصر رہے گا۔ زبان میں چاشنی، بیان میں دلکشی، انداز میں نیاپن کا اہتمام ہوتا ہے۔ میں نے صرف دو پیش لفظ سے اقتباس اور اطلاعات وانکشافات کا ذکر کیا۔ اس کتاب میں ایسے 61 مضامین شامل ہیں اگر کوئی ان تمام مضامین کا بغور مطالعہ کرلے تو وہ کئی لائبریریوں کی خاک چھاننے سے بچ جائے گا۔

کرامت صاحب نے لکھا ہے کہ مقدمہ چھوٹا ہو یا بڑا اس میں مقدمہ نگار کا تنقیدی شعور ضرور کارفرما ہوتا ہے۔ جس میں زیادہ تر کوشش یہ کی جاتی ہے کہ تخلیق کے مثبت پہلو کو پیش کیا جائے، منفی حقائق سے گریز کیا جائے، لیکن زیادہ شرافت کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ جو اکثر پیش لفظوں میں دیکھا جاتا ہے۔ کبھی کبھی محرر اپنی بالغ نظری اور علمی صلاحیت کو بگھارنے کے لیے ذرے کو آفتاب بنانے کوشش کرتا ہے۔ ایسا کرنے میں اس کی علمی شخصیت کا اندازہ تو ہوتا ہے مگر صاحب کتاب کی عزت کشائی ہوجاتی ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں:

"راقم الحروف کی نظر میں تنقید نگار کا منصب ہے تشریح وتوضیح، فکر وفن کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی نشاندہی۔ تخلیق کار کے تخلیقی عوامل کا جائزہ، مصنف کے ذہنی ارتقا کی نشان دہی، نیز اس ارتقا میں مختلف داخلی اور خارجی اثرات کی دریافت، فنکار کے مختلف فن پاروں کا نیز اس کے ہم عصر اور پیش رو فنکاروں کی تخلیقات کے تقابلی مطالعہ کے ذریعہ پوشیدہ خوبیوں کو اجاگر کرنا۔" (ص 10)

موصوف نے نہ صرف کتاب اور صاحب کتاب کے تعلق سے گفتگو کی ہے بلکہ جس صنف ادب پر وہ کتاب لکھی گئی ہے اس صنف کا پہلے تعارف بھی پیش کیا ہے، اس کے اصول وضوابط پر روشنی ڈالی ہے اس کے تاریخی پہلو کو اجاگر کیا ہے پھر کتاب کے متن

کے تعلق سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ ایک اور خوبی یہ ہے کہ بیشتر پیش لفظ میں مصنف یا شاعر اور ادیب کا سوانحی خاکہ بھی پیش کیا ہے، جو قاری کے لیے اہم معلومات کا وسیلہ ہے۔ یہ کسی گنجینۂ شعر وادب سے کم نہیں۔ علم وہنر کا ایک خزانہ ہے۔ اس کی سطر سطر سے ادب کی خوشبو نکلتی ہے۔ اس میں تبصرہ بھی ہے، تجزیہ اور تاثرات بھی۔ تقریظ بھی ہے اور صحت مند تنقید بھی۔ اہل اردو ادب کے لیے یہ کتاب بے حد کارآمد اور مفید ہے۔ ایسے پیش لفظ بہت کم دیکھنے اور پڑھنے کو ملیں گے، اس کے لیے کرامت علی کرامت صاحب کو بہت مبارکباد۔

پریم چند کے افسانے میں دلت مسائل

مصنف: ڈاکٹر کیرتی مالنی وٹھل راؤ جاولیے

صفحات: 378، قیمت: 226 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

مبصر: ڈاکٹر شیخ اصغر

کوآرڈینیٹر اکیڈمک (اردو)، یشونت راؤ چوہان مہاراشٹر اوپن یونیورسٹی، ناسک

ڈاکٹر کیرتی مالنی وٹھل راؤ جاولیے ویسے تو کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ انھوں نے تحقیق و تدوین سے اردو دنیا میں قدم رکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک محقق اور ترجمہ نگار بن گئیں۔ ڈاکٹر کیرتی مالنی شعبۂ اردو ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی کی صدر شعبہ ہیں۔ درس و تدریس کے علاوہ مختلف تحقیق و تدوین کا کام ان کا مشغلہ ہے۔ اس کے علاوہ اردو سے مراٹھی میں متعدد کتابیں ترجمہ کر چکی ہیں۔ اردو اور مراٹھی تراجم میں انکا بڑا نام بن چکا ہے۔ انھوں نے یشونت راؤ چوہان مہاراشٹر اوپن یونیورسٹی کی سال دوم کی درسی کتابوں کا مراٹھی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح تحقیق و تدوین پر اب تک تین کتابیں جن میں مخدوم محی الدین حیات اور ادبی خدمات، مضامین کیرتی (نقش اول)، مضامین کیرتی (نقش دوم)، پریم چند کے افسانے میں دلت مسائل منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس کے علاوہ 'پنچی گھنٹہ' (اردو کے افسانوں کا مراٹھی ترجمہ) بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ ان کی آنے والی کتابوں میں 'مانوی مانی چار ہاس' (زوال آدم خاکی، محمد غیاث الدین، کے ناول کا اردو سے مراٹھی میں ترجمہ) ایک موتی کی تلاش (افسانوی مجموعہ)، پریم چند کے ناولوں میں پسماندہ طبقات کے مسائل، اردو کی نثری اصناف، عزیز احمد شخصیت اور فن، ترقی پسند اردو ناول، شامل ہیں۔

ڈاکٹر کیرتی مالنی کے مقالے ہندوستان کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ مختلف بین الاقوامی سطح کے سیمناروں میں تحقیقی مقالے پڑھ چکی ہیں۔ پی ایچ ڈی اور ایم فل کی ریسرچ گائیڈ ہونے کے ساتھ وہ ایک ہر دل عزیز معلّمہ ہیں۔ ان کی تدریسی خدمات کو دیکھتے ہوئے 2015 میں انھیں مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی کا بیسٹ ٹیچر اوارڈ دیا گیا۔

'پریم چند کے افسانے میں دلت مسائل' یہ ڈاکٹر کیرتی مالنی وٹھل راؤ جاولیے کی تحقیق پر مبنی کتاب ہے جسے انھوں نے بڑی محنت، جستجو اور لگن سے تخلیق کیا ہے۔ اس کتاب میں کل 8 ابواب کے علاوہ ماحصل اور کتابیات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

باب اول میں پریم چند کے عہد کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور پریم چند کے عہد میں اثر انداز ہونے والے سیاسی، سماجی پس منظر کو بھی بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ باب دوم میں فن افسانہ نگاری کو رکھا گیا ہے جس میں افسانے کی تعریف اور اس کے اجزائے ترکیبی سے بحث کی گئی ہے۔ باب سوم میں پریم چند کے عہد کو بڑے بہترین اور محققانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جس میں پریم چند کی تعلیم، بچپن، ملازمت، سے لے کر ان کی شخصیت پر اثر انداز ہونے والے عوامل کو بہت ہی سلیقے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں مصنفہ نے پریم چند کے اور ان کے عہد کے بارے میں معلومات دی ہیں شاید ہی وہ کسی اور کتاب میں مل سکیں۔ اس لیے یہ باب بہت اہم ہے۔

باب چہارم میں پریم چند کو بحیثیت افسانہ نگار بتایا گیا ہے۔ ویسے تو پریم چند کے افسانوں پر بہت ساری تحقیقی و تنقیدی کتابیں موجود ہیں، بڑے بڑے محقق اور تنقید نگاروں نے پریم چند کے افسانوں پر لکھا ہے، لیکن اس کتاب میں مصنفہ نے کچھ الگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے پریم چند کے افسانوں کو اجزائے ترکیبی کے ذریعے جیسے پلاٹ، موضوع، کردار، اختتام، وغیرہ کے لحاظ سے پریم چند کو بحیثیت افسانہ نگار بتایا ہے۔ اس باب میں پریم چند کی افسانہ نگاری پر ہر طرح سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب پنجم میں پریم چند کے افسانوں میں دیہی معاشرہ اور دیہی زندگی کے کرداروں کو رکھا گیا ہے، یہ باب بھی اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ پریم چند نے دیہی زندگی اور اس کے مسائل کو ہی موضوع بنایا تھا۔ مصنفہ نے اس باب کے ذریعے اس کتاب میں چار چاند لگا دیے کیونکہ پریم چند پر کوئی بھی کتاب تب تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس میں دیہی زندگی اور دیہی معاشرہ موجود نہ ہو۔ اس باب میں پریم چند کے افسانوں کا دیہی معاشرہ اور دیہی کرداروں پر تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ باب بھی کتاب میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ باب ششم پریم چند کے ہم عصر افسانہ نگاروں پر مشتمل ہے جو کہ ریسرچ اسکالر، تحقیق نگار، طلبا و طالبات کے لیے مددگار ثابت ہوگا۔ اس باب میں مصنفہ نے بڑے پر اثر انداز اور محققانہ طور پر پریم چند کے ہم عصروں میں واضح فرق محسوس کروایا ہے۔

باب ہفتم میں پریم چند کے افسانوں میں دلت مسائل کو بڑے پر کشش اور محققانہ طرز تحریر کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں مصنفہ نے پریم چند کے افسانوں کے دلت مسائل کے ساتھ ساتھ ان افسانوں کو تنقیدی طور پر واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ پریم چند کے جتنے بھی کردار جو دلت مسائل کی عکاسی کرتے ہیں، انھیں اس باب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شہری اور دیہی دونوں کرداروں کو اس میں رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب کا ٹائٹل بھی ہے اور اس کتاب کی اہم کڑی بھی ہے۔ اس کے بعد ماحصل اور کتابیات ہے، ماحصل میں بھی مصنفہ نے اپنی ایک الگ رائے قائم کی ہے۔ آخر میں کتابیات دی گئی ہے۔ کتابیات کسی بھی تحقیق لیے ضروری ہوتی ہے کیونکہ آنے والے تحقیق نگار یا ریسرچ اسکالر ان کتابوں سے استفادہ کر سکیں۔

ڈاکٹر کیرتی مالنی وٹھل راؤ جاولیے نے یہ کتاب کو بڑی محنت، جستجو، لگن سے لکھی ہے جس میں ان کا محققانہ انداز واضح نظر آتا ہے۔

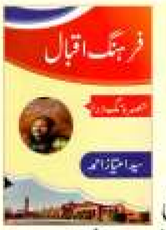

فرہنگ اقبال

مصنف: سید امتیاز احمد

صفحات: 404، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: عظمت النسا، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

فرہنگ فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی عقل، دانائی، سمجھ اور فہم کے ہیں۔ اصطلاحی معنی میں فرہنگ کسی موضوع یا کسی کتاب میں نئے قارئین یا طلبہ کی آسانی کے لیے مشکل اور نامانوس الفاظ اور تراکیب و اصطلاحات کی تشریح کی غرض سے کتاب کی آخر میں ترتیب دی جاتی ہے، تا کہ قارئین کو کتاب سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

شاعر مشرق علامہ اقبال کے چار شعری مجموعے ہیں بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز۔ اردو میں اب تک بہت سی فرہنگیں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن کلام اقبال پر

اب تک کوئی جامع فرہنگ تیار نہیں ہوئی ہے۔جس کی کمی بڑی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔جبکہ اقبال کی زندگی ان کے کلام اور فکر وفن کے حوالے سے اب تک بہت کام ہو چکا ہے۔اس تشنگی کو سید امتیاز احمد (سابق پروفیسر علامہ اقبال کالج، بہار شریف) نے محسوس کیا اور اقبال کے پہلے شعری مجموعہ 'بانگ درا' کی فرہنگ تیار کی۔زیر تبصرہ کتاب کے پیش لفظ میں سید امتیاز احمد اپنی اس فکر کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اقبال کے کلام کا تقریباً نصف سے زیادہ حصہ علامتی اور رمزیاتی ہے، چنانچہ لغات کے صحیح مفہوم کے تعین کے لیے عام فرہنگیں بالکل ناکافی ہیں۔مرکبات وتراکیب کا ایک حصہ تو وہ ہے جن سے ہماری اردو فارسی لغات کا دامن خالی ہے اور ایک حصہ وہ ہے جن کے نادر مروجہ معانی ومفاہیم کے اعتبار سے اتنی وسعت پیدا کر لی گئی ہے کہ ان کی پرانی نہج بدل گئی ہے... ایک ایسی فرہنگ کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوا، جو خاص کلام اقبال سے متعلق اور ان کے مخصوص رجحان، فکر ونظر کی آئینہ دار ہو۔'' (ص،14)

زیر تبصرہ فرہنگ 'بانگ درا' پر مشتمل ہے۔جس کو حروف تہجی کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔سید امتیاز احمد نے یہ کتاب الف بائی ترتیب کے مطابق شواہد اشعار کے ساتھ تیار کی ہے اور بعض جگہ شواہد اشعار میں فارسی شعرا مثلاً رومی، حافظ وغیرہ کے بھی اشعار بطور مثال دیے گئے ہیں۔علاوہ ازیں بانگ درا میں ایک ہی کلمہ جو مختلف مقامات پر مختلف مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے، شعری حوالوں کے ساتھ مصنف نے فرہنگ میں یکجا کر دیے ہیں، تاکہ بآسانی یہ پتہ چل جائے کہ ایک ہی کلمہ کلام اقبال میں کہاں کہاں کس حیثیت سے استعمال ہوا ہے۔اس کے علاوہ بانگ درا میں ہندی، سنسکرت اور انگریزی کے جو الفاظ آئے ہیں وہ بھی کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ساتھ ہی اردو فارسی محاورات کو بھی داخل فرہنگ کر لیا گیا ہے۔مثال کے طور پر:

لفظ مفردات معنی

خاکم بدہن ف۔محاورہ میرے منہ میں خاک۔ایسی بات کہنا جس کا کہنا بظاہر مناسب نہ ہو۔

جرأت آموز میری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے، خاکم بدہن ہے مجھ کو
(شکوہ)

مصنف نے ایسے مرکبات بھی شامل کیے ہیں جو عام لغات میں نہیں ملتے۔اس کے علاوہ سید امتیاز احمد نے وہ متداول الفاظ بھی داخل کیے ہیں جو قدما کے یہاں استعمال ہوئے ہیں۔لیکن اقبال نے ان کے مفہوم میں تبدیلی اور وسعت پیدا کر دی۔مصنف نے فقہ، تصوف اور نجوم کی ان اصطلاحات کو بھی درج کیا ہے جن کے مفہوم کی وضاحت کے بغیر مطلب واضح نہیں ہوتا۔ساتھ ہی وہ الفاظ بھی شامل فرہنگ ہیں جو بظاہر آسان، عام فہم اور معمولی ہیں مگر کلام اقبال میں بطور تشبیہ یا کنایہ واشارہ استعمال کیے گئے ہیں۔فرہنگ میں وہ لغات بھی شامل ہیں جن کا تعلق تاریخی یا دینی واجتماعی موضوعات سے ہے۔مثلاً:

لفظ مفردات معنی

پیر مغاں ف۔م تصوف کی اصطلاح میں پیر مغاں پیر خرابات، پیر میکدہ، مرشد کامل کو کہتے ہیں۔یہاں پیر مغاں سے مراد رہنمائے قوم ہے۔

پیر مغاں! فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیف غم نہیں، مجھ کو تو خانہ ساز دے (غزلیات)

سلجوق ف ترکوں کے ایک مشہور قبیلے کا نام جو اپنے مورث اعلی سلجوق کے نام سے منسوب ہے۔ایران کی تاریخ میں سلجوقی دور بڑی اہمیت کا حامل ہے۔الپ ارسلان اور ملک شاہ اس خاندان کے مشہور فرمانروا تھے۔

یہاں سلجوقی سے وہ سلجوقی خاندان مراد ہے جو قبل ظہور اسلام موجود تھا۔

بس رہے تھے یہیں سلجوقی بھی، تورانی بھی
اہل چیں چین میں، ایران میں ساسانی بھی (شکوہ)

مصنف نے اس کتاب میں ہر لفظ کے ساتھ اس کے ماخذ کی نشاندہی کی ہے۔کلام اقبال میں شامل ایسے کلمے جو قرآن سے براہ راست ماخوذ ہیں یا ان سے قرآنی آیات کی طرف اشارہ مقصود ہے ان کے ماخذ کا حوالہ بھی اس کتاب میں دیا ہے۔بانگ درا میں اقبال نے جن تاریخی، نیم تاریخی، سیاسی یا مذہبی شخصیات یا مقامات کا ذکر کیا ہے ان پر سرسری روشنی ڈالی ہے۔ظاہر ہے ایسے موضوعات کے لیے کئی کئی صفحات درکار ہوتے ہیں لیکن فرہنگ میں اس طوالت کی گنجائش نہیں ہوتی اس لیے مصنف نے تفصیل سے گریز کیا ہے۔سید امتیاز احمد نے اس فرہنگ میں الفاظ کے مرادی اور مجازی معنی کے ساتھ ساتھ ان کے لغوی معنی بھی لکھ دیے ہیں۔جس سے اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

امتیاز احمد کو اس اہم موضوع پر کتاب تیار کرنے کے لیے بہت بہت مبارک باد، امید ہے کہ اس طرح کی فرہنگ علامہ اقبال کے بقیہ شعری مجموعوں پر بھی تیار کریں گے۔'فرہنگ اقبال' قارئین کے لیے توقع خاص طور پر اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بڑی مددگار ومعاون ثابت ہوگی۔توقع ہے کہ ادبی حلقوں میں یہ کتاب پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور اس کی خوب پذیرائی ہوگی۔

تنقیدی زاویہ

مصنف: جاوید انور

صفحات: 192، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: عظمی اسکرین، وارانسی

مبصر: ڈاکٹر عادل احسان، بی این ڈگری کالج، اعظمی ودیا نگری آنجھی ریلوے اسٹیشن روڈ، شاہ آباد، ہردوئی۔ 241124

زیر تبصرہ کتاب 'تنقیدی زاویہ' میں جاوید انور کے 23 مضامین شامل ہے۔اس کتاب میں انھوں نے مختلف شخصیات پر مضامین قلم بند کیے ہیں جن کا تعلق متعدد کلاسیکل ادوار سے ہے جو اپنے دور کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ان میں سے کچھ ادیبوں اور شعرا نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔جو تغیر پذیر اوقات اور ماحول کے ساتھ ہندوستانی معاشرے کی نمائندگی کر رہی ہیں۔جاوید انور نے جس طرح ان ادیبوں اور شعرا کے کلام کی حقیقت کو بیان کیا ہے اس سے ان کے فکر وفن، طرز تحریر اور موضوعات کے ساتھ زبان وبیان کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔اس کتاب میں ایسے موضوعات پر بھی بحث کی گئی ہے جن میں معاشرے کا درد بھی چھپا ہے جو سماج کی برائیوں کو بے نقاب کر رہا ہے۔ان تمام تر نظریات وخیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے جاوید انور نے اپنے فکر وفن اور اسلوب پر مذکورہ مضامین کی عمارت کی بنیاد رکھی ہے۔

جدیدیت نے جس طرح علامتی، اساطیری اور تجریدی طرز تحریر کو فروغ دیا اسی طرح اس رجحان نے شعرا کو اپنی طرف مائل کیا۔ان میں راجیندر منچندا بانی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔راجیندر منچندا بانی نے جس طرح اپنی غزلوں میں علامتی انداز کو استعمال کیا ہے۔اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس فن کو جلا بخشی ہے۔دوسرا مضمون امیر خسرو کے فارسی دواوین اور قدیم نسخوں کی تدوین وترتیب ہے۔جس میں امیر خسرو کی تخلیق کے ساتھ ان کے ہم عصر شعرا پر بحث کی گئی ہے۔تیسرے مضمون میں سرسید، حالی اور پنجاب کے حوالے سے

گفتگو کی گئی ہے۔ اس مضمون میں سرسید کی حالی کے ساتھ سرزمین پنجاب سے محبت اور ان پر لگے فتوؤں پر گفتگو کی گئی ہے۔ ناصر کاظمی نے اپنی غزلوں سے کلاسیکی روایت اور جدیدیت کو ایک نیا پلیٹ فارم عطا کیا۔ یہ روایت قدیم کو جدید کی طرف راغب کرتی ہے اور دوسرے شعرا سے اس کے رشتے کو ہموار کرتی ہے۔ اکیسویں صدی کے افسانوں میں جس طرح موضوعات کو لے کر ہلچل دیکھنے کو مل رہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل کے زیادہ تر افسانہ نگار اپنے افسانوں کو سرکاری رسالوں میں چھپوانے کو بیتاب رہتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزلوں کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ محمد علوی نے اپنی شاعری میں خوشی اور غم کے عناصر کو بیان کیا ہے۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے انسانیت کا بہت باریک بینی اور نزدیک سے مشاہدہ کیا تھا۔ عادل منصوری نے اپنی غزلوں کے ذریعے معاشرے پر سخت طنز کیے ہیں۔ پروفیسر وہاب اشرفی ادب میں اپنی تنقید کے لیے مشہور ہیں۔ وہ خیالات اور تصورات کا بڑی دقیقہ سنجی سے تجزیہ کرنے کے بعد ہی اپنی رائے قائم کرتے ہیں جس سے حقیقی باتیں واضح ہو جائیں۔ پروین شیر کی پہچان ان کے شعری مجموعہ 'بے کرانیاں' کی وجہ سے ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں جس طرح کی پیکر تراشی، فن مصوری کی باریک بینی اور انسانی جذبات واحساسات کو بیان کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ خلیل مامون نے اپنی نظموں میں انسان کے داخلی اور خارجی تصورات کو موضوع بنایا ہے تو فاروق مضطر نے جموں کشمیر کے ماحول کے ساتھ وہاں کی زندہ حقیقتوں پر زیادہ پختہ انداز میں نظرِ ثانی کی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں علامتی انداز میں وہاں کے انقلابی گھن گرج کے ساتھ مختلف مسائل کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

صلاح الدین پرویز کی پہچان نظم نگار کے طور پر ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں ہندی اور سنسکرت لفظوں کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے۔ حنیف ترین نے 'باغی سچے ہوتے ہیں' کی روشنی میں ان تمام انقلابیوں کی آواز بلند کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنے حقوق کے لیے لڑ رہے ہیں اور ظالم حکمراں انھیں باغی یا دہشت گرد سے تعبیر کر رہے ہیں۔ شوکت حیات نے افسانہ 'مادھو' میں پریم چند کے افسانہ 'کفن' کی کہانی کی توسیع کی ہے۔ لداخ کی خوبصورت وادیوں سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگار عبدالغنی نے وہاں کی تہذیب وتمدن وثقافت کے ساتھ ملکی اور بین الاقوامی موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات میں وہاں کے باشندوں پر ہونے والے ظلم ستم کی داستان بھی شامل ہے۔ ولی عالم شاہین نے ہجرت کے مسائل اور نئی نسل کی ضروریات جیسے موضوعات کو اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔

منور رانا کی شعری کائنات میں 'ماں' کا تصور نمایاں ہے۔ پوری کائنات میں ماں ہی ایسا لفظ ہے جو سب سے عزیز ہے۔ منور رانا نے جس طرح اپنی نظموں میں ماں کا ذکر کیا ایسا دوسروں کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ روشن لال روشن بھی جدیدیت کے نمائندہ شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں علامتی انداز، اساطیری فکر اور واحد متکلم کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ جس سے ان کے خیالات ونظریات کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ غزلیہ شاعری میں چندر بھان خیال نے انسانی زندگی کی اندرونی اور باہری کیفیت کو بڑے مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک جس طرح ترقی نے انسان کو نئی راہیں دکھائی ہیں انھی نے اسے بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ انیس انصاری نے نوکر شاہی اور اس کی اشتہار بازی، انسانی جذبات وخیالات کی روشنی میں مذہب، سماج، سیاست، تاریخ اور قومی یکجہتی جیسے موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرے میں جس طرح کے ماحول کو دیکھا اسی طرح کے مسائل کو موضوع بنا کر اپنی شاعری میں پیش کیا۔ عمر فاروق کی نظموں کا انحصار فرد کی داخلی زندگی پر ہے، جس میں انسانی جذبات کی بہتات کے ساتھ فرد کے خوابیدہ مناظر کی کشمکش بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

جاوید انور نے جس طرح ان شعرا اور ادیبوں کے فکر وفن پر گفتگو کی ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ جاوید انور کو زبان و بیان کے ساتھ لفظوں کے استعمال پر دسترس حاصل ہے۔ وہ انھیں لفظوں سے اپنی تحریروں کو ایک نئی بلندی عطا کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جاوید انور نے اپنی کتاب 'تنقیدی زاویہ' میں شامل شعرا اور ادیبوں کی تخلیقات کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

جگدیش پرکاش فکروفن

تحقیق وتدوین: آصف اعظمی

صفحات: 231، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: فروری 2021

ناشر: وجیہ بکس، دہلی

مبصر: عامر مظفر بٹ، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'جگدیش پرکاش فکروفن' معروف صحافی جناب آصف اعظمی کی تحقیقی وتدوینی کاوش ہے، آپ نہ صرف اردو کے منجھے ہوئے قلمکار ہیں بلکہ کئی کتابوں کے مصنف اور مرتب بھی ہیں۔ مذکورہ کتاب میں جگدیش پرکاش کے متعلق اردو کے نامور اور بلند پایہ محققین وناقدین کے مضامین ہیں جو ان کی ادبی وشعری خدمات کا احاطہ کرتے ہیں۔

کتاب کے مقدمہ میں فاضل مصنف جناب آصف اعظمی لکھتے ہیں:

''وہ ان تمام اصول وقواعد اور معیارات کی پاسداری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جنھیں شعر وسخن کے پارکھیوں نے پہلے سے طے کر دیے ہیں خواہ وہ وزن وبحر ہو یا ساخت وماہیت، لفظی دروبست ہو یا تخیلی پرواز، وسعت مشاہدہ ہو کہ تجربۂ کائنات، فکر انگیزی ہو کہ اثر پذیری جگدیش پرکاش کا فن کوہِ داماں نہیں ہے۔''

گوپی چند نارنگ کا مضمون نہایت قیمتی، عمدہ اور قابلِ مطالعہ ہے۔ جگدیش پرکاش کی شاعری کو نہایت ہی عمدہ پیرایے میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں ''اپنی غزلوں میں وہ کم کھلتے ہیں اگر چہ یہ غزل کی خوبی بھی ہے مگر نظموں میں ان کی تخلیقیت کھل کر سامنے آتی ہے، غزلوں میں ان کے فکر کی چنگاریاں جابجا روشن ہوتی ہے۔ مثلاً یہ مصرعہ

تم کو عادت بنا کے دیکھ لیا   اب یہ عادت بدل کے دیکھیں گے

مذکورہ مصرعہ میں داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر شاعر سچائی کا متلاشی اور ترجمانی کا خواہاں نظر آتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون دریا میں کوزہ کے مانند ہے اپنے بیش بہا خیالات کو پیش کرتے ہوئے جگدیش پرکاش کے متعلق گویا ہیں ''ہمارے دوست جناب جگدیش پرکاش اردو میں اہل زبان کا درجہ رکھتے ہیں کیونکہ ان کی اول تعلیمی زبان اردو ہی ہے انھوں نے غیر منقسم ہندوستان کے پنجاب میں ہوش کی آنکھیں کھولیں اور وہیں اردو زبان کے نکات وضوابط سے آشنا ہوئے۔'' جب کہ ڈاکٹر مشیر احمد نے پنجابی لوک گیت کی ایک مشہور صنف 'ماہیے' پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر شفیع ایوب اپنے مضمون میں شاعر کے کئی روپ کو اپنے مخصوص اور منفرد نظریے سے دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں ''وہ ماضی پرست تو نہیں لیکن ماضی کے اوراق پلٹتے ہیں، ان کے لیے نہ یاد ماضی عذاب ہے اور نہ سامان مسرت، وہ حال سے بیزار نہیں ہیں اور مستقبل سے مایوس بھی نہیں ہیں لیکن ماضی کی فنکارانہ مہارت کے ساتھ اسے شعری پیکر عطا کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔''

ان مضامین کے علاوہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا مضمون 'جگدیش پرکاش: دردو محبت کا آکاش' نہایت ہی عمدہ اور ایک گراں قدر مضمون ہے، اس میں جگدیش پرکاش کے ابتدائی نقوش کو واضح کرتے ہوئے ان کی نظموں کا نہایت ہی باریک بینی سے تجزیہ

کرتے ہوئے اردو ادب میں ان کا مقام مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایک مضمون 'جگدیش پرکاش کی شاعری میں پیکر تراشی' کے عنوان سے توقیر احمد نے لکھا ہے جس میں انھوں نے پیکر تراشی کی تعریف کرتے ہوئے پیکر تراشی کی کئی اقسام کی نشاندہی کی ہے۔ جگدیش پرکاش کی شاعری کو ان پر منطبق کرتے ہوئے مثالوں سے اس کو واضح کیا ہے۔ یہ مضمون پڑھتے ہوئے تخیل اور لفظوں پر ان کی گرفت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

'جڑوں کی تلاش کے سفیر اور جگدیش پرکاش کی شاعری' یہ مضمون اردو کے مایہ ناز نقاد مولا بخش کا ہے، اس مضمون میں مولا بخش نے جگدیش پرکاش کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی نظموں کا تجزیہ کیا ہے جیسے تقسیم، ہجرت اور بے وطنی کے مسائل کو ان کی نظموں میں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔

'جگدیش پرکاش اور ان کی شاعری' محمد رفیع انصاری کا مضمون ہے، جس میں انھوں نے ان کی شاعری خصوصاً ان کی نظموں کا جائزہ بہت خوش اسلوبی کے ساتھ لیا ہے۔ ان کے مختلف مجموعوں سے اشعار کا انتخاب اور ان کا تجزیہ کیا ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں سے ایک آفاقی پیغام اخذ کیا ہے، جس کا مزہ پڑھنے سے بنتا ہے۔

محمد کاظم، سہیل انجم، رفیع انصاری، مخمور سعیدی کے مضامین اس کتاب کی زینت میں چار چاند لگاتے ہیں۔ مزید برآں عبدالرحیم قدوائی، ریشما پروین، عزیز نبیل، محمد اختر، سلمان فیصل، شاہنواز فیاض، ساجد ذکی فہمی اور محمد شارق کے مضامین جگدیش پرکاش کی شاعری اور ان کے طرزِ اسلوب کے افہام و تفہیم میں معاون ہیں۔ کل ملا کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آصف اعظمی کی یہ تحقیقی کتاب جگدیش پرکاش کے فکر و فن کو سمجھنے اور اسے ادبی معیار پر جانچنے کا ایک حسین گلدستہ ہے۔ امید ہے ادب کے دلدادہ اسے اپنی ذاتی لائبریری کی زینت بنا کر جگدیش پرکاش کے فن کو سچا خراج عقیدت پیش کریں گے۔

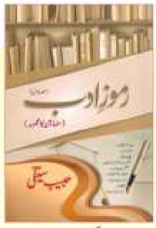

رموز ادب (حصہ اول)

ناشر/مصنف: حبیب سیفی

صفحات: 384 قیمت: 400 اشاعت دوم: 2021

مبصر: ڈاکٹر محمد مستمر، اسسٹنٹ پروفیسر ذاکر حسین کالج نئی دہلی

حبیب سیفی گذشتہ تین دہائیوں سے زائد عرصے سے اُردو ادب کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، محقق، نقاد اور نثار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، ادب اطفال پر مبنی تحقیقی پروجیکٹ، بچوں کے ادب میں سائنس کی عکاسی کے ساتھ آٹھ کتابوں کے حبیب سیفی مصنف ہیں۔

'رموز ادب' کے تمام رموز و نکات کو اگر سمجھنا ہے اور سیفی کے تنقیدی شعور و بصیرت کو جاننا ہے تو پھر رموز ادب کتاب کا مطالعہ کرنا ضروری ہوگا۔ حبیب سیفی کے کام کرنے کا ڈھنگ ہمیشہ مختلف ہوتا ہے، بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ ان کے کام میں سائنٹفک طریقۂ کار نظر آتا ہے۔ ان کی کتابوں میں خاص طور پر کلاسی فکیشن (درجہ بندی) کی خوبی کارفرما رہتی ہے جو درحقیقت سائنس کا حصہ ہے۔ اس درجہ بندی سے کتاب کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے نیز کتاب اور صاحب کتاب کی علمیت اور فراست کو بھی سمجھنے اور پرکھنے میں مدد ملتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں بھی یہ سائنسی اختصاص دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے 'رموز ادب' کو چھ حصوں میں منقسم کیا ہے۔ باب اول: علمی و تحقیقی مضامین، باب دوم: تنقیدی مضامین، باب: سوم نثری حصہ کا تجزیہ، باب چہارم: شعری مجموعوں کا جائزہ، باب پنجم: ادبِ اطفال کی تخلیقی مہک، باب ششم رسائل و جرائد کا تبصرہ نما جائزہ۔ یہ رموز ادب کی کائنات ہے جس کو حبیب سیفی نے اپنی دماغی اختراع، شعوری اُپج، تخلیقی صلاحیت اور تنقیدی بصیرت سے آراستہ و پیراستہ کرکے اربابِ فن کے سپرد کر دیا ہے، تاکہ ہر ایک اپنی پسند سے جو ہر گوہر و تلاش کر سکے۔ کتاب کے چھ ابواب سے حبیب سیفی کی ادبی ذہانت کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں اور کتاب کی اہمیت سے بھی کماحقہ واقف ہو سکتے ہیں۔ وہیں دوسری جانب اس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ حبیب سیفی کی دلچسپی ادب کی کسی مخصوص صنف میں نہیں بلکہ وہ ادب کی تمام اصناف پر عمیق نگاہ رکھتے ہیں۔ وہ شاعری کے آبِ زلال کو بھی پینا جانتے ہیں اور تنقید جیسے خشک موضوع سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ نیز تحقیق کی پرخار وادی سے گزرنا اور اس کارِ جنوں میں مغز کھپانا بھی جانتے ہیں۔

ادبِ اطفال میں تخلیقی مہک ڈھونڈنے کی فکر میں بچوں کے ادب کا مطالعہ کرنے اور اس کے بارے میں لکھتے وقت بچوں کی نازک مزاجی سے بھی نہ چشم پوشی کرتے ہیں اور نہ پنبہ بگوش ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہوں کا زاویہ زندگی اور ادب کے ہر زاویے یعنی زاویۂ قائمہ، زاویۂ حادہ اور زاویۂ منفرجہ پر نگاہ رکھتا ہے۔ تبھی تو علم و ادب کے بے کراں سمندر میں غوطہ زن ہوتے رہتے ہیں۔

'رموز ادب' کو پڑھنے کے بعد ایک بات کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ اتنی کتابوں پر ایک ساتھ گفتگو کرنے کے بعد بھی الفاظ و خیالات کی تکرار دکھائی نہیں دیتی، نہیں تو اکثر شعری مجموعوں پر ہمارے اکثر مبصرین وہی رٹے رٹائے جملے، فقرے، اور الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن حبیب سیفی کے یہاں یہ قبح نہیں ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سیفی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور جو محسوس کرتے ہیں۔ اسے باریک بینی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر متشکل و مرتسم کر دیتے ہیں۔ وہ حقیقت میں فن پاروں میں مخفی رموز و نکات کو تلاشتے ہیں، اور ان پر استدلالی و منطقی گفتگو کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آرا اور تبصرے ہوائی نہیں ہوتے بلکہ وہ حقائق و صداقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی تنقید کا ڈھنگ مختلف سمتوں میں سفر کرتا ہے۔ وہ کسی دبستان کے پابند ہو کر بات نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی گفتگو تاثراتی بھی ہو جاتی ہے، جمالیاتی بھی ہو جاتی ہے، کبھی کبھی تجزیاتی بھی، اسلوبیاتی اور سماجیاتی بھی۔

یہ حبیب سیفی کا اختصاص بھی ہے اور انفرادیت بھی نیز اسی میں ان کا ادبی اور ذاتی تشخص بھی چھپا ہوا ہے، جو ہمیں خود بخود احساس دلاتا ہے کہ حبیب سیفی کی اپنی آواز ہے، حبیب سیفی کا اپنا آہنگ ہے، مستعار کچھ نہیں۔ مجھے امید ہے کہ جب باذوق اور سنجیدہ قاری 'رموز ادب' کا مطالعہ کریں گے تو وہ اردو ادب کے بہت سے گوہر پاروں سے بھی آگاہ ہوں گے، مثلاً بدرالدین طیب جی، مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم، مہر لال سونی ضیا فتح آبادی، ڈاکٹر سوامی شیاما نند سرسوتی روشن، ڈاکٹر شمس کمال انجم، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، تحسین منور، حسن بن سلیم سیفی حسن پوری، شوکت پردیسی، بی ایس جین جوہر، سکندر شاہ خوشدل، سردار اجیت سنگھ حسرت، اشفاق حسین ٹورنٹو، جسٹس رضی الدین چشتی، وقار مانوی، رحمت الٰہی برق، کرشن پرویز، سید ابرار احمد نغمی، عبدالروف حیرت بستوی، امان اللہ ساغر، ڈاکٹر حنیف ترین، جیوتی پرساد مشرا، امیر احمد خاں امیر، عارف خورشید، مسعود جاوید ہاشمی، ڈاکٹر اشتیاق انصاری، عبدالعزیز یاس چاند پوری، شہزاد رضوی امریکہ، ڈاکٹر جگدیش چند جین، غلام عباس خان، ڈاکٹر مقبول احمد مقبول، مختار بدری، وریندر کمار قمر بدر پوری، اور ماسٹر فریاد علی وغیرہ۔

فکشن

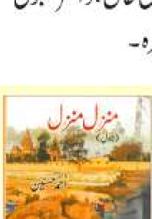

منزل منزل

ناول نگار: احمد حسنین

صفحات: 238، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: رجحان پبلی کیشنز، الہ آباد

مبصر: ڈاکٹر کہکشاں عرفان، A-577، نزد درگا پوجا گراؤنڈ، شاہ گنج، پریاگ راج، یوپی

'منزل منزل' الہ آباد کے رجحان پبلیکیشنز سے شائع ہوکر منظر عام پر آچکا ہے۔

ناول کا انتساب ہر اس انسان کے نام ہے جو کچھ کر گزرنے کا جذبہ رکھتا ہے اور اپنی آنکھوں میں خواب سجاتا ہے۔'جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے والوں کے نام' ہے۔اس ناول کا پلاٹ اتر پردیش کے جنوبی شہر باندہ اور اس سے منسلک اضلاع اور بندیل کھنڈ ریاست کے بیہڑوں اور پہاڑوں کے درمیان گزرنے والی کین ندی کے خشک ہونے اور انسان اور جاندار کی بنیادی اور اہم ضرورت پانی کی قلت کا اہم مسئلہ اور باندہ، چترکوٹ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گاؤں جیسے داگی پور نسینی، بھرت پور، نرینی کی رہائش، بجلی، پانی، تعلیم، روزگار، سماجی ضروریات اور وہاں کے بنیادی مسائل، گنگا جمنی تہذیب اور ہندو مسلم اور بھائی چارے کی آغوش میں خاموش بیٹھی ماضی کی مذہبی عقیدت اور ہندستان، پاکستان، عراق، ایران، سیریا، فلسطین، ایتھوپیا، کیمرون اور نائجیریا کے باشندوں کی بربادیاں، نسل کشی، بے روزگاری اور نقل مکانی کے درد و کرب اور کبھی خوشی کبھی غم، کبھی جدا کبھی وصال کے احساس اور رومان پرور واقعات، جذبات، سے تیار کیا گیا ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار علوزہ ہے جو پورے ناول میں اپنی نیک نیتی، سماجی خدمات، نیک خواہشات، اچھے عوامل، غریبوں اور کمزوروں کی مسیحا کے طور پر چھائی ہوئی ہے۔علوزہ ارغوان شاہ کی بیٹی ایک مسلم کردار ہے جو اپنی ذاتی ملکیت اور دولت سے اپنے گاؤں داگی پور کی ترقی اور خوشحالی کے لیے پانی، بجلی، تعلیم، کا مسئلہ حل کرتی ہے۔ دوسرا اہم کردار سلمان ہے جو علوزہ کا چچازاد ہے اور علوزہ سے بے پناہ محبت کرتا ہے ملازمت کی غرض سے امریکہ میں مقیم تھا مگر ملک کی گرتی ہوئی معیشت اور دہشت گردی کی بنا پر مسلمان ملازمین کو ملازمت سے برطرف کیا جانے لگا تو سلمان بھی زد میں آ گیا اور بے روزگار ہو کر بھارت واپس آ گیا اور علوزہ کی جاگتی آنکھوں سے دیکھے جانے والے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں لگ گیا۔ جبکہ علوزہ نئی تہذیب اور نئی ٹیکنالوجی کی زد میں آ کر اپنی مشرقی روایت اور شرعی حدود کو بھلا کر موبائل چیٹنگ سے پیدا ہوئی فاصلاتی اور مواصلاتی محبت اور محبوب عظیم پر اعتبار کر کے دور دیس سیریا چلی گئی تیسرا اہم کردار عظیم ہے، ضمنی کردار تو بہت سے ہیں جن سے ناول کی کہانی آگے بڑھتی ہے اور جس عظیم کی محبت اور رفاقت پانے کے لیے علوزہ ہندوستان جیسا پیارا وطن، داگی پور جیسا گاؤں اور پیار کرنے والی ماں، محبت کرنے والی چچی بیگم، عشق کرنے والے چچازاد سلمان اور عزت و احترام کرنے والے گاؤں والوں کو چھوڑ کر چپ چاپ خاموشی سے ملک چھوڑ کر جاتی ہے، یہ فیصلہ بہت احمقانہ تھا، جو بہت سبق آموز ہے، نتیجہ بھی وہی نکلا کہ عظیم دہشت گرد نکلا، علوزہ کی معصومیت اور بھروسے کا خون کیا گیا، اس کی آبرو لوٹی گئی۔ علوزہ اپنی عزت گنوا کر اور جان بچا کر لوٹی تو سلمان نے اسے ٹوٹنے بکھرنے سے بچا لیا اور علوزہ کے وجود کو اپنی محبت اور سچی رفاقت کی چادر میں سمیٹ لیا۔ منظر نگاری کا آغاز ناول کے شروع سے ہونے لگتا ہے جیسے ''ان دنوں جنوبی اتر پردیش کے اضلاع میں آگ برس رہی تھی۔ وہ جون کا مہینہ تھا، شہر باندہ اس وقت سب سے گرم تھا، اس شہر کے جنوب مشرق میں کین ندی کے کنارے ہزاروں سال پرانا بام دیو یشور پہاڑ اپنے جلو میں دلکش نظارے لیے خاموش کھڑا تھا، اس کی بلندی پر وقار مگر غرور سے عاری تھی، بام دیو یشور پہاڑ کے بازو سے بہنے والی کین ندی سوکھ جانے سے علاقے کے تقریباً پچاس گاؤں میں پانی کی قلت کے باعث ہاہا کار مچا ہوا تھا۔'' (منزل منزل، ص ۱)

محبت اور چاہت اور رومان کے گداز احساسات کو بھی ناول نگار نے فطری انداز میں پیش کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں ''ہوا کا ایک جھونکا اس کے جسم سے ٹکرایا تو نہ جانے کیوں اسے سلمان کی یاد آ گئی۔ ادھر سلمان بھی علوزہ سے ملنے کے لیے بیتاب تھا... وہ ارغوان منزل سے کچھ دور پر ہی تھا کہ علوزہ نے اسے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ لیا، اچانک اسے لگا جیسے اسے اس کی منزل مل گئی اور جیسے کین ندی کے بہاؤ کو اب تک ایک کالا پتھر دیوار بن کر روکے ہوئے تھا۔ مگر وہ پتھر ہٹ گیا اور ندی پھر سے بہہ نکلی ہے ناچتی اور گنگناتی۔'' (ایضاً، ص 237)

احمد حسنین صاحب نے ناول کی کہانی کو بہت محنت سے بنا ہے، زندگی، سماج، ملک، شہر، گاؤں سیاست، مذہب، عقیدت، دہشت ہر گوشے کے واقعات کو ناول میں جگہ دی ہے، کہانی کی بنت بہت گتھی ہوئی ہے ایک دوسرے سے مربوط، کہیں بکھراؤ نہیں۔ چونکہ ناول کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے اسی لیے ناول نگار نے ہندوستان کے جنوبی اتر پردیش کے پانی کے مسئلہ سے شروع کر کے ناول کو بندیل کھنڈ، مدھیہ پردیش اور پھر عراق، ایران، ترکی، سیریا، روس، امریکہ، ایتھوپیا، نائجیریا کے مسائل اور پوری دنیا کی موجودہ صورت حال اور انسانیت کے مسائل، مشکلات اور ضروریات کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ تجربات، مشاہدات، حادثات، کو ایک ناول 'منزل منزل' کے کوزے میں بند کر دیا ہے۔ زبان عین کرداروں کے مطابق کبھی دیہاتی کبھی نستعلیق۔ اپنے آپ کو پڑھانے کی صلاحیت رکھتا ہوا یہ ناول بہت دلچسپ ہے، اس ناول میں زندگی کا رزمیہ بھی ہے اور جیون سنگرام بھی، فکر بھی اور فلسفہ بھی، حقیقت کی روح بھی ہے اور تخیل کا جسم بھی، عصر حاضر کی دھڑکن کی بھی سنائی دے رہی ہے۔

عربی ادبیات

البروفيسور السيد ظل الرحمن وخدماته في تطور الطب العربي و علومه

مؤلف: ڈاکٹر فخر عالم ندوی علیگ

صفحات: 279، قیمت: 400 روپے، اشاعت اوّل: 2022

ناشر: ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ

مبصر: حسنین ظفر، اکیڈمک سیکشن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ہندوستان مختلف علوم وفنون کا ہمیشہ سے ہی گہوارہ رہا ہے۔ اس سرزمین سے ہمیشہ ہمہ جہت شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں جنھوں نے ہندوستان کا نام پوری دنیا میں روشن کیا ہے۔

زیر نظر کتاب پروفیسر سید ظل الرحمٰن صاحب کی ادبی، علمی و طبی خدمات پر مشتمل ہے، حکیم صاحب کی شخصیت علمی دنیا میں خاص طور سے طب یونانی کے تعلق سے محتاج تعارف نہیں ہے۔ ان کی شخصیت کے متنوع پہلو ہیں، ان کے کارناموں پر تقریباً پندرہ سے زائد کتابیں اردو زبان میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی حیثیت ایک محقق و دانشور کی ہے۔ وہ ہندو بیرونِ ہند کے علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب عربی زبان میں درحقیقت مجموعی طور پر ان کے علمی کارناموں پر مشتمل ہے، میرے خیال میں عربی زبان میں حکیم صاحب کے علمی کارناموں پر یہ پہلی کاوش منظر عام پر آئی ہے، جسے علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ مؤلفِ کتاب ڈاکٹر فخر عالم، ندوۃ العلما کے فارغ التحصیل اور شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ ہیں، انھوں نے بہت کم عمری میں ہی مختلف موضوعات پر اہم تصانیف علمی دنیا کے سامنے پیش کی ہیں۔ ان کے درجنوں علمی مقالات ہندوستان کے مؤقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ مؤلف کتاب نے اپنے قیمتی مقدمہ میں تحریر کیا ہے کہ ''ہم لوگ عرب علما کے علمی کارناموں اور ان کی خدمات پیش کرتے ہیں اور مستفید ہوتے ہیں لیکن ہندوستان میں ایسی بہت سی ہمہ جہت شخصیتیں موجود ہیں جن کو عالم عرب میں کم متعارف کرایا جاتا ہے چنانچہ یہ حقیر کاوش اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔''

مؤلف نے اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے:

باب اول، طب عربی و اسلامی، ہندوستانی اطبا کے کارناموں اور پروفیسر سید ظل الرحمٰن کے تحقیقی و علمی موضوعات پر مشتمل ہے۔ اس باب کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ

طب یونانی میں حکیم اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعمیر وترقی میں حکیم ظل الرحمن کا بہت اہم رول وکردار رہا ہے اوران کے زمانۂ صدارت میں قومی وبین الاقوامی کانفرنس وسمینار منعقد ہوئے ہیں جس سے کالج اور یونیورسٹی کا نام روشن ہوا ہے۔ ان کے زیر نگرانی متعدد اسکالرس نے تحقیقی مقالات قلم بند کیے اور وہ سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے۔

باب دوم میں حکیم صاحب کی تصنیفات وتالیفات نیز حکیم صاحب کے کارناموں پر اردو میں جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ترجمہ نگاری میں ابن سینا اکیڈمی میں جو محاضرات پیش کیے گئے ہیں ان کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ باب حکیم صاحب کے مجموعی کارناموں کا احاطہ کرتا ہے، جسے مؤلف نے نہایت ہی عرق ریزی وجانفشانی سے لکھا ہے۔

باب سوم حکیم صاحب کی شخصیت کو دنیائے عرب کے سامنے نکھارتا ہے۔ وہ ان کے طبی مخطوطات سے شغف کو نہایت گیرائی کے ساتھ واضح کرتا ہے نیز اس باب میں عالمی مکتبات کی مختلف طبی مخطوطات سے متعلق فہرست بھی پیش کردی گئی ہے جس سے اس باب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اس باب سے یہ بھی چلتا ہے کہ حکیم صاحب نے دنیا کے مختلف ملکوں کا علمی دورہ کیا ہے اور وہاں کی مشہور یونیورسٹیوں اور دانشگاہوں کو بھی دیکھا ہے۔ وہاں کی مختلف اکیڈمیوں نے انھیں اعزازی ممبر شپ عطا کی ہے اور مختلف اعزاز واکرام سے بھی نوازا ہے۔ اس باب میں ایک اور اہم چیز کا اضافہ کیا گیا ہے، وہ یہ کہ عام طور سے کسی بھی علمی شخصیت کے بارے میں اس کے معاصرین کی آرا مختلف ہوتی ہیں لیکن اس باب میں حکیم صاحب کے معاصرین کی آرا پیش کی گئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی قدر ومنزلت ان کے معاصرین کی نگاہ میں بھی ہے اور وہ سب بھی ان کے علمی کارناموں کے معترف ہیں۔

چوتھا باب دو ضمیموں پر مشتمل ہے۔ ضمیمہ اول میں حکیم صاحب کے تین مضامین شامل ہیں جو ہندوستان میں طب یونانی کے ارتقا پر مشتمل ہیں۔ دوسرا ضمیمہ فاتیکان لائبریری کے عربی ذخائر پر مشتمل ہے جو طلبا واسکالرس کے لیے نہایت مفید ہے۔

ڈاکٹر فخر عالم ندوی علیگ نہایت ہی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے حکیم صاحب کی طبی، تحقیقی وعلمی کاوشوں کو عالم عرب کے سامنے پیش کرکے انھیں متعارف کرانے کی حتی المقدور کوشش کی ہے جس سے ان کی علمی قدر ومنزلت میں اور اضافہ ہوگا اور عالم عرب بھی ایک ہندوستانی محقق سے روشناس ہوگا۔

اس کتاب کی زبان نہایت سلیس، واضح نیز سقم وابہام سے پاک ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ مؤلف کتاب نے حکیم صاحب کو متعارف کرانے میں کسی بھی غلو سے کام نہیں لیا ہے، بلکہ خالص ان کے علمی کارناموں کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

شاعری

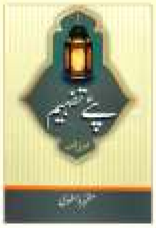

پنے تفہیم

مصنف: مظہر وسطوی

صفحات: 192 قیمت: 175 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی

مبصر: قمر اعظم صدیقی، حاجی پور، ویشالی، بہار

'پنے تفہیم' مظہر وسطوی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں شاعر نے دوران طالب علمی سے لے کر 2020 تک کی تخلیقات شامل کی ہیں۔ غزلوں کے اس انتخاب کے مطالعہ سے یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ مظہر وسطوی نے کس طرح فن کی منزلیں طے کی ہیں۔ 'حرف ابتدا' میں مظہر وسطوی اپنی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

''میں نے اپنی پہلی غزل 16 سال کی عمر میں کہی جسے اصلاح کی غرض سے معروف شاعر جناب محبوب انور (آسنسول) کے پاس بذریعہ ڈاک ارسال کیا۔ انھوں نے نہ صرف میری پہلی غزل کی مشفقانہ انداز میں اصلاح کی بلکہ جوابی خط لکھ کر میری حوصلہ افزائی بھی کی۔''

مظہر وسطوی نے اردو کے تعلق سے بہت ہی عمدہ اور معیاری قطعہ سے اپنے شعری مجموعہ کا آغاز کیا ہے، ان کے اس قطعہ سے اردو دوستی، اور اردو کے تئیں محبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ قطعہ ملاحظہ فرمائیں:

جنھیں اردو سے الفت ہے انھیں اکرام ملتا ہے　　زباں کی قدردانی کا بھلا انجام ملتا ہے
یہی پیغام اردو ہے، محبت بانٹتے رہیے　　کریں خدمت نہ سوچیں کیا ہمیں انعام ملتا ہے
(ص9)

معروف ادیب وشاعر ڈاکٹر بدر محمدی اپنی تحریر 'مظہر وسطوی کے ذوق سخن کی بالیدگی' میں لکھتے ہیں ''مظہر وسطوی کی غزلوں میں وفاداری بشرط استواری ہے۔ وہ دل میں رہ کر مسکراتا ہے اور رشتے کو نبھاتا ہے۔ اس نے رشتوں کا پاس رکھا ہے اور ہر رشتے کا نباہ کیا ہے۔ مظہر نے جن رشتوں کا ذکر کیا ہے، ان میں ماں کا رشتہ اہم ہے۔ ماں کا رشتہ قریب ترین رشتہ ہے۔'' (ص 27)

'پنے تفہیم' میں ایک حمد اور دو نعتیں ہیں۔

حمد ونعت کے بعد صفحہ 45 سے 173 تک 65 غزلیں شامل ہیں۔

غزل کے چند اشعار جو میرے دل کو چھو گئے، آپ بھی ملاحظہ فرمائیں اور شاعر کی فکری صلاحیت کا اندازہ لگائیں۔

یہ دنیا کب ہر اک انساں کا کہنا مان لیتی ہے　　جو چڑھ جاتا ہے سولی پر تو سچا مان لیتی ہے
جواں بیٹے کو بھی ممتا میں بچہ مان لیتی ہے　　اسی خوبی سے دنیا ماں کو اونچا مان لیتی ہے
یہ عشق کا سودا نہیں آسان ہے پیارے　　اک لمحہ میں ہو سکتا ہے نقصان ہزاروں
جذبہ انسانیت باقی کہاں ہر دل میں ہے　　اس لیے تو آج کل ہر آدمی مشکل میں ہے

غزلیات کے بعد مظہر وسطوی نے متفرقات کے عنوان سے اپنی سات نظموں کو کتاب میں شامل کیا ہے، جن کے عنوانات ہیں:

اردو زباں، اظہار محبت، نذرانۂ عقیدت، پرندہ، آہ! ڈاکٹر کلیم عاجز، آہ! شمیم فاروقی اور آہ! محبوب انور۔

نظم 'اردو زباں' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

پیار الفت کی زبان لشکری اچھی لگی　　سب زبانوں میں زبان مادری اچھی لگی
اس کی شیرینی کی قائل آج ہے ساری زباں　　اس سبب اردو زباں کی برتری اچھی لگی
لا مثالی نقش ہے یہ قطب شاہی دور کا　　اے دکن! اردو کی یہ دیوانگی اچھی لگی

'اظہار محبت' نظم میں شاعر کے مثبت فکر وخیالات کو دیکھا جا سکتا ہے جسے انھوں نے اپنی بیٹی 'ادیبہ حسن' کی نذر کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

بیٹیوں کی جاں نثاری دلبری اچھی لگی　　ہر کسی کو یہ ادا یہ زندگی اچھی لگی
ہوگیا جو گھر منور بیٹیوں کی ذات سے　　مجھ کو اس گھر کی چہکتی روشنی اچھی لگی
کون کہتا ہے کہ بیٹی باپ پر ایک بوجھ ہے　　جب کہ شاہ دو جہاں کو لاڈلی اچھی لگی

مشہور ومعروف ادیب وشاعر ڈاکٹر عطا عابدی، مظہر وسطوی کی شاعری کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''مظہر وسطوی کے یہاں ذات وکائنات کے بنیادی حوالے ترجیحی نوعیت رکھتے ہیں۔ انسانی ہمدردی، انسانیت نوازی، غیرت مندی، دل ودوراں کے حوالے، تلخ حقائق کی صورت گری، اصلاحی شعار وشعور کی رونمائی روایات کی حسین قدریں، جمالیاتی فکری پیشکش اور عصر آشنا افکار 'پنے تفہیم' کی شاعری کا خاصہ ہیں۔''

نذرالاسلام نظمی اور کامران غنی صبا نے بھی ان کے شعری مجموعے پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا ہے:

'پنے تفہیم' کے مطالعہ کے بعد اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مظہر وسطوی کی شاعری

صرف عشق و عاشقی، پیار و محبت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں اخلاص، ہمدردی، انسانیت، اخلاقیات، زندگی کے نشیب و فراز، غم و جدائی، اسلامیات ان تمام پہلوؤں کو انھوں نے شعری جامہ پہنایا ہے۔''

اس کتاب کا انتساب شاعر نے نئی تشکیلات کے نمائندہ شاعر اور اپنے استاد محترم جناب قوس صدیقی کے نام کیا ہے۔ جو ان کی سعادت مندی کی دلیل ہے۔

رسائل و جرائد

ادب و ثقافت (ششماہی جرنل)

مدیر: پروفیسر محمد ظفر الدین

شمارہ: مارچ 2021

صفحات: 368، قیمت: ندارد

ناشر: مرکز مطالعات اردو ثقافت، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مبصر: ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی، میاں سرائے سنبھل، یوپی

ہندوستان میں 'مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی' کو اس کی علمی خدمات کی وجہ سے جو مقام حاصل ہے۔ وہ اظہر من الشمس ہے۔ یہ یونیورسٹی تعلیمی کارگردگی کی وجہ سے تو اعلیٰ مقام کی حامل ہے ہی، اس کے ساتھ ہی یہاں سے شائع ہونے والا ششماہی جرنل 'ادب و ثقافت' بھی علمی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس وقت اس جرنل کا شمارہ 12 بابت مارچ 2021 میرے پیش نظر ہے جس کی ابتدا ایڈیٹر کی تحریر 'شذارت' سے ہوتی ہے۔ ان سطور میں مدیر محترم نے جرنل کے مشمولات کا تعارف کرایا ہے۔ اس کے بعد مضامین و مقالات شروع ہوئے ہیں۔ یہ مقالات کس قدر معیاری اور اعلیٰ درجے کے ہیں اور ان کو تحریر کرنے والے حضرات اردو کی کتنی قد آور شخصیات ہیں ان کا اندازہ لگانے کے لیے سطور ذیل میں ان مضامین و مصنفین کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

اس جرنل میں کل انیس 19 مقالات شامل ہیں جن کا تعارف اس طرح ہے 'اردو رسم الخط کی لسانی اور تہذیبی معنویت، پروفیسر عبدالستار دلوی۔ سفر شاہانہ دہلی و رام پور و لکھنؤ، ڈاکٹر عقیل ہاشمی۔ نصرتی کی قصیدہ نگاری، پروفیسر بیگ احساس۔ صدماتی فکشن اور مرگ انبوہ کا بیانیہ، پروفیسر علی رفاد فتیحی۔ داستان کا فن، ابن کنول۔ تحریک آزادی کا تاریخی و سماجی جائزہ؛ اردو صحافت کے تنقیدی تناظر میں، پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی۔ اردو لسانیات: ماضی تا حال، پروفیسر محمد جہانگیر وارثی، ڈاکٹر محمد ابواللیث صدیقی: جامعات ہند اور شعبۂ اردو (اے ایم یو) کا پہلا پی ایچ ڈی، ڈاکٹر شمس بدایونی۔ ہندوستان کا سپوت، ہندوستانی شاعر: ساحر، ڈاکٹر سلمان عابد۔ سرسید کی تعلیم: پس منظر اور پیش منظر، ڈاکٹر خان احمد فاروق، اودھ میں اردو زبان کے تہذیبی و ثقافتی ادارے، ڈاکٹر احمد خان، اردو زبان میں اسلامیات کی تدریس و تحقیق، ڈاکٹر شکیل احمد، علی سردار جعفری کی ادبی صحافات، ڈاکٹر سید ابو ذر علی، خواتین ناول نگاروں کے یہاں مزاحمتی عناصر، ڈاکٹر نشاں زیدی، ماہنامہ معارف کے دکنی مباحث، جناب اطہر حسین، اقبال کے فلسفیانہ افکار: ایک جائزہ، محترمہ ضیا تسلیم، خطّہ پیر پنجابی کے نثر نگاروں کی تخلیقات میں مقامی معاشرت اور بولیوں کے اثرات، منظور حسین، ڈاکٹر انور معظم کی تصنیف، عندلیپ گلشن نا آفریدہ، غالب کی فکری وابستگیاں: ایک مطالعہ، اسلم عمادی، کتب بینی میری فطرت ہے لیکن... پروفیسر محمد ظفر الدین۔

ان مضامین و مقالات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی اہمیت کے ساتھ ہی افادیت کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ مقالات کتنے اہم موضوعات پر تحریر کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مدیر مجلّہ کی صلاحیت انتخاب کی بھی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے اس گلدستے کی تزئین کاری کے لیے کن کن گلشنوں کے گلوں کا انتخاب کیا ہے۔ علم و تحقیق کے لیے گلہائے معطر یونہی نہیں جمع کر لیے گئے بلکہ ان میں کوئی گلشن تحقیق کا پھول ہے تو کسی کا تعلق چمن ہائے لسانیات سے ہے۔ اس طرح سے کچھ گلستان صحافت کے پھول ہیں تو کچھ وادی تنقید سے متعلق ہیں۔ اس لیے اس مجلّے کو گلہائے رنگا رنگ سے آراستہ گلدستہ کا نام دیا جا سکتا ہے یا پھر اس کو مختلف پھولوں سے مہکتا ہوا چمن کہا جائے گا۔

اس جرنل کا پہلا مضمون اردو کے رسم الخط پر ہے، جس کے مصنف عبدالستار دلوی ہیں۔ موصوف اردو ادب کی اہم شخصیت ہیں۔ اردو زبان پر آپ کا خاصا کام ہے۔ یہ مضمون بھی اسی نوعیت کا ہے۔ یہ تحقیقی بھی ہے اور تفصیلی بھی۔ موصوف نے اس میں رسم الخط پر بڑی عمدہ بحث کی ہے آپ نے اس بات (کہ اردو کتابوں کو ہندی رسم الخط میں منتقل کر دیا جائے) پر بڑی ہی عمیق نظر ڈالتے ہوئے اس کے نقصانات کو ظاہر کیا ہے اور اس کے منفی نتائج و عواقب کا گہرا جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں:

''اردو کتابوں کو دیوناگری میں منتقل کرنے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کا جہاں تک سوال ہے۔ یہ مسئلہ ادیبوں اور شاعروں کی تاجرانہ منصوبہ بندی کا شاخسانہ تو ہو سکتا ہے، مگر لسانی منصوبہ بندی کا ہرگز نہیں'' (مجلّہ ھٰذ۔ ص 14)

اس جرنل میں لسانیات کے تعلق سے ہی ایک مضمون محمد جہانگیر کا بھی ہے انھوں نے اپنے اس مضمون میں اردو کا بڑا تحقیقی جائزہ لیا ہے، اور لسانیات کی طویل فہرست میں اس کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو کی لسانی وسعت و خاصیت کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ''اردو کے اندر دوسری زبانوں کا اثر قبول کرنے کی قوت موجود ہے۔ وہیں دوسری زبانوں کو متاثر کرنے کی بھرپور صلاحیتیں بھی ہیں ان سب سے بڑھ کر اردو دوسری زبانوں کے اثرات کچھ اس انداز سے قبول کرتی ہے کہ اردو کا لسانی حسن زائل نہیں ہوتا بلکہ دوسری زبانوں سے اردو میں منتقل ہونے والے اثرات اردو کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔'' (مجلّہ ہذا، ص 150)

اس جرنل میں چند مضامین 'صحافت' کے تعلق سے بھی ہیں۔ پہلے مضمون میں تحریک آزادی کی صحافت اور دوسرے میں علی سردار جعفری کی ادبی صحافت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک مضمون میں خواتین ناول نگاروں میں مزاحمتی عناصر اور دوسرے مضمون میں اقبال کے فلسفیانہ افکار پر تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ مضمون بڑا ہی اہم ہے۔ چنانچہ اس مضمون سے بھی ایک اقتباس پیش کرنا نہایت ضروری محسوس ہو رہا ہے:

''اقبال نے حصول علم کے تین ذرائع فطرت، تاریخ اور مذہب بتائے ہیں۔ فطرت کے علم کا تعلق محسوسات کی دنیا سے ہے۔ جس کو حسی قوت سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اقبال کا تصور ہے کہ نظام اور فطرت کے پیچھے کوئی قوت کارفرما ہے جس کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے قرآن کریم کا مطالعہ ضروری ہے۔''

(مجلّہ ہذا، ص 328)

اس مجلّے کا ہر مضمون اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ چونکہ یہ تحقیقی نوعیت کے مضامین ہیں اس لیے ہر ایک مضمون کے آخر میں اس کے مآخذ و حوالہ جات کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ ان کو دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان گہر ہائے آبدار کو تراشنے میں ان کے خالقین نے کس درجہ محنت و مشقت اور جاں فشانی سے کام لیا ہے۔ دراصل اس طرح کے مقالات سطحی مطالعے یا محض کتابوں کی ورق گردانی سے عالم وجود میں نہیں آ جاتے بلکہ ان کو صفحۂ قرطاس پر لانے میں بڑی عرق ریزی اور ذہنی اذیتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

مختصر طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ زیر تبصرہ مجلّہ ہر طرح مطالعے کا مستحق ہے۔ امید ہے کہ محبین اردو اور باذوق حضرات اس مجلّے کو خرید کر اردو دوستی کا ثبوت دیں گے۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

پرسکون زندگی کے لیے تندرستی سب سے زیادہ ضروری: پروفیسر شیخ عقیل احمد

قومی اردو کونسل میں پروفیسر شیخ عقیل احمد اور پروفیسر مظفر علی شہہ میری کے ہاتھوں 'اناج سے صحت' نامی کتاب کا اجرا

نئی دھلی: کامیاب، پرسکون اور خوشحال زندگی کے لیے انسان کا صحت مند ہونا بہت ضروری ہے اور اس کے لیے اپنے طرز زندگی اور کھانے پینے کے نظام کو ایسا بنانا چاہیے جو صحت کو نقصان پہنچانے کے بجائے اس کے تحفظ کا ضامن ہو۔ انسانی زندگی میں صحت

کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے ہی کہا جاتا ہے کہ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے صدر دفتر میں 'سری دھانیہ: اناج سے صحت' نامی کتاب کے اجرا کے موقعے سے کیا۔ یہ کتاب معروف سائنس داں ڈاکٹر قادر ولی کے طبی تجربات اور علاج کے طریقوں پر مبنی ہے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ یہ کتاب ہمارے لیے بہت مفید ہے، جو ہمیں بتاتی ہے کہ اناجوں اور مختلف قسم کے پیڑ پودوں اور ان کے پتوں کو ہم اپنی بیماریوں کے علاج میں کس طرح استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ طریقۂ علاج آسان بھی ہے اور کم خرچ والا بھی ہے، آج جب کہ معمولی بیماریوں کے علاج کے لیے بھی ہمیں ہزاروں روپے خرچ کرنا پڑتے ہیں پھر بھی صحیح نتائج ملنا یقینی نہیں ہوتا۔ ایسے میں ہم اپنی شب و روز کی غذاؤں اور مختلف پیڑ پودوں کے پتوں اور ان کے عرق کا استعمال کرکے اپنی ہر قسم کی بڑی چھوٹی بیماری کا علاج کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اس موقعے پر کتاب کے مؤلف حافظ شیخ حمایت اللہ اور فیروز باشاہ کو مبارکباد پیش کی کہ انھوں نے اس میں اہم معلومات اکٹھا کر دی ہیں جو یقیناً قارئین کے لیے مفید ثابت ہوں گی۔ شیخ عقیل نے ان کے استاد اور ڈاکٹر عبدالحق یونیورسٹی کرنول کے سابق وائس چانسلر پروفیسر مظفر علی شہ میری کو بھی خصوصی طور پر مبارکباد پیش کی جن کی تعلیم و تربیت سے ان حضرات نے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ہے اور انھیں ہمیشہ پروفیسر موصوف کی رہنمائی حاصل رہی ہے۔

اس موقعے پر پروفیسر مظفر علی شہ میری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب دراصل ہندوستان کے ایک کامیاب ڈاکٹر و سائنس داں کے سائنسی و طبی تجربات پر مبنی ہے، جنھوں نے ایک عرصے تک امریکہ میں خدمات انجام دیں پھر اپنے ملک آگئے اور یہاں لوگوں میں صحت بخش اور نقصان دہ غذاؤں کے بارے میں بیداری پیدا کرنے اور مختلف بیماریوں کے قدرتی علاج کے لیے خود کو وقف کر دیا، یہ کتاب دراصل انھی کے تجربات اور علاج کے طریقوں اور وسائل پر مشتمل ہے، جسے میرے دو بہت عزیز شاگرد حافظ شیخ حمایت اللہ اور فیروز باشاہ نے مرتب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب میں پیش کردہ معلومات نہایت مفید ہیں اور اسے پڑھنے کے بعد نہ صرف ہم یہ جان سکتے ہیں کہ کون سی غذائیں ہماری صحت کے لیے مفید اور کونسی غذائیں نقصان دہ ہیں، بلکہ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس اناج سے ہم کون سی بیماری کا علاج کر سکتے ہیں، کونسے پتے کا عرق کس بیماری میں مفید ہے اور کس پھل کو کھانا ہمارے لیے مفید یا مضر ہے۔ انھوں نے اس موقعے پر قومی اردو کونسل اور ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا جن کی توجہ اور تعاون سے اس کتاب کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 29 مارچ 2022

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

خبر نامہ

ہندوستان اردو کا گھر ہے اور ہمیشہ رہے گا: اندریش کمار

حیدرآباد: ہندوستان میں اردو کی بقا کی وکالت کرتے ہوئے آر ایس ایس کے سینئر رہنما و مسلم راشٹریہ منچ کے سرپرست اندریش کمار نے کہا ہے کہ ہندوستان اردو کا گھر ہے

اور یہ ہمیشہ رہے گا۔ انھوں نے شعبہ اردو یونیورسٹی کالج آف ویمنس کوٹھی کی جانب سے بہ اشتراک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نواب میر عثمان علی خان بہادر بانی جامعہ عثمانیہ کی 136 ویں یوم پیدائش تقریب کی مناسبت سے منعقدہ سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس کے پہلے دن خطاب کرتے ہوئے کہا کہ زبانیں الگ الگ ہیں لیکن ہم ایک ہیں۔ زبان بھائی چارہ پیدا کرتی ہے۔ تعلیم آدمی کو انسان بناتی ہے۔ ہمارا وطن ہندوستان ہے اور تہذیب سے ہم ہندوستانی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم الگ الگ زبان، فرقے، ذات اور مذہب کے لوگ ہیں لیکن ہم سب کو جوڑنے والا اوپر والا ہے۔ اندریش کمار نے کہا کہ ہمارا راستہ نفرت نہیں بلکہ پیار، امن، محبت، تعلیم و تربیت ہے جبکہ فسادات سے بربادی ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ الگ الگ زبانوں، کردار اور جماعتوں کو جوڑنے والا ملک ہندوستان ہے۔ انسانیت کا یہ پیام ہے کہ ہم وطن سے محبت کرتے ہوئے زندگی گزاریں۔ ہمیں نفرتوں کو مٹانے، محبت، تعلیم اور وطن پرستی کا مزاج بنانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ حیدرآباد فسادات کا نہیں امن کا شہر ہے۔ ہمیں آپس میں بھائی چارہ اور وطن کی محبت کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ زبان میں بھید بھاؤ کرنے والا شیطان اور زبان میں محبت ڈھونڈنے والا انسان ہے۔ ملک ایک دوسرے کو جوڑنے اور کردار بنانے کا کام کرتا ہے۔ ملک کے بٹوارے کے وقت ایک بڑی آبادی نے ہندوستان چھوڑ کر پاکستان میں قدم رکھا تاہم ان کو مہاجر قرار دیا گیا۔ ایسے افراد کی تعداد ایک کروڑ 20 لاکھ ہے اور ان کی نسلوں کو اب تک شہریت نہیں دی گئی۔ انھوں نے کہا کہ حب الوطنی ایمان کا حصہ ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 مارچ 2022

اردو ادب میں ہندوستانیت

نئی دھلی: ایکشن فار ڈیولپمنٹ اینڈ ویلفیئر آف سوسائٹی اینڈ انوائرنمنٹ (ایڈاس) نئی دہلی کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے یک روزہ سمینار بعنوان 'اردو ادب میں ہندوستانیت' 20 مارچ 2022 کو شاہین باغ اوکھلا میں منعقد ہوا۔ سمینار کی صدارت ڈاکٹر واحد نظیر، اسسٹنٹ پروفیسر، اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے فرمائی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ 'اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے اور ہندوستانیت اس کا جوہر ہے جس کے بغیر اردو کا تصور ممکن نہیں۔ اس کی تعمیر و تشکیل سے لے کر اس کی نشو و نما اور شعرا و ادبا کی کوششوں سے اس ہندوستانیت کی آبیاری ہوئی ہے۔ ایڈاس کے سکریٹری جنرل جناب محمد جان نے صدر جلسہ، مقالہ نگاران اور شرکائے سمینار کا خیر مقدم کرتے ہوئے تنظیم کے اغراض و مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس یک روزہ سمینار کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر خان محمد رضوان نے انجام دیے۔ سمینار میں کل پانچ مقالات پیش کیے گئے جن میں ڈاکٹر حنا آفرین (سید محمد اشرف کے ناول آخری سواریاں میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر)، ڈاکٹر نوشاد عالم (ہندوستان کی سماجی و تہذیبی زندگی کا اہم شعری حوالہ شہر آشوب)، ڈاکٹر سعود عالم (دکنی قصائد میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت) ڈاکٹر قرۃ العین حیدر (آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی)، ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی (نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت) شامل ہیں۔ کنوینر جناب محمد جان کے شکریے کے ساتھ سمینار کے اختتام کا اعلان ہوا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 21 مارچ 2022

عربی زبان و ادب کے فروغ میں مدارس کا کردار

نئی دھلی: زبان کوئی بھی ہو اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، وہ ترسیل و تفہیم کا ایک ذریعہ ہوتی ہے، زبان کو کسی مذہب سے جوڑنا اس زبان کی وسعت کو محدود کرنے کے

مترادف ہے۔ عربی زبان ایک آفاقی زبان ہے، آج اس زبان میں روزگار کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے

ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے منعقدہ 2 روزہ قومی سمینار میں کیا۔ انھوں نے اپنے خطاب میں عربی زبان کی اہمیت وفضیلت بیان کرتے ہوئے اسے ایک ابدی زبان قرار دیا اور این سی پی یو ایل کی طرف سے اس زبان کی ترویج و اشاعت میں کی جانے والی سرگرمیوں پر بھی بھرپور روشنی ڈالی۔ صدر شعبۂ عربی اور سمینار کے ڈائرکٹر پروفیسر نعیم الحسن اثری نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں شرکائے سمینار اور مہمانان کرام وصدر تقریب کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے شعبہ عربی کی ہمہ جہت سرگرمیوں کا احاطہ کیا۔ اس 2 روزہ سمینار میں کل 40 علمی وتحقیقی مقالات پڑھے گئے جن میں عربی زبان وادب کے فروغ میں مدارس کے کردار کا بھرپور جائزہ لیا گیا اور تعلیم وتربیت کے میدان میں اہل مدارس کی فعالیت اور ان کے علمی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی۔ مدارس کے نصاب تعلیم اور مدارس میں پڑھائے جانے والے تمام علوم جیسے تفسیر، حدیث، فقہ، لغت نویسی، نظم ونثر، عروض وبلاغت اور ترجمے کے میدان میں مدارس کے فارغ التحصیل اساتذہ اور اسکالرز کے علمی کارناموں کو خوب سراہا گیا۔ مقالات پڑھنے والوں میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد ولکھنؤ کیمپس، لکھنؤ یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری، ذاکر حسین دہلی کالج، مارننگ و ایوننگ، اونتی پورہ کشمیر یونیورسٹی اور شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ وریسرچ اسکالرز شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 مارچ 2022

کلاسیکی غزل: شناخت وامتیازات

نئی دھلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیراہتمام غالب یادگاری خطبہ بعنوان 'کلاسیکی غزل: شناخت وامتیازات' کا انعقاد کیا گیا، جس میں خطیب خصوصی کے طور پر ماہر جمالیات

پروفیسر جمال حسین، سابق پروفیسر، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، مہمان خصوصی پروفیسر شیخ عقیل احمد، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور مہمان اعزازی پروفیسر سید سراج اجملی، پروفیسر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ شریک ہوئے۔ اس پروگرام کی صدارت ممتاز ناقد پروفیسر افضال حسین، سابق چیئرمین، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے کی۔ تمام مہمانوں کا استقبال آرٹس فیکلٹی، دہلی یونیورسٹی کی ڈین پروفیسر نجمہ رحمانی اور دیگر اساتذہ نے گلدستے پیش کر کے کیا۔

پروگرام کے آغاز میں شعبۂ اردو کی صدر اور آرٹس فیکلٹی کی ڈین پروفیسر نجمہ رحمانی نے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ یہ لمحہ میرے لیے بڑا تاریخی ہے۔ میں اکثر سوچتی تھی کہ قاضی برادران ہمارے شعبہ میں تشریف لائیں، میری دیرینہ خواہش آج پوری ہوئی ہے۔ آج کے موضوع پر قاضی برادران سے بہتر نام شاید نہیں ہو سکتا تھا۔

غالب یادگاری خطبہ کے کنوینر پروفیسر ابوبکر عباد نے قاضی برادران کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ قاضی افضال حسین صاحب کی علمی وفکری حصولیابی کے سامنے انھیں ملنے والے ایوارڈس اور مختلف ممالک کے اسفار لایعنی سے لگتے ہیں۔ قاضی افضال صاحب کا اتنا تعارف کافی ہے کہ آپ قاضی افضال حسین ہیں۔ آپ کی کتابوں اور مضامین ومقالات سے ہم سب واقف ہیں، صنفیات نامی کتاب بیانیے کے حوالے سے اہم کتاب ہے۔ قاضی جمال حسین صاحب بھی محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان کی کتابوں اور مضامین ومقالات کا مطالعہ ہم سب کرتے رہے ہیں۔ شعبۂ اردو اور اس کے طلبا وطالبات اور ہم سب خوش قسمت ہیں کہ آپ کو ہم سن رہے ہیں۔

خطیب خصوصی پروفیسر قاضی جمال حسین، سابق پروفیسر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنے خطبے میں کہا کہ غزل بت ہزار شیوہ ہے۔ ان چیزوں پر زیادہ توجہ ہونی چاہیے کہ وہ کیا عناصر ہیں، جن کی وجہ سے غزل کلاسیکی، جدید اور معاصر غزل کہلاتی ہے۔ غزل بت ہزار شیوہ ہے۔ اس پر گرفت کرنا، اسے پکڑ پانا مشکل کام ہے۔ شاعری جزو پیغمبری ہے۔ دراصل شاعری بھی مادیت سے متعلق نہیں ہوتی۔ اس لیے جزو پیغمبری اسے کہا جاتا ہے۔ یہ قول دراصل غزل کے لیے ہے۔ یوں تو نظم کے لیے بھی کہہ سکتے ہیں۔ کوئی مضمون خلا میں تخلیق نہیں ہوتا ہے۔ ہر اگلا مضمون پچھلے مضمون سے کسی نہ کسی طور منسلک ہوتا ہے۔ نئے مضمون کی تخلیق ہوا میں نہیں ہوتی، پرانے مضمون میں پھندا لگانا ہی نیا مضمون کہنا ہے۔ نئے مضمون کا تعلق پرانے جال سے ضرور ہوتا ہے۔ حالی نے کہا تھا کہ شاعری معنی آفرینی کا نام ہے۔ کلاسیکی شاعری سحر کاری، نکتہ آفرینی اور فلسفہ ودانش کا نام ہے۔ شاعری سحر وجادو ہے۔ شاعر کے اندر غیر معمولی قوت ایجاد ہوتی ہے۔ مفرد الفاظ کے معانی ہوتے ہیں، جو لغت تک محدود ہوتے ہیں۔ ایک لفظ کے ساتھ جب دوسرا لفظ رکھا جاتا ہے، تو دونوں میں برقی رو دوڑ جاتی ہے۔ یہی صنعت گری ہے جسے آتش مرصع سازی کا نام دیتے ہیں۔

مہمان ذی وقار پروفیسر سراج اجملی نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ ہم سب قاضی برادران کے عہد میں سانس لے رہے ہیں۔

مہمان خصوصی شیخ عقیل نے کہا کہ میں شعبہ اردو کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور صدر شعبہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے گھر میں مہمان خصوصی کے طور پر شریک کیا۔ میرے لیے شعبے میں اس طور شریک ہونا باعث اعزاز ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے، جس سے دوران طالب علمی میں ذرا سہما رہتا تھا۔ کلاسیکی شاعری کے لیے ضروری نہیں کہ میر کے عہد کی شاعری کو ہی کلاسیکی شاعری کہا جائے۔ ادب میں بہت سے اوہام بھی وضع کیے گئے ہیں، جن کا بروقت جواب نہیں دیا گیا۔ بت سازی اور بت گری کا کام ہر زمانے میں چلتا رہا ہے۔

قاضی افضال حسین نے اپنی صدارتی گفتگو میں کہا کہ اچھی شاعری کوئی بھی کر سکتا ہے۔ کلاسیکی شاعری کی ایک صفت معاشرے کا تہذیبی تصور ہے، جو کلاسیکی شاعری کا تصور ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان آنے کے بعد سب سے پہلے شاعری پر حملہ کیا اور کہا کہ یہ شاعری مہمل ہے۔ ہماری شاعری کا اصل تصور خدائی صفت حکمت میں ہے۔ کلاسیکی شاعری کی پہلی شناخت تہذیبی تصور ہے۔ مزاحیہ شاعری کو کبھی کلاسیکی شاعری نہیں کہا جاتا۔ کلاسیکی شاعری اخلاقی روایت کی توسیع بھی ہے۔ پروفیسر ارجمند آرا نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ خطبہ بنیادی طور پر طلبا وطالبات کے لیے تربیتی خطبہ تھا۔

بحوالہ: qindeelonline.com، 24 مارچ 2022

فارسی ماخذ میں شمال مشرقی ہندوستان

نئی دهلی: شعبۂ فارسی جواہرلعل نہرو یونیورسٹی کے زیراہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد ہوا۔ افتتاحی اجلاس میں پرفیسر کے ڈائرکٹر اور اسکول آف لینگویج کے ڈین پروفیسر مظہر آصف نے اپنے خطاب میں کہا کہ فارسی ماخذوں میں شمال مشرقی ہندوستان کی پوری تہذیب موجود ہے اوراس میں ریسرچ کے امکانات بہت زیادہ ہیں، لہٰذا محققوں اور دانشوروں کو اس طرف خصوصی توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ اس سیمینار میں فاضل مقرر کی حیثیت سے پروفیسر املیند وچکر برتی نے شرکت کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر ریویندر کمار شریک ہوئے۔ مہمان اعزازی کے طور پر پروفیسر ہیرامن تیواری نے شرکت کی اور سیمینار کے موضوع سے متعلق گفتگو کی۔ اس سیمینار میں کل پانچ سیشن ہوئے۔ پہلے سیشن کی صدارت اسکول آف لینگویج کے ڈین پروفیسر مظہر آصف نے کی۔ اس نشست میں کل چھ مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر بجل علی، ڈاکٹر ناصر رضا، پروفیسر انور خیری، ڈاکٹر شاہین، ڈاکٹر عتیق الرحمٰن اور ریسرچ اسکالر محمد شہواز احمد نے مقالے پڑھے۔ دوسری نشست کی صدارت پروفیسر انور خیری نے کی۔ اس سیشن میں ڈاکٹر اخلاق آزاد، ڈاکٹر عبدالسلام، ڈاکٹر مظہر الحق، ڈاکٹر اریہنت کمار، محمود مرہون، محمد سوذیب اور بینش آزاد نے مقالے پڑھے۔ تیسری نشست کی صدارت ڈاکٹر علاء الدین شاہ نے کی، اس نشست میں کل آٹھ مقالے پڑھے گئے۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر اشفاق چاند، ڈاکٹر راجیش، ڈاکٹر سرور علی، ڈاکٹر شہباز عامل، علی اصغر، فاطمہ معصومہ، طاہر علی اور محمد فہد کے نام قابل ذکر ہیں۔ چوتھی نشست کی صدارت پروفیسر ناصر رضا خاں نے کی اوراس میں آٹھ مقالے پیش کیے گئے۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر علاء الدین شاہ، ڈاکٹر محسن علی، ڈاکٹر ذوالفقار علی، ڈاکٹر عبدالواسع، چنگیز خاں، انتخاب عالم اور صدام حسین کے نام اہم ہیں۔ اخیر میں اس سیمینار کے کوآرڈی نیٹر اور شعبۂ فارسی کے استاد ڈاکٹر شہباز عامل نے فرداً فرداً تمام صدور، مقالہ نگاران کے علاوہ تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 مارچ 2022

اکیسویں صدی عیسوی میں عرب خواتین کی ناول نگاری

نئی دهلی: مرکز برائے عربی وافریقی مطالعات، جے این یو نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اور عربی مجلہ 'الجیل الجدید' کے اشتراک سے سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس بعنوان 'اکیسویں صدی عیسوی میں عرب خواتین کی ناول نگاری' اسکول آف لینگویج لٹریچر اینڈ کلچرل اسٹڈیز، جے این یو کے سیمینار ہال میں منعقد کیا گیا۔ افتتاحی پروگرام کی صدارت اسکول آف لینگویج لٹریچر اینڈ کلچرل اسٹڈیز کے ڈین پروفیسر مظہر آصف نے کی، جب کہ کلیدی خطبہ جدہ یونیورسٹی کی استاد ڈاکٹر فائزہ احمد الحربی نے پیش کیا۔ مرکز کے صدر پروفیسر ڈاکٹر رضوان الرحمٰن نے تعارفی کلمات پیش کیے اور کانفرنس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ موجودہ صدی میں زندگی کے ہر میدان میں خواتین عظیم خدمات انجام دے رہی ہیں، عربی زبان وادب میں بھی عرب خواتین نے ناول نگاری میں اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے، کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے جدہ یونیورسٹی کی استاد ڈاکٹر فائزہ احمد الحربی نے کہا کہ دوسری زبان کے تخلیقی ادب کی طرح عربی زبان میں بھی خواتین ناول نگار مردوں کے دوش بدوش کھڑی ہیں، موجودہ صدی میں عرب خواتین ناول نگاروں نے نسوانی حقوق جیسے مسائل کو اپنی تخلیقات میں شامل کیا ہے، اور ان کی تخلیقات کو دوسری زبانوں میں بھی منتقل کیا جارہا ہے۔ خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے پروفیسر مظہر آصف نے شعبۂ عربی جے این یو کو اس حساس موضوع پر بین الاقوامی کانفرنس منعقد کرنے کے لیے مبارکباد پیش کی اور کہا کہ دنیا کے سامنے عرب خواتین کے تخلیقی کارنامے کو پیش کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ پروگرام کے اخیر میں شعبۂ عربی کی استاد ڈاکٹر زرنگار نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد کانفرنس کی پہلی نشست اسکول آف لینگویج لٹریچر اینڈ کلچرل اسٹڈیز کے سیمینار ہال میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب تاج الدین ندوی نے کی، جبکہ ڈاکٹر سعید الرحمٰن استاد عالیہ یونیورسٹی کلکتہ نے نظامت کی، اس نشست میں چھ مقالے پیش مختلف موضوعات پر پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 مارچ 2022

عربی زبان وادب کے فروغ میں علمائے اودھ کا کردار

نئی دهلی: ہندوستان میں عربی زبان وادب کی تعلیم وترویج میں ہندوستانی علما وادبا کے زریں کارناموں سے انکار کی گنجائش نہیں ہے، عہد قدیم سے لے کر ہنوز دریائے گومتی کے کنارے آباد شہر لکھنؤ اپنی تہذیب وثقافت کے لیے پوری دنیا میں مشہور ہے، شہر لکھنؤ ریاست اودھ کا دارالسلطنت بھی تھا اور علم وادب کا مرقع بھی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر مسعود انور علوی سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کیا۔ وہ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے زیراہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند کے مالی تعاون سے منعقدہ پندرہواں خورشید فارق میموریل لیکچر بعنوان 'عربی زبان وادب کے فروغ میں علمائے اودھ کا کردار' پر توسیعی خطبہ پیش کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ سرزمین اودھ کو عربی زبان وادب کے فروغ میں غیر معمولی شہرت حاصل ہے، عربی زبان وادب کی ترویج واشاعت میں یہاں کے علما وادبا کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ صدر شعبہ اور لیکچر کے منتظم اعلیٰ پروفیسر نعیم الحسن اثری نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ انھوں نے شرکائے بزم کا والہانہ استقبال کرتے ہوئے شعبۂ عربی کی خدمات سے شرکا کو روشناس کرایا۔ قبل ازیں خورشید فارق یادگاری خطبہ کا تعارف شعبہ کے سینئر استاذ پروفیسر سید حسنین اختر نے کرایا، انھوں نے شعبۂ عربی ڈی یو کی عربی زبان وادب کی خدمات پر بالتفصیل روشنی ڈالی اور یادگاری خطبے کی اہمیت بتائی۔ تقریب کی نظامت شعبہ کے استاذ ڈاکٹر محمد اکرم نے بحسن وخوبی انجام دی۔ لیکچر کی صدارت پروفیسر نجمہ رحمانی، صدر شعبۂ اردو، ڈین فیکلٹی آف آرٹس، دہلی یونیورسٹی نے کی۔ کلمات تشکر شعبہ کے گیسٹ فیکلٹی ڈاکٹر جسیم الدین نے پیش کیے۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ، جے این یو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی، ذاکر حسین دہلی کالج، دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ کے علاوہ شعبۂ اردو وعربی کے اساتذہ وریسرچ اسکالرز موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 مارچ 2022

اردوادب میں اہم مقامات وکردار

نئی دهلی: ورلڈ اردو ایسوسی ایشن نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ہندوستانی زبانوں کا مرکز جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے اشتراک سے 'اردو ادب میں اہم مقامات و کردار: پس منظر، تاریخی اور تہذیبی اہمیت' کے موضوع پر دو روزہ بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد کیا۔ اس سیمینار کی خاص بات یہ رہی کہ پہلے دن کا پروگرام زوم میٹنگ کے ذریعے آن لائن منعقد ہوا جس میں مصر کی مختلف جامعات کے علاوہ ازبکستان اور پاکستان سے اساتذہ نے اپنے مقالات پیش کیے۔ جن میں ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا، پروفیسر جلال السعید الحفناوی، ڈاکٹر مروہ لطفی، ڈاکٹر ایمان شکری، ڈاکٹر بسنت شکری، ریحاب مصطفی، علیا

عبدالعظیم، وردۃ سعودی اور ہما شہزادی شامل ہیں۔ دوسرے دن کا پروگرام جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں بحسن وخوبی تکمیل کو پہنچا۔ ورلڈ اردو ایسوی ایشن کے چیئرمین پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنے استقبالیہ کلمات میں سمینار کے موضوع کی اہمیت ومعنویت پر روشنی ڈالی۔ ساتھ ہی انھوں نے ورلڈ اردو ایسوی ایشن کی سرگرمیوں کا ذکر بھی کیا۔ پروفیسر اوم پرکاش چیئرپرسن ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جے این یو کے افتتاحی کلمات سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ جب کہ پروفیسر انور پاشا نے انتہائی پرمغز کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ زبان وادب کی بھی اپنی ایک قلمرو ہوتی ہے جہاں اس کی اپنی حکمرانی ہوتی ہے۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک اور پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور اس موضوع کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایڈوکیٹ خلیل الرحمٰن نے کہا کہ کسی بھی زندہ زبان میں ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے اور اردو کی خوبی یہ ہے کہ اس کا ارتقائی سفر جاری ہے اور اس کے دامن میں بہت وسعت ہے۔ پروفیسر ابن کنول نے پروگرام کی صدارت فرمائی اور ڈاکٹر محمد رکن الدین نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ پہلے اور دوسرے سیشن میں مختلف جامعات کے اساتذہ اور اسکالرس مقالہ نگار کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ پروفیسر غضنفر علی، پروفیسر ثروت خان، ڈاکٹر سلیم محی الدین، ڈاکٹر سعود عالم، ڈاکٹر محمد حسین، ڈاکٹر امتیاز علی علیمی، ڈاکٹر نوشاد منظر، ڈاکٹر امیر حمزہ، جناب آلوک کمار اور مشرف رضا نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر بہت اہم مقالے پیش کیے۔ پروفیسر غضنفر، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، ایڈووکیٹ خلیل الرحمٰن، پروفیسر ثروت خان اور ڈاکٹر اطہر فاروقی نے صدارت کے فرائض انجام دیے جبکہ پہلے سیشن میں ڈاکٹر مہوش نور نے اور دوسرے میں شہباز رضا نے نظامت کی۔ اس موقعے پر ورلڈ اردو ایسوی ایشن پریس کے زیراہتمام شائع شدہ کتاب 'کرناٹک میں اردو: ماضی اور حال' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 16 مارچ 2022

اردو لسانی، ثقافتی اور مذہبی شناخت کی عالمی علامت

نئی دهلی: نئی سیما پوری واقع کمیونٹی سینٹر میں 'اردو لسانی وثقافتی اور مذہبی شناخت کی عالمی علامت' عنوان سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ڈاگر رورل ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے اشتراک سے سمینار منعقد کیا گیا جس میں تقریباً 12 مقالے پیش کیے گئے، اردو زبان کی تہذیب وثقافت کے حوالے سے امام الدین نے مقالہ پیش کیا جبکہ ڈاکٹر مامون عبدالعزیز استاذ محکمہ تعلیم دہلی نے اردو کی تہذیبی وثقافتی علامتیں کے حوالے سے مدلل بحث کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان ہماری تہذیب کی علامت ہے جو مختلف مراحل طے کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے اردو زبان اور ہندوستانی تہذیب کے حوالے سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان اپنے اس ورثے کی بدولت ہندوستان کے تمام مذاہب میں مقبول عام رہی ہے۔ ان کے علاوہ شاہد اقبال، شمیم احمد، صائمہ خانم اور سعود عالم وغیرہ نے بھی اپنے مقالوں کو بھرپور طریقے سے پیش کیا۔ کلیدی خطبہ میں علی احمد ادریسی نے اردو کی لسانی اور ثقافتی نشو ونما اور عالم گیریت کے اسباب پر پرمغز اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاگر رورل ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے اراکین ومعاونین کو مبارکباد پیش کی۔ صدارتی خطبہ ڈاکٹر معصوم رضا نے جبکہ شرکا اور حاضرین کے تئیں اظہار تشکر شیرا تومر نے پیش کیا۔ سمینار میں ایس ایچ او سیما پوری ونے یادو، کونسلر موہنی جینوال، لورلیس ماڈل سٹی دہلی کی رینو یادو، صدر کلدیپ چودھری پروگرام کو آرڈینیٹر اور بحیثیت مہمان شامل تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 مارچ 2022

آزادی ہند اور اردو شاعری

نئی دهلی: گنجریا اتحاد ویلفیئر سوسائٹی کے زیراہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے جامعہ اہل سنت جوہر العلوم گنجریا کے سمینار ہال میں 'آزادیِ ہند اور اردو شاعری' کے مرکزی موضوع پر یک روزہ قومی سمینار کا انعقاد ہوا جس میں پروفیسر محبوب عالم، مفتی احمد رضا مصباحی، مولانا مشتاق نوری، ماسٹر طیب فرقانی، مفتی منظر محسن، مولانا محسن نواز، جناب مبارک علمی، ماسٹر عبدالواحد مخلص، ماسٹر اظہار انور، پروفیسر عزیر احمد، پروفیسر علیم الدین شاہ اور دیگر اہل علم نے شرکت کی اور اپنے علمی وادبی، قیمتی اور مفید مقالے پیش کیے۔ سمینار میں بطور مقالہ نگار شریک ہونے والے اسکالرز نے اپنے وقیع مقالہ جات پیش کیے۔ یہ سمینار پروفیسر محمد علیم الدین شاہ ہیڈ شعبہ اردو چوپڑا کالج، چوپڑا، مغربی بنگال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سب سے پہلے پروفیسر محبوب عالم نے 'آزادی ہند اور جوش ملیح آبادی' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور مفتی احمد رضا مصباحی نے 'حسرت موہانی کی شاعری بحوالہ آزادی ہند' کے عنوان سے اپنا وقیع مقالہ پیش کیا۔ مولانا مشتاق نوری نے 'جدوجہد آزادی اور بسمل کی حدی خوانی' پر اور ماسٹر طیب فرقانی نے 'آزادیِ ہند اور چکبست' کے عنوان پر اپنے مفید مقالے پیش کیے۔ مفتی منظر محسن نے 'مولانا محمد علی جوہر کی شاعری بحوالہ آزادیِ ہند' کے عنوان پر اپنے مقالے سے سامعین کو محظوظ کیا۔ بعدہ مولانا محسن نواز نے اپنا مقالہ بعنوان: 'جدوجہد آزادی کے واقعات اور اردو شاعری' اور جناب مبارک علمی نے اپنا مقالہ بعنوان 'آزادیِ ہند اور اردو قطعات' پیش کیا، جب کہ ماسٹر عبدالواحد مخلص نے 'اشفاق اللہ خان کی شاعری بحوالہ آزادیِ ہند' پر اپنے قیمتی مقالے سے روشنی ڈالی۔ ماسٹر اظہار انور نے 'آزادیِ ہند اور فلمی نغمات' پر اپنا مقالہ پڑھا۔ آخری مقالہ نگار کی حیثیت سے پروفیسر عزیز احمد، شعبہ اردو اسلام پور کالج تھے۔ صدارتی خطبہ پروفیسر محمد علیم الدین شاہ، ہیڈ شعبہ اردو، چوپڑا کالج، چوپڑا نے پیش کیا جس میں انھوں نے مقالہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کی اور سمینار کے منتظمین کی ستائش کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 15 مارچ 2022

اردو کے فروغ میں قاضی عدیل عباسی کی خدمات

نئی دهلی: عدیل عباسی وہ مجاہد آزادی ہیں جو آزادی کے بعد اردو کی لڑائی میں بھی سینہ سپر رہے۔ جنگ آزادی میں اردو کے حوالے سے عدیل عباسی مرحوم کی خدمات کی

بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار نور اللہ خان چیئرمین گریٹ انڈیا ویلفیئر فاؤنڈیشن نے ملی ماڈل اسکول میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے اردو کے فروغ میں قاضی عدیل عباسی کی خدمات کے موضوع پر منعقد ایک سمینار میں کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سلمان فیصل نے کہا کہ قاضی صاحب نے اردو کے ساتھ

دینیات کی خاطر مکاتب کا جال بھی بچھایا اور وہاں اردو کی شمع جلائی جہاں اندھیرا بہت تھا۔ ڈاکٹر شاہ نواز فیاض نے کہا کہ آپ نے نہ صرف اردو پر کام کیا، بلکہ ادارہ سازی بھی کی، دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش اس کی زندہ مثال ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اپنے تحقیقی مقالے میں کہا کہ قاضی صاحب نے ملت کی خاطر خود کو کئی محاذوں پر رکھا۔ محمد علام الدین نے کہا کہ قاضی صاحب کی خدمات کا فائدہ یہ ہوا کہ اردو تو زندہ ہوئی۔ ساتھ ہی مکاتب کے قیام سے بچوں میں دینیات کی تعلیم کو فروغ ملا۔ ڈاکٹر علی احمد ادریسی نے کہا کہ قاضی صاحب قومی سطح کے عظیم دانشور تھے جن کے کارنامے ہمہ جہت ہیں۔ ایسی شخصیت کے کارناموں کو مشن کے طور پر سامنے رکھنا چاہیے تاکہ اردو کے فروغ کے ساتھ سماج کی تعمیر بھی ہو سکے۔ صدارت پروفیسر عمران احمد عندلیب، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ڈاکٹر علی احمد ادریسی، اسسٹنٹ پروفیسر دہلی یونیورسٹی نے کی۔ مہمان اعزازی کے طور پر صحافی سہیل انجم نے شرکت کی۔ نظامت ڈاکٹر فیضان شاہد نے کی اور اخیر میں خالد سہیل نے سبھی مہمانان، مقالہ نگار اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 مارچ 2022

اردو ادب وصحافت کا حالیہ منظر نامہ

نئی دہلی: الہند تعلیم جدید فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام اردو ادب وصحافت کا حالیہ منظر نامہ کے عنوان سے یک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا، افتتاحی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر سید فاروق نے کی جبکہ نظامت کے فرائض الہند تعلیم جدید فاؤنڈیشن کے صدر مفتی افروز عالم قاسمی نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں بطور مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ اردو زبان کو کسی طرح کی مشکلات کا سامنا نہیں ہے لیکن اردو کا موجودہ ادبی وصحافتی منظر نامہ حوصلہ افزا بھی نہیں ہے اور اسے بہتر کرنے کی ذمہ داری اہل اردو کی ہے، انھوں نے کہا کہ ہمیں اپنی مادری زبان کے تحفظ اور فروغ کے لیے جتنی سنجیدگی کا مظاہرہ کرنا چاہیے وہ مفقود ہے جس کی وجہ سے اردو زبان کو گوناگوں چیلنجز درپیش ہیں۔ معروف اسکالر اور دانشور پروفیسر اختر الواسع نے بھی اردو ادب وصحافت کو بہتر اور معیاری بنانے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہم اپنی مادری زبان سے رشتہ توڑ کر کوئی بھی کامرانی اور ترقی نہیں حاصل کر سکتے، الہ آباد ہائی کورٹ کے سابق جج شبیہ الحسنین نے کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے ہم اپنی وسعت وصلاحیت کے مطابق جتنی بھی کوشش کر سکتے ہیں ضرور کرنی چاہیے اور نہ صرف نئی نسل کو اس زبان کی تعلیم دی جائے بلکہ روزمرہ کی گفتگو میں بھی ہمیں اردو الفاظ اور جملوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا چاہیے۔ معروف صحافی معصوم مرادآبادی، پروفیسر عبدالقیوم انصاری، حاجی تاج محمد وائس چیئرمین اردو اکادمی، پروفیسر شہپر رسول وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ صدارتی خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ اردو ہماری مادری زبان ہے اور ہر انسان کو اپنی ماں اور مادری زبان سے بے پناہ محبت ہوتی ہے جس کا عملی اظہار بھی ضروری ہے۔ دوسرا سیشن مقالات کا پروفیسر ابوبکر عباد کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں اردو ادب وصحافت کے حالیہ منظر نامہ کے مختلف پہلوؤں پر ریسرچ اسکالرس نے اپنے مقالات پیش کیے جن میں مظفر حسین غزالی (الیکٹرانک میڈیا اور اردو صحافت)، ڈاکٹر منور حسن کمال (اردو ادب و صحافت کا مستقبل)، ڈاکٹر انیس الرحمٰن قاسمی (موجودہ دور میں اردو ادب وصحافت کے فروغ میں علما کا کردار)، عبدالباری قاسمی (اردو تنقید وتحقیق کا حالیہ منظر نامہ)، ڈاکٹر محمد مستمر (اردو صحافت کے موجودہ تدریسی مسائل)، ڈاکٹر یوسف رامپوری (مدارس میں اردو زبان وادب کی صورت حال اکیسویں صدی کے حوالے سے)، نایاب حسن (سوشل میڈیا اور اردو ادب وصحافت)، ڈاکٹر شاذیہ عمیر (اردو شاعری کی موجودہ صورت حال)، ڈاکٹر ارشاد سیانوی (رواں صدی میں اردو ناول)، حقانی القاسمی (موجودہ صدی میں اردو کے ادبی رسائل)، ڈاکٹر نوشاد منظر (اکیسویں صدی میں اردو افسانہ) وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ پروفیسر ابوبکر عباد نے صدارتی خطاب میں تمام مقالات پر مختصر تبصرہ کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 مارچ 2022

دہلی کے اسکولوں میں اردو کی صورت حال

نئی دہلی: مریم ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے افضل حسین آڈیٹوریم دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر دہلی میں 'دہلی کے اسکولوں میں اردو کی صورت حال' کے موضوع پر ایک اہم سمینار منعقد ہوا، جس میں پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر صابر علی فیکلٹی آف ڈینٹسٹری جامعہ ملیہ اسلامیہ اور کوآرڈینیٹر نصرین بیگم مینیجنگ ٹرسٹی مریم ایجوکیشن اینڈ سوشل ٹرسٹ نئی دہلی کے علاوہ کثیر تعداد میں دیگر حضرات بھی شریک تھے۔ اس موقعے پر پروفیسر خواجہ اکرام الدین جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے صدارتی خطاب میں کہا کہ یہ سمینار اپنے موضوع کے اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔ سبھی مقالہ نگاروں نے دہلی میں اردو کی صورت حال اردو تدریس کے مسائل پر بات کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان ہی نہیں سبھی زبانوں کے ساتھ مسائل ہیں اور ان کی مجلس میں موضوع بحث ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں مسائل کا جائزہ لیتے وقت مثبت رخ کا بھی ذکر کرنا چاہیے۔ پروگرام میں ڈاکٹر اشونی کمار ایسوسی ایٹ پروفیسر سوشل ورک جامعہ ملیہ اسلامیہ بطور مہمان اعزازی، جب کہ ایم ڈی ابو اسامہ آئی آر ایس، ایڈیشنل کمشنر ڈائرکٹر جنرل آف آڈٹ کسٹم اینڈ ان ڈائرکٹ ٹیکسز نئی دہلی بحیثیت مہمان ذی وقار موجود تھے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر زاہد احسن کی 'اردو شاعری میں حب الوطنی' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ سمینار میں ڈاکٹر محمد عمر فاروق جامعہ ملیہ اسلامیہ، محمد ابرار جامعہ ملیہ اسلامیہ، ڈاکٹر فیضان شاہد، ڈاکٹر زاہد احسن، ڈاکٹر محمود فیصل اور ڈاکٹر خالد مبشر وغیرہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔ پروگرام کی نظامت زبیر خان سعیدی نے انجام دی اور اظہار تشکر مترجم و سماجی کارکن خالد سہیل نے کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 مارچ 2022

سلام مچھلی شہری کی شاعری عصری تناظر میں

نئی دہلی: سلام مچھلی شہری کو ہم سب نے فراموش کر دیا ہے۔ ان کی شاعرانہ شناخت کو ہم سب کو نظر میں رکھنا ہوگا۔ سلام ترقی پسندی کے دور میں ایک رومانی شاعر تھے۔ یہ

باتیں معروف ناقد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر شہزاد انجم نے سلام مچھلی شہری کی شاعری کے موضوع پر منعقدہ قومی سمینار کے افتتاحی سیشن میں بطور

مہمان خصوصی تھیں۔ یہ سمینار معروف سماجی تنظیم پہل درشٹی (رجسٹرڈ) آزاد پور اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت برائے تعلیم، حکومت ہند کے اشتراک سے گرین ٹریز پبلک اسکول اوکھلا، نئی دہلی میں منعقد کیا گیا تھا۔ سمینار میں اردو کے اہم ناقدین اور ادیبوں نے شرکت کی اور اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ سبھی مقررین نے سلام مچھلی شہری کے صد سالہ یوم پیدائش کے تناظر میں منعقدہ اس سمینار کے لیے پہل درشٹی کی ستائش کی۔ مہمانوں کا استقبال سماجی تنظیم پہل درشٹی کے سکریٹری اور سمینار کے کنوینر جناب خالد رضا خاں نے کیا اور سلام کی شخصیت اور شاعری پر بھی مختصراً اظہار خیال کیا۔ سمینار کی صدارت کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد جناب فاروق ارگلی نے کہا کہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ کسی نے تو سلام کو پچاس برسوں بعد یاد کیا۔ ان کے یہاں ترقی پسندی اور رومانیت کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ سمینار کے مہمان اعزازی بزرگ شاعر اور صحافی سلیم شیرازی نے کہا کہ سلام کی شاعری اپنے عہد کی ترجمان ہے۔ سمینار میں کلیدی خطبہ معروف ناقد اور دہلی یونیورسٹی کے استاد پروفیسر محمد کاظم نے پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خطبے میں سلام کی شاعری اور شخصیت کا تفصیلی محاسبہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ سلام کے صحیح مقام کو متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ سمینار کے تکنیکی سیشن کی صدارت کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر ندیم احمد نے کہا کہ سلام مچھلی شہری کا نام ہمیشہ ایک اہم شاعر کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ سلام کے صد سالہ یوم پیدائش پر یہ سمینار ایک بہترین خراج عقیدت ہے۔ حقانی القاسمی نے اپنے خطاب میں سلام کی شاعری پر مختصراً اظہار خیال کیا۔ ان کے علاوہ سراج عظیم، ارشد ندیم، ڈاکٹر نشاں زیدی، ڈاکٹر عبدالحی، ڈاکٹر فرغانہ، عبدالواحد، اطہر انصاری، ڈاکٹر شاہنواز فیاض، محمد ابودردا، زبیر خاں سعیدی نے بھی پر مغز مقالے پیش کیے۔

سمینار کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر خان محمد رضوان نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ ٹی ایم ضیاء الحق کے کلمات تشکر سے یہ سمینار اختتام کو پہنچا۔ سمینار میں سماجی کارکن تھانیشور دیال، اشوک کمار، دیپک گپتا، معروف شاعر اور ادیب جناب راشد جمال فاروقی، ڈاکٹر شاہنواز حیدر شمسی، فیض الاسلام فیضی، شہباز اختر، محمد اشرف، عامر رضا خاں کے علاوہ دہلی کی یونیورسٹیوں کے طلبا اور عمائدین شہر کی قابل لحاظ تعداد موجود تھی۔

پریس ریلیز: پہل درشٹی (رجسٹرڈ)، نئی دہلی 7 مارچ 2022

اردو میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کا استعمال

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے ایک سمینار 'دورِ حاضر میں جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کا اردو میں استعمال: مسائل اور حل' کے موضوع پر منعقد ہوا۔ ہوٹل انمول ضلع بجنور میں منعقد پروگرام میں مہمان خصوصی ضلع اقلیتی بہبود افسر نوشاد، مدرسہ بورڈ حکومت ہند کے ممبر مفتی شمعون قاسمی چنگاری کے ایڈیٹر سوریہ منی، الخدمت سوسائٹی کی سکریٹری حنا صدیقی وغیرہ نے سمینار سے خطاب کیا۔ آخر میں حنا صدیقی نے مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 مارچ 2022

اردو شاعری میں عشق کی ایمائی کیفیت

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی کے معروف تعلیمی ادارے سینٹ اسٹیفنز کالج میں یک روزہ سمینار بعنوان 'اردو شاعری میں عشق کی ایمائی کیفیات' کا انعقاد ہوا۔ شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر اور معروف افسانہ نگار پروفیسر ابن کنول نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ سمینار کا موضوع ہماری مشرقی تہذیب سے تعلق رکھتا ہے۔ آرٹس فیکلٹی کی ڈین اور شعبۂ اردو کی صدر پروفیسر نجمہ رحمانی نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو کے کلاسیکل شعرا کے کلام میں عشق کی متعدد کیفیات ملتی ہیں۔ سمینار کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیم احمد نے کہا کہ اردو کے شعرا نے محبوب کے ساتھ ساتھ وطن اور سماج سے بھی عشق کیا ہے۔ سمینار میں گیارہ مقالے پیش کیے گئے۔ پروفیسر مشتاق قادری نے 'اقبال کی شاعری میں عشق رسول'، پروفیسر محمد ساجد حسین نے 'عشق رسول اور اردو کلام'، ڈاکٹر احمد امتیاز نے خواجہ میر درد کا تصور عشق: چند معروضات'، ڈاکٹر علی احمد ادریسی نے 'اقبال کا تصور عشق'، ڈاکٹر ناصرہ سلطانہ نے 'داغ کی شاعری میں تصورِ عشق'، ڈاکٹر عطیہ رئیس نے 'حسرت کا تصورِ عشق'، ڈاکٹر سطوت اللہ خالد نے 'اسرار الحق مجاز کی عشقیہ شاعری'، 'ڈاکٹر عبدالرحمن نے 'مثنویاتِ میر کا پسندیدہ موضوع: عشق'، ڈاکٹر صبا عنبرین نے 'فیض کی شاعری میں عشق کی کیفیت'، توحید حقانی نے 'میر حسن کی مثنوی سحرالبیان میں نوجوان کرداروں کا عشق' اور شمیم احمد نے 'میر تقی میر کی غزلیات میں عشق کا بیان' کے موضوع پر مقالے پیش کیے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے منعقدہ اس سمینار میں دہلی یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ، ریسرچ اسکالر، طلبہ وطالبات اور شعبۂ تاریخ کی ڈاکٹر شیبا کاظمی اور شعبۂ فارسی کے ڈاکٹر ظفر امام بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 مارچ 2022

21 ویں صدی کی خواتین فکشن نگار

نئی دھلی: خواتین کسی بھی فیلڈ میں کمتر نہیں، اکیسویں صدی میں خواتین کی ادبی تخلیقات مردوں سے کم نہیں اور وہ ادب کے میدان میں مردوں کے شانہ بشانہ چل رہی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار شاہین باغ میں ڈریمس انڈیا ریسرچ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام اور قومی

کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے منعقد تقریب میں مقررین نے کیا۔ شاہین باغ کے گرین ٹریز پبلک اسکول میں منعقد '21 ویں صدی کی خواتین فکشن نگار' یک روزہ سمینار کی صدارت ڈاکٹر خان محمد آصف ایسوسی ایٹ پروفیسر گوتم بدھ یونیورسٹی، نوئیڈا یوپی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر خان رضوان نے انجام دیے۔ خیر مقدمی کلمات زبیر خان سعیدی نے ادا کیے۔ ڈریمس انڈیا ریسرچ فاؤنڈیشن کے چیئرمین انبساط رانا نے کہا کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے خواتین کے تعلق سے 21 ویں صدی کی خواتین فکشن نگار جیسے موضوع پر ایک کامیاب سمینار کے انعقاد کا موقع ملا۔ خان محمد آصف نے صدارتی خطبے میں کہا کہ عورت کا تعلق فطرت اور تخلیقیت سے ہے۔ مرد جو کچھ تخلیق کا اظہار کرتا ہے اس کا مقصد تسخیر ہوتا ہے۔ جب کہ عورت فطرت کے مطابق تخلیق کرتی ہے۔ معروف ادیب و نقاد حقانی القاسمی نے کہا کہ عہد تبدیل ہوتا ہے تو احساس و اظہار کے زاویے بھی بدل جاتے

ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک زمانہ تھا جب خواتین چاک قفس سے باغ کی دیوار دیکھا کرتی تھیں، مگر اب پوری دنیا ہی عورتوں کے لیے باغ و بہار ہے۔ اب عورت بہت حد تک آزاد بھی ہے۔ ڈاکٹر سعود عالم نے '21 ویں صدی کی خواتین فکشن نگار: ایک جائزہ' کے موضوع پر اپنے مقالے میں کہا کہ خواتین تخلیق کار اپنے جذبات کی ترجمانی فکشن کے ذریعے بہتر طریقے سے کرسکتی ہیں۔ ساجدہ خاتون نے 'اکیسویں صدی کی خواتین ناول نگار: ایک جائزہ' کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ اردو فکشن نگاری کی دنیا میں ناول کو اہم مقام حاصل ہے۔ انھوں نے کہا خواتین کی ناول نگاری کی ابتدا 19 ویں صدی کی آخری دہائی میں ہوئی۔ غزالہ فاطمہ نے ترنم ریاض کی تانیثی فکر کے عنوان سے کہا کہ ترنم ریاض کسی مکتبہ فکر سے وابستہ نہیں تھیں، لیکن ان کی کہانیوں میں استحصال کا موضوع سب سے نمایاں ہے۔ ریسرچ اسکالر عبدالباری قاسمی نے نعیمہ جعفری پاشا کی فکشن نگاری، ڈاکٹر نوشاد منظر نے 21 ویں صدی میں خواتین اردو افسانہ نگار ہندوستان کے تناظر میں'، ڈاکٹر مسرت نے غزالہ قمر اعجاز کا افسانوی فن، آسیہ خان نے '21 ویں صدی کی خواتین فکشن نگار' کے موضوع پر اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عبدالحی، ڈاکٹر سرفراز جاوید، ڈاکٹر امتیاز علیمی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں آسیہ خان نے ڈاکٹر شیخ عقیل احمد ڈائرکٹر قومی اردو کونسل کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ سیمینار کے اختتام پر سلام الدین خان نے ڈریمس انڈیا ریسرچ فاؤنڈیشن کے ذریعے منعقد کیے گئے سیمینار میں بھی ریسرچ اسکالروں اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 8 مارچ 2022

شاہ ولی اللہ میموریل لیکچر

نئی دھلی: مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات، جے این یو نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے آٹھواں سالانہ شاہ ولی اللہ علی میموریل لیکچر بعنوان 'قرآن کے انگریزی تراجم: مسائل و رجحانات' اسکول آف لینگویج لٹریچر اینڈ کلچرل اسٹڈیز کی کمیٹی روم میں منعقد کیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، ڈائرکٹر کے اے نظامی مرکز برائے قرآنی مطالعات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شریک ہوئے، جبکہ پروگرام کی صدارت پروفیسر دھنجی سنگھ ایسوسی ایٹ ڈین اسکول آف لینگویج نے کی۔ پروگرام کی کنوینر، مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات کی استاد ڈاکٹر زنگار نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ مرکز کے صدر پروفیسر ڈاکٹر رضوان الرحمن نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہندوستان میں اسلامیات اور عربی زبان و ادب کا ایک مشہور نام ہے، اسی مناسبت سے آٹھ سال قبل اس سالانہ لیکچر کی بنیاد رکھی گئی تھی، جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، آج کا موضوع قرآن کے انگریزی تراجم مسائل و رجحانات بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے کہا سترہویں صدی کے نصف آخر میں قرآن کا پہلا انگریزی ترجمہ ہوا، اس کے بعد سے لے کر اب تک سیکڑوں ترجمے ہو چکے ہیں۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر دھنجی سنگھ نے کہا کہ قرآن، بھاگوت گیتا و اپنیشد کے انگریزی ترجمے بہت پہلے سے ہو رہے ہیں، مغل شہزادہ دارا شکوہ نے قرآن و بھاگوت گیتا کے مشترکہ ترجمہ کی کوشش کی تھی، مذہبی کتابوں کا ترجمہ کرتے وقت سخت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ پروگرام کے اخیر میں شعبۂ عربی کے استاد ڈاکٹر محمد اختر عالم نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا، اس پروگرام میں شعبۂ عربی کے اساتذہ و ریسرچ اسکالرس و طلبہ کثیر تعداد میں شریک تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 مارچ 2022

بلونت سنگھ کی ادبی خدمات

دھلی: بلونت سنگھ پر سیمینار آج کی ضرورت ہے اور ایسے ادیبوں کی وجہ سے ہمارا ادب مقبول رہا ہے۔ بلونت سنگھ اردو افسانے کی ایک شناخت ہیں اور ان کے ذکر کے بغیر

اردو افسانے کی تاریخ مکمل نہیں کہی جاسکتی ہے۔ یہ باتیں گرین ٹریز پبلک اسکول، اوکھلا میں یوتھ پاٹھ شالہ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام قومی اردو کونسل کے تعاون سے منعقدہ سیمینار بعنوان 'بلونت سنگھ کی ادبی خدمات' کے افتتاحی سیشن کی صدارت کرتے ہوئے معروف ناقد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر شہزاد انجم نے کہیں۔ سیمینار کے مہمان خصوصی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے استاد پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ بلونت سنگھ کی کہانیوں میں زمینی حقیقتیں پوری شدت کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ سیمینار میں کلیدی خطبہ معروف افسانہ نگار اور ناقد ڈاکٹر ذاکر فیضی نے پیش کیا۔ انھوں نے بلونت سنگھ کی پوری زندگی کا محاکمہ کیا اور بلونت سنگھ کی کہانیوں کا بھی تجزیہ پیش کیا۔ سیمینار میں بطور مہمان اعزازی مسلم ایڈوائزر کمیٹی کے ممبر اور اے اینڈ ایس فارمیسی کے مینیجنگ ڈائرکٹر حکیم عطاء الرحمان اجملی نے اردو زبان کے فروغ سے متعلق اپنی کوششوں اور تجربوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج ہمیں سیمناروں کے ساتھ ساتھ زمینی سطح پر اردو کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر ابن کنول، سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی نے تکنیکی سیشن کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ آج کے مقالے بہت محنت سے لکھے گئے تھے اور بلونت سنگھ کو بہت طویل عرصے کے بعد کسی نے یاد کیا ہے۔ سیمینار میں معروف شاعر اور ناقد ڈاکٹر ذکی طارق، ڈاکٹر حنا آفرین، ڈاکٹر خان محمد رضوان، ٹی ایم ضیا ڈاکٹر عبدالحی، ڈاکٹر مظہر حسنین، ڈاکٹر فرحانہ، عائشہ پروین، ڈاکٹر مسرت، ڈاکٹر نوشاد منظر، ڈاکٹر امتیاز احمد علیمی، مزمل شبلی، شہلا پروین اور عبدالباری قاسمی نے اپنے مقالے پیش کیے۔ سیمینار کی نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے انجام دی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 9 مارچ 2022

پروفیسر ولی اختر ندوی: شخصیت اور کارنامے

نئی دھلی: پروفیسر ولی اختر ندوی کی زندگی کی تمام جہات سبق آموز ہیں، خواہ وہ درس و تدریس سے متعلق ہوں، یا اصلاح و تربیت سے، یا تصنیف و تالیف اور تقریر و تحریر سے، انھوں نے علم و ادب اور اصلاح و تربیت کے حوالے سے جو نقوش مرتسم کیے، وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر محمد ایوب تاج الدین ندوی نے کیا۔ وہ پروفیسر ہیومن ویلفیئر ڈیولپمنٹ سوسائٹی رجسٹرڈ کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت انسانی وسائل حکومت ہند کے مالی تعاون اور شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے اشتراک سے 'پروفیسر ولی اختر ندوی: شخصیت اور کارنامے' کے موضوع پر دہلی یونیورسٹی میں منعقدہ دو روزہ قومی سیمینار میں کلیدی خطبہ پیش کر رہے تھے۔ قبل ازیں خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے حاجی شمیم اختر نے کہا کہ پروفیسر ولی اختر کی شخصیت ایک علمی و ادبی

شخصیت تھی، ان کے علمی کارناموں سے ہر اہل علم واقف ہے، ان کی وفات نے جو خلا پیدا کیا، اس کی بھرپائی ناممکن ہے لیکن ان کے کارناموں سے عوام وخواص کو روشناس کرانا ان کے لیے بہترین خراج ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے آرٹ فیکلٹی کے سابق ڈین پروفیسر کفیل احمد قاسمی نے کہا کہ ولی اختر کی شخصیت اسم بامسمیٰ تھی، انھوں نے علمی و عملی زندگی میں نام پیدا کیا، وہ واقعی ولی صفت انسان تھے۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر ابن کنول نے 'ولی صفت ولی اختر ندوی' پر خاکہ پڑھتے ہوئے ان کی حیات کے شب وروز کی پرکشش منظرکشی کی، انھوں نے کہا کہ عموماً گاؤں سے نکلنے کے بعد جو لوگ شہر میں آباد ہو جاتے ہیں، وہ اپنی کشتیاں جلا دیتے ہیں، واپس نہیں لوٹتے، شہر کی چکاچوند میں کھو کر گاؤں کی گلیوں کو فراموش کر دیتے ہیں، لیکن دہلی جیسے شہر میں رہ کر بھی گاؤں ولی اختر کے دل میں بسا ہوا تھا۔ بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر وایسوسی ایٹ ڈین اسکول آف لینگویج پروفیسر شمس کمال انجم نے منظوم کلام میں خراج عقیدت پیش کیا۔ سیمینار کے مہمان خصوصی پروفیسر زبیر احمد فاروقی نے کہا کہ ولی اختر زمانۂ طالب علمی سے ہی نہایت ذہین وفطین تھے، ان کے اساتذہ ان کی ذہانت و فطانت کے قائل تھے۔ میں نے ان کی ذہانت کو بارہا اس طرح پرکھا کہ جب میں 'ثقافۃ الہند' کا مدیر تھا تو میں ہر دو یا تین ماہ کے وقفے سے ان سے کوئی مقالہ یا کسی مقالے کا ترجمہ لکھواتا تھا اور جب میں اسے چیک کرتا تو ان کی تصحیح کے لیے مجھے معمولی محنت کرنا پڑتی تھی۔ کیرالہ سے آئے سیمینار کے مہمان خصوصی ڈاکٹر حسین مداور نے اپنے خطاب میں کہا کہ ولی اختر کی سب سے بڑی خدمت عربی زبان وادب کی ترویج واشاعت عصری تناظر میں تھی، انھوں نے عربی سیکھنے والوں کے لیے انگلش میڈیم میں قواعد کی کتابیں لکھیں، جو کئی یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہیں۔ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر نعیم الحسن اثری نے شعبہ کی طرف سے تمام مہمانان کا پرجوش استقبال کرتے ہوئے پروفیسر ولی اختر کے علمی کاوشوں پر روشنی ڈالی اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کا ذکر کیا۔ کلمات تشکر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر مجیب اختر نے پیش کیے۔ پروگرام کی نظامت سیمینار کے کوآرڈینیٹر پروفیسر مجیب الرحمٰن جے این یو نے انجام دی۔ بعدازاں سیمینار کے متوازی علمی نشستیں ہوئیں جن میں چودہ مقالات پڑھے گئے۔ مقالہ پڑھنے والوں میں پروفیسر عبدالماجد قاضی، پروفیسر مجیب الرحمٰن، ڈاکٹر شمس کمال انجم، ڈاکٹر شفیع ہاشم کویت، شیخ علی اختر مکی، ثمینہ خانم، پروفیسر توقیر احمد خان، پروفیسر محمد کاظم، پروفیسر علیم اشرف خان، پروفیسر نعیم الحسن اثری، ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر شمیم احمد، پروفیسر محمد اقبال حسین ندوی کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 مارچ 2022

لکھنؤ کا نمائندہ شاعر: جلال لکھنوی

لکھنؤ: جلال لکھنوی ہماری کلاسیکی ادبی تہذیب کے ایسے نمائندے کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے مطالعے کے بغیر ہم اپنی شعری روایت کی تفہیم کا پورا حق ادا نہیں کر سکتے۔ دیگر بہت سے شعرا کے مقابلے میں جلال کا ادبی مرتبہ اس لیے بھی امتیازی قرار پاتا ہے کہ انھوں نے شعرگوئی کے علاوہ اردو زبان اور فن شعر سے متعلق نثری تصانیف کی صورت میں بھی گراں بہا کارنامے انجام دیے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر احمد محفوظ نے آواز چیریٹیبل ٹرسٹ آف انڈیا کے زیراہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے 'لکھنؤ کا نمائندہ شاعر: جلال لکھنوی' کے موضوع پر منعقد سیمینار میں کلیدی خطبے کے دوران لکھنؤ کے آل انڈیا کیفی اعظمی اکیڈمی میں کیا۔ صدارتی

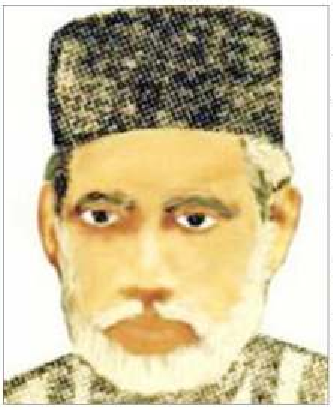

خطاب میں پروفیسر احسن الظفر نے کہا کہ ہماری شعری روایت اور تہذیب کے ایک اہم شاعر کے طور پر جلال کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ نئی نسل بھی اس طرح کے اہم موضوعات پر نہ صرف لکھ رہی ہے بلکہ اپنا ایک واضح نظریہ بھی رکھتی ہے۔ پروفیسر ندیم احمد نے جلال لکھنوی کو ایک اہم شاعر قرار دیتے ہوئے کہا کہ دبستان لکھنؤ کے جن شعرا کا ذکر تواتر کے ساتھ ہوتا ہے ان میں جلال لکھنوی کا ایک اہم نام ہے۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے کہا کہ جلال محض شاعر نہیں تھے بلکہ شاعر کے ساتھ ساتھ لغت اور زبان پر غیرمعمولی دسترس رکھتے تھے اور اسی وجہ سے ان کے اشعار میں زبان و بیان کا ایک خاص لطف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نور فاطمہ نے کہا کہ ان کی شاعری کے مطالعے کا ایک پس منظر یہ بھی بنتا ہے کہ نئی نسل کو جلال کی شاعری پڑھ کر زبان کا سلیقہ، رعایت لفظی، مناسبات لفظی، صوتی آہنگ، محاوروں کی صحیح ادائیگی اور روزمرہ کی زبان کا غیرمعمولی استعمال سیکھنا چاہیے۔ تذکیر وتانیث اور مطالعۂ جلال کے موضوع پر ڈاکٹر شاہ نواز فیاض نے مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر محضر رضا نے کہا کہ جلال لکھنوی نے زبان اور لغت کے سلسلے میں جو کام کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ ڈاکٹر گلزار حسن نے کہا کہ لغت اور زبان و بیان کے باب میں جلال کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ محمد سعید اختر نے دبستان لکھنؤ کا اہم شاعر: جلال لکھنوی کے موضوع پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ جلال لکھنوی کی غزلیں عشق و محبت، رندی وسرمستی کے علاوہ صوفیانہ مضامین سے بھی عبارت ہیں۔ میر ضامن علی، جلال لکھنوی بطور رباعی گو کے موضوع پر مجتبیٰ حسن صدیقی نے مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ جلال نے کل 71 رباعیاں کہی ہیں جو مختلف روایتی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں، ان رباعیوں میں جلال کے استادانہ رنگ کا اظہار ہوا ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 20 مارچ 2022

لکھنؤ کا بدلتا ادبی منظرنامہ

لکھنؤ: اسٹار رائزنگ ویلفیئر فاؤنڈیشن کے زیراہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے یوپی پریس کلب، لکھنؤ میں یک روزہ سیمینار بعنوان 'لکھنؤ کا بدلتا ادبی منظرنامہ' منعقد کیا گیا۔ سیمینار میں اردو زبان وادب اور فکشن کی معروف اور اہم شخصیات نے شرکت کی اور اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ سبھی مقررین نے اردو زبان میں اردو زبان وادب کی اہمیت پر بے حد پرمغز گفتگو کی اور اردو میں ایسے موضوع پر سیمینار کے لیے فاؤنڈیشن کو مبارکباد دی۔ سیمینار میں صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے ایس رضوان، سابق سکریٹری اترپردیش اردو اکادمی نے کہا کہ اردو زبان وادب کو آخر ہم کس طرح اپنے بچوں اور طالب علموں کے لیے دلچسپ بنا سکتے ہیں اور اردو کے عام قاری تک اس کی کس طرح رسائی کر سکتے ہیں اس پر بھی سوچنے کی ضرورت ہے۔ مہمان خصوصی عائشہ صدیقی نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو کے فروغ میں کتب خانوں کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے اور کتب خانوں کی اہمیت وافادیت کسی دور میں کم نہیں ہو سکتی، چاہے دنیا کتنی ہی ترقی کر جائے چاہے ادب کے بدلتے

منظرنامے میں لوگ انٹرنیٹ واٹس ایپ کی دنیا کے بادشاہ ہی کیوں نہ بن جائیں مگر جو سکون واطمینان ان کو کتب خانوں میں ملتا ہے وہ دنیا کی کوئی ویب سائٹ نہیں دے سکتی۔ مہمان ذی وقار شاہنواز قریشی نے کہا کہ اردو زبان سے ہماری بے اعتنائی بڑھتی گئی تو دنیا ایک شیریں زبان اور اس کی تہذیب سے محروم ہوجائے گی۔ سمینار کا آغاز اسٹار رائزنگ ویلفیئر فاؤنڈیشن کی جنرل سکریٹری اور سمینار کی کنوینر شہناز خان کے خیرمقدمی کلمات سے ہوا۔ سمینار کے مقالہ نگاران ڈاکٹر سیما صدیقی، صحافی غفران نسیم، صحافی ضیاء اللہ صدیقی، موسیٰ رضا وغیرہ نے اپنے قیمتی اور پرمغز مقالات میں مشترکہ طور پر کہا کہ اردو زبان وادب کے مختلف موضوعات پر یونیورسٹیوں میں تحقیق ہونی چاہیے۔ سمینار میں مہمانان اعزازی، عبدالسلام صدیقی و ڈاکٹر شاداب عالم نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر منصور حسن نے نعت پاک پیش کی۔ دیگر معززین شہر میں ڈاکٹر مسیح الدین خان، ہمایوں چودھری، قمر سیتاپوری، محمد علی علوی، دانش خان، حنا خالد، نسرین حامد، شان اسلام، نزہت شہاب چشتی، ضیاء اللہ صدیقی ندوی، فرزانہ جلالی، عقیل فاروقی وغیرہ موجود تھے۔ آخر میں مہمانان اور مقالہ نگاران کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فاؤنڈیشن کے سکریٹری حنا خان نے کہا کہ سمینار کو کامیاب بنانے کے لیے سامعین اور منتظمین کا بھی دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔ سمینار کی خوبصورت نظامت اپنے مخصوص انداز میں کستوربا کنیا انٹر کالج کی استاد ڈاکٹر سیما صدیقی نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 مارچ 2022

لکھنؤ میں فن داستان گوئی

لکھنؤ: یوپی پریس کلب میں سہانہ جن کلیان سمیتی کے تحت 'لکھنؤ میں فن داستان گوئی پر ایک سمینار' کا انعقاد کیا گیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے ہوئے سمینار کی صدارت شہانہ سلمان عباسی نے کی اور بطور مہمانان خصوصی ڈاکٹر خورشید جہاں اور ڈاکٹر دیویندر شریواستو نے شرکت کی۔ سمینار میں نوجوان قلمکار ضیاء اللہ صدیقی ندوی نے اپنے مقالے میں متعدد داستانوں اور داستان گو کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی اہمیت، افادیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر مسیح الدین خان مسیح نے منظوم ومنثور داستانوں، مثنوی کی مختصر تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی تفریق وامتیاز سے حاضرین کو واقف کرایا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر خورشید جہاں نے داستان گوئی وادب کی دیگر اصناف پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ داستان گو کا انداز بیان مربوط موضوع سامعین کو لطف اندوز کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے علم میں اضافہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر دیویندر شریواستو نے کہا کہ ان کے گھر میں اردو کا ماحول رہا، ان کے والد، دادا سبھی اردو فارسی کا علم رکھتے تھے۔ شہانہ سلمان عباسی نے خطبہ صدارت میں مقالہ نگاروں، مقررین کی گفتگو کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کی محافل نئی نسل کو ادب، ثقافت، زبان وتاریخ سے واقف کرانے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ سمینار میں نظامت محمد غفران نسیم نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 مارچ 2022

اردو زبان وادب کا فروغ

دیوبند: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے ارچنا گرام ادھیوگ سنستھان کے زیراہتمام ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر سینئر صحافی ڈاکٹر شاہد زبیری نے اردو سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی زبان کا کسی مخصوص مذہب یا فرقے سے تعلق نہیں ہوتا زبان علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اردو زبان بھی کسی مخصوص مذہب اور فرقے سے تعلق نہیں رکھتی اور واحد ایسی زبان ہے جو ملک کے طول و عرض میں آج بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے اردو زبان کے فروغ میں قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی خدمات کی ستائش کی۔ پروگرام میں اظہار خیال کرتے ہوئے تحریک سماجی تنظیم کے صدر ارشد قریشی نے کہا کہ اردو زبان کے فروغ میں سماج کے تمام طبقات کا نمایاں کردار رہا ہے۔ مولانا آصف ندوی کھتولوی نے ماحولیات کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہر زبان کے ادب میں اس موضوع پر کچھ نہ کچھ ملتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج ماحولیات ایک مسئلہ ہے اردو زبان میں اس مسئلہ پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اپنے صدارتی کلمات میں پشپندر سنگھ نے کہا کہ زبانیں ہم سب کا مشترکہ ورثہ ہیں۔ انھوں نے اردو کی نفاست اور نزاکت کا ذکر کیا اور کہا کہ اردو بولنے والے کی زبان میں مٹھاس اور شیرینی ہوتی ہے جو سننے والے کے کانوں میں رس گھولتی ہے۔ سمینار کی صدارت پشپندر سنگھ نے کی اور نظامت پروگرام کے کنوینر ارچنا رانی نے انجام دی۔ دریں اثنا مہمانوں کو اسناد اور مومنٹو پیش کیے گئے۔ پروگرام کی کنوینر ارچنا نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 12 مارچ 2022

جگر مرادآبادی کی ادبی حیثیت

مرادآباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے مالی تعاون سے ایک روزہ قومی سمینار زیراہتمام ریاجن کلیان سمیتی جگر مرادآبادی کی ادبی حیثیت موضوع پر مہاراجہ ہریش چندر ڈگری کالج کے کانفرنس ہال میں منعقد کیا گیا جس کی سرپرستی کرتے ہوئے مہاراجہ ہریش چندر ڈگری کالج کے مینیجر نے اس طرح کے ادبی پروگراموں کی زیادہ سے زیادہ ضرورت پر زور دیا۔ نظامت کے فرائض سینئر صحافی ومشہور شاعر سید ہاشم علی

قدوسی نے انجام دیے۔ سمینار میں مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اسد مولائی نے جگر مرادآبادی کی زندگی پر روشنی ڈالی وہیں سمینار کے کنوینر ڈاکٹر عبدالرب صدر شعبۂ اردو نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ سمینار میں مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر شاکر حسین ومفتی باقر علی نعیمی نے جگر صاحب کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مرادآباد کی سرزمین پر پیدا ہوئے اور یہیں سے انھوں نے اپنا ادبی سفر شروع کیا۔ ترنم پروین بدایونی وریحانہ پروین نے جگر کو ایک عظیم الشان شاعر بتایا۔ ڈاکٹر ضیاء الحق فہیم وڈاکٹر منصور احمد صدیقی نے اپنے مقالوں میں کہا کہ جگر ایک عظیم شاعر تھے۔ ان کی شاعری پر جتنی گفتگو کی جائے وہ کم ہے کیونکہ جگر نے اپنی شاعری سے دنیا میں اپنا نام روشن کیا ہے۔ سمینار کے مہمان خصوصی سدھیر کمار، محمد مظاہر خاں، نے مشترکہ طور پر اس طرح کے سمینار ہوتے رہنے کی وکالت کی۔ مہمان خصوصی ترنم عقیل نے کہا کہ جگر مرادآبادی کے حوالے سے جتنا بھی کام کیا جائے، کم ہے۔ انھوں نے ادب کی دنیا میں مرادآباد کو زندہ رکھنے کی جو کوشش کی اس کو سراہا

جائے۔ سمینار کی صدارت کررہے عالمی شاعر منصور عثمانی نے جگر کو ایک عظیم انسان شاعر و مقرر کا درجہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ جگر کی وجہ سے آج شاعری زندہ ہے۔ انھوں نے ادب کے لیے بہت کام کیا ہے۔ یہ سمینار قابل ستائش ہے۔ سمینار کے اخیر میں ریا جن کلیان کمیٹی کے سکریٹری نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 مارچ 2022

پروفیسر شمیم حنفی کی ادبی خدمات

ہردوئی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے مالی تعاون سے شہر ہردوئی کی ادبی وسماجی تنظیم رائل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام ایم آر پبلک اسکول بارہ کھمبا سندیلہ ضلع ہردوئی میں بعنوان 'پروفیسر شمیم حنفی کی ادبی خدمات

کا تحقیقی مطالعہ' یک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر عبدالسمیع اسسٹنٹ پروفیسر بی۔ ایس ڈگری کالج ہردوئی نے شرکت کی۔ سمینار کی صدارت شاہجہاں پور کے ادیب، شاعر اور ادبی رسالہ 'افق نو' کے مدیر ڈاکٹر عشرت صغیر نے کی۔ موصوف نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ شمیم حنفی کی شخصیت ایک عہد کا نام ہے جو باقاعدہ سنجیدہ تحقیق کا تقاضا کرتا ہے۔ اس حوالے سے موصوف نے اپنی زیر تصنیف کتاب کا بھی حوالہ دیا جس کی اشاعت سے شمیم حنفی کی شخصیت کے بہت سے تشنہ پہلوؤں کو سیرابی ملے گی۔ سمینار کے مجوزہ اجلاس میں عبدالقدوس خان گویا منووی ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی، ڈاکٹر کلیم ہردوئی نے اپنے تحقیقی وتنقیدی مقالات پیش کرکے شمیم حنفی کی ادبی جہات اور شخصیت کا احاطہ کیا۔ سمینار کی نظامت لکھنؤ کی مشہور سوشل ورکر ڈاکٹر عارفہ خاتون نے کی۔ سمینار میں شامل دیگر مہمانوں میں کاشف، آدیتم پرتاپ سنگھ، راکیش ورماجی، مہندر، اشتیاق وغیرہ نے شرکت کی پروگرام کا اختتام کالج کے منیجر اشفاق صاحب کے شکریہ کے ساتھ ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 مارچ 2022

ادب اطفال: کل، آج اور کل

امروهه: ارتھ واستو ایسٹر دہلی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو کے تعاون سے رائل بینکٹ ہال امروہہ میں ایک نیشنل سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس سمینار کا موضوع تھا۔ ادب اطفال کل- آج اور کل تھا، جس کی صدارت ڈاکٹر شعیب رضا خاں وارثی ڈپٹی ڈائرکٹر این آئی او ایس نے کی اور ماہر تعلیم ماسٹر اسرار احمد صاحب مہمان خصوصی کے طور پر شریک رہے جب کہ نظامت کے فرائض حارث خان نے انجام دیے۔ اس شاندار سمینار میں چار مقالے پڑھے گئے۔ جن کا موضوع تھا اسمٰعیل میرٹھی اور درسی کتابیں جس کے مقالہ نگار ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں تھے۔ بچوں کا ادب آج اور کل عنوان پر ڈاکٹر آصف علی میرٹھ یونیورسٹی نے مقالہ پیش کیا۔ بچوں کے ادب کی صورت حال کو ڈاکٹر ظہیر رحمتی دہلی نے قلم بند کیا اور اردو میں ادب اطفال اور خواتین پر ڈاکٹر شاذیہ خان امپیکٹ کالج رامپور نے مقالہ پیش کیا۔ ماہر تعلیم اسرار احمد نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو میں موجودہ دور میں بچوں کے ادب کی صورت حال اطمینان بخش نہیں ہے۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو پرانے رویوں سے باہر نکلنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر شعیب رضا خاں وارثی نے کہا کہ بچوں کا ادب انتہائی ضروری ہے۔ سمینار کے اختتام پر ڈاکٹر صدف بی نے تمام مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ اس سمینار میں سید سبطین رضا نقوی ایڈوکیٹ اور امروہہ کے دیگر اہل علم کے علاوہ بڑی تعداد میں بچوں نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 15 مارچ 2022

اردو ادب میں امروہہ کی خدمات

امروهه: جعفر پبلک اسکول امروہہ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام ایک روزہ سمینار کا اہتمام بعنوان 'اردو ادب میں امروہہ کی خدمات' کے عنوان سے کیا گیا جس میں نامور مقررین، مقالہ نگار حضرات اور شعراء کرام نے اپنے خیالات پیش کیے اور اردو زبان کی ترقی میں امروہہ کی حصہ داری پر خیالات پیش کیے۔ اس سمینار کی صدارت ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی مہمان اعزازی کے طور پر سابق چیئرمین ڈاکٹر افسر پرویز موجود رہے۔ سمینار میں اقبال خاں، شہاب انور اور جاوید اقبال، زبیر ابن سیفی، قیصر مجتبیٰ وغیرہ نے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی نے کہا کہ سرزمین امروہہ ایک ادبی سرزمین کر کے طور پر جانی جاتی ہے، یہاں ہر دور میں اردو کو فروغ دینے والی شخصیات پیدا ہوتی رہی ہیں۔ مولانا عتیق الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ امروہہ اردو زبان کا گہوارہ رہا ہے۔ سابق چیئرمین افسر پرویز نے کہا کہ اردو زبان کو زندہ رکھنا ہم سب کی ذمے داری ہے۔ اتر پردیش اردو ادب سوسائٹی کے صدر کوثر علی عباسی نے کہا کہ اس شہر نے مصحفی امروہوی، جون ایلیا، رئیس امروہوی، حیات امروہوی اور عصر حاضر میں ڈاکٹر عظیم اور پروفیسر ناشر نقوی جیسے نامور شاعر اور پروفیسر نثار احمد فاروقی جیسا نقاد اور ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی جیسا نثر نگار دنیائے اردو کو دیا، جن کی خدمات قابل احترام ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 14 مارچ 2022

اردو شاعری میں علامت کربلا پر سمینار

سنبھل: یونٹی چلڈرن اکیڈمی سرسی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی اشتراک سے سمینار بعنوان 'اردو شاعری میں علامت کربلا' کے موضوع پر استاد شاعر انقلاب سرسوی کی صدارت میں کیا گیا، جس میں معروف ادبا، شعرا نے شرکت کی اور اپنے مقالات پیش کیے۔ سمینار میں سید اطہر صغیر تورج زیدی، چیئرمین فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ کلیدی خطبہ پروفیسر عباس رضا نیر جلالپوری نے دیا۔ استقبالیہ کلمات شبیہ عباس نقوی چیئرمین یونٹی چلڈرن اکیڈمی نے پیش کی۔ مسرت فاطمہ نے آغا امیر قزلباش کی غزل میں علامت کربلا پر مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر ایم اے معروف نے کہا کہ عربی زبان کے اس لفظ 'رثا' نے مرنے والوں کے کتنے اوصاف بیان کیے اور مرنے والوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے وہ اہل نظر جانتے ہیں۔ دہلی سے آئیں ڈاکٹر نشاں زیدی نے اپنے مقالے میں کہا کہ سرسی تو سنبھل ہی کی ایک بستی ہے مگر یہاں بے شمار شعرا ہیں جو اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حکیم برہان سنبھلی نے اردو شاعری میں علامت نگاری کے حوالے سے اردو شاعری کو تین ادوار میں مثالوں کے ساتھ پیش کیا۔ سید شیبان قادری امروہوی نے اپنے مقالے میں طرب ضیائی کی شاعری سے کربلا اور شہیدان کربلا کی عظیم شہادتوں کی یاد دلائی۔ آل طہٰ نے کہا کہ علامت کے استعمال میں ذرا سی چوک ہوئی تو سمجھئے کہ ثواب کی بجائے گناہ کے مستحق ہو جائیں گے۔ شبیہ عباس نقوی نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 مارچ 2022

اردو زبان کی بقااور ہماری ذمہ داری

کھتولی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے مظفر نگر جامعہ فیض ناصر ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام ہندوستان میں اردو زبان کی بقااور ہماری ذمہ داری کے عنوان سے ایک روزہ سمینار معارف العلوم بھسومہ کے میٹنگ ہال میں انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت قاری محمد سلیم نے اور مہمان خصوصی کے طور پر محبوب الٰہی نے شرکت کی۔ سیمنار سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر محمد اسلم نے کہا کہ اردو زبان وادب نے جہالت کو دور کرکے زندگی کو حسین اور باشعور بنایا ہے۔ اردو زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حق کی تلاش اور امن کا پیغام دیتی ہے اسلامی اسکالر مولانا آصف ندوی نے اردو زبان پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو زبان میں وہ طاقت ہے جو انسانی زندگی میں تبدیلی لاتی ہے۔ اردو زبان نے پوری دنیا میں انقلاب برپا کیا ہے۔ فیروز عالم، محمد سلیم، قاری محمد سمیر راؤ وغیرہ مقررین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت ماسٹر الطاف مشعل نے کی۔ سوسائٹی کے منیجر قاری محمد شاہد نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 مارچ 2022

نظیر اکبر آبادی کی شاعرانہ عظمت

آگرہ: بتاریخ 7 مارچ 2022 کو بیکنٹھی دیوی کنیا مہاودیالیہ آگرہ آڈیٹوریم میں بہ اہتمام شعبۂ اردو 'نظیر اکبر آبادی کی شاعرانہ عظمت اور عصر حاضر میں ان کی معنویت' کے موضوع پر یک روزہ سمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ سمینار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،

حکومتِ ہند نئی دہلی کے مالی تعاون سے کیا گیا۔ سمینار کے افتتاحی اجلاس میں صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر نسرین بیگم نے نظیر اکبر آبادی اور آگرہ کے حوالے سے مفصل روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ نظیر کے پاس ایک ٹٹو تھا اس پر بیٹھ کر شہر کے بنیوں کے بچوں کو پڑھانے جایا کرتے تھے۔ کلاں محل (جواب کالا محل کے نام سے مشہور ہے) سے لگا ہوا محلہ کشمیرن والی گلی جو اب کشمیری بازار ہے اور ماکھے بازار سے گزرتے تھے تو کوٹھے والیاں ان سے نظمیں مانگتی تھیں اور وہ انھیں مایوس نہیں کرتے تھے بلکہ رک کر انھیں نظمیں لکھ کر دیا کرتے تھے۔

کلیدی خطبہ میں ڈاکٹر راشد انور راشد استاد شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کہا کہ نظیر کی شاعری انسانی احساسات و جذبات کی ترجمان ہے۔ مہمانِ خصوصی سید اجمل علی شاہ نے کہا کہ اتحاد و اتفاق کے لیے نظیر کو یاد کرنا آج بہت ضروری ہے۔ مہمانِ اعزازی ڈاکٹر وکرم سنگھ سابق ڈپٹی کمشنر، اتر پردیش سرکار نے کہا کہ نظیر نے دو لاکھ نظمیں لکھیں، نظیر جیسے محبِ وطن شاعر پر بھارت کو فخر ہے۔

مہمانِ ذی وقار پروفیسر محمد ارشد ڈین اسٹوڈنٹس ویلفیر، صدر شعبۂ سماجیات وایسو سی ایٹ ڈین ریسرچ ڈاکٹر بھیم راو امبیڈکر یونیورسٹی آگرہ نے آج کی غریبی پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ نظیر نے روٹی کی اہمیت پر بات کی اور نظم روٹی نامہ لکھا۔ ڈاکٹر نفیس بانو سابق صدر شعبۂ اردو وسنت کالج وارانسی (بنارس ہندو یونیورسٹی) نے نظیر کی 'شعری کائنات میں غزل کی جلوہ گری' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ نظیر غزل کی شاہراہوں سے مست و بیخود ہو کر گزر رہے ہیں۔ پروفیسر رفعت جمال شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی نے اپنے مقالے 'مذہبی رواداری اور نذیر کی نظم نگاری' میں کہا کہ نظیر سبھی مذاہب کا احترام کرتے تھے، انھوں نے عوام کے دل کی بات کہی ہے، جو لوگوں کے دلوں تک ہمیشہ پہنچتی رہے گی۔ ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنے مقالے میں نظیر کی نظم اور غزل کے حوالے سے بات کی۔ پروفیسر جیوتسنا رگھوونشی نے 'عام آدمی کے عاشق نظیر اکبر آبادی' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر وجے شرما (متھرا) نے اپنے بصیرت افروز مقالے میں نظیر اور آگرے کے تعلق پر روشنی ڈالی۔

سمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد علی جوہر صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے فرمائی۔ اظہار تشکر کے فرائض ڈاکٹر ابتا تمّم کوآرڈینیٹر نے بہ حسن وخوبی انجام دیے۔ ظہرانے کے بعد سمینار کے دوسرے اجلاس کا آغاز ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر نفیس بانو اور پروفیسر رفعت جمال نے کی۔ اس سیشن میں ڈاکٹر فرح تبسم، ڈاکٹر زیبا فاروقی، محمد ارشد خان رضوی، سید فیض علی شاہ، عائشہ شمسی، سعدیہ سلیم، آفرین پروین اور دانشہ پروین نے مقالے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نسرین بیگم نے انجام دیے۔ اس موقعے پر رنگِ صلح کل آگرہ کی جانب سے نظیر کی نظموں کی پوسٹر نمائش بھی لگائی گئی۔ کالج کی طالبات نے نظیر کی نظم ہولی کو ترنم سے پیش کیا، اس کے علاوہ نظیر کی نظم بنجارہ نامہ کو کوشل چوپڑا اور آکاش مشرا نے ساز کے ساتھ اپنی خوبصورت آواز دی۔ اس موقع پر ڈاکٹر نسرین بیگم کی کتاب 'جوش ملیح آبادی کی نثری خدمات' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ مینیجنگ کمیٹی کے صدر جناب اودھیش کمار گپتا بھی موجود رہے۔ پرنسپل ڈاکٹر پونم سنگھ نے اختتامیہ تقریر کرتے ہوئے خصوصی طور پر این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر نسرین بیگم: صدر شعبۂ اردو، بیکنٹھی دیوی کنیا مہاودیالیہ، آگرہ، 11 مارچ 2022

امیر خسرو: حیات، شخصیت اور فنی جہات

رامپور: ادبی تنظیم کیئر ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی رجسٹرڈ کے زیر اہتمام اس بار بھی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت برائے فروغ وسائل انسانی حکومت ہند کے اشتراک سے امپیکٹ کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی تھوتاپور بھوٹ میں بہ عنوان 'امیر خسرو: حیات، شخصیت اور فنی جہات' زیر صدارت سابق جج تنویر احمد وصفی منعقد ہوا جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر محمد سراج عظیم نے شرکت کی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد کا پیغام کنوینر سمینار فیصل شاہ خاں نے پیش کیا۔ اس اہم پروگرام میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے استاد الاساتذہ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے کہا کہ امیر خسرو نے 1253 میں اتر پردیش کے ضلع ایٹہ کے پٹیالی میں اپنی آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالنے تک عمر کی آخری منزل تک متعدد علوم وفنون میں ایسے کمالات کر دکھائے کہ انھیں طوطیِ ہند، سلطان الشعرا جیسے خسرو شیریں سخن

کے القاب سے یاد کیا جانے لگا۔ اس سمینار کے دوسرے اجلاس میں متعدد فاضل مقالہ نگار، محققین، اساتذہ، طلبا اور دیگر مقررین امیر خسرو کی حیات، شخصیت اور فنی جہات سے متعلق مقالات کے علاوہ اپنے خیالات بھی پیش کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 مارچ 2022

پروفیسر نثار احمد فاروقی: فن وشخصیت

امروہہ: 20 مارچ 2022 بروز اتوار ہاشمی گرلس ڈگری کالج امروہہ میں منعقدہ سمینار میں ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر نثار احمد فاروقی کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی۔

شیخ نگینوی نے پروفیسر نثار احمد کے آبائی شہر امروہہ کے ہم عصر شعرا و ادبا کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ امیر نہٹوری نے اپنے پیش کردہ مقالے میں پروفیسر نثار احمد فاروقی: فن وشخصیت' پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ''نثار احمد فاروقی اردو، فارسی اور عربی کے عالم تھے جب کہ انگریزی کے ماہر، تصوف کے شناور اور مجلسی زندگی کی جان تھے۔ ان کے تمام ہمعصروں نے مجموعی طور پر ان کی علمیت اور لیاقت کا اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ سبطین نے پروفیسر نثار احمد فاروقی کی فنی خصوصیات پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''پروفیسر نثار احمد فاروقی کی بڑی انفرادیت مخطوطات کی تلاش میں دنیا کی مختلف لائبریریوں تک پہنچنا ہے۔ ڈاکٹر ثنا کوثر نے اپنے مقالہ میں کہا ''پروفیسر نثار احمد فاروقی کی عظمت کا احساس جن اسباب کی بنا پر تھا ان کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ سید تنویر حسن نقوی صاحب نے اپنے تاثرات میں کہا کہ پروفیسر نثار احمد فاروقی کا شمار امروہہ کی ان عظیم شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے امروہہ کا نام بین الاقوامی سطح پر روشن کیا۔ ابوارشد اعظمی صاحب نے نثار احمد فاروقی کے تعلق سے فرمایا ''پروفیسر نثار احمد فاروقی اردو سے نہیں اردو والوں سے بدگمان تھے۔ وہ اسلامیات پر کام کرنا چاہتے تھے۔ صدر محفل ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی صاحب نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''سرزمین امروہہ پر ہر فن کے ماہرین ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اس موقعے پر اردو کے مشہور و معروف شاعر، ناقد، محقق، افسانہ نگار جناب امیر احمد خاں امیر نہٹوری کے مجموعۂ مضامین 'ارباب ادب' کا تعارف کراتے ہوئے سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ امیر نہٹوری کا ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہونے والے بیش قیمتی مضامین پر مبنی کتاب کا منظر عام پر آنا نہ صرف امیر نہٹوری کے لیے بلکہ محبان اردو کے لیے باعث فخر ہے۔

پریس ریلیز: محمد ساجد، سکریٹری کریسینٹ ایجوکیشنل ویلفیئر، بجنور سوسائٹی قصبہ جھالو، اترپردیش، 29 مارچ 2022

اردو مرکوز آبادی میں مادری زبان

اردیا: مادری زبان ماں کے دودھ کی طرح بچوں کے لیے لازم ہے۔ اس سے بچہ غیر محسوس طور پر سیکھتا ہے اور صلاحیت پروان چڑھتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے دعوت القرآن اررِیا میں منعقد سمینار سے متعدد دانشوروں نے کیا۔ سیاسی رہنما اختر الایمان نے کہا کہ آج کا یہ ریاستی سمینار انتہائی حساس موضوع پر ہو رہا ہے۔ زبان اپنی تہذیب اور تاریخ کا امین ہوتی ہے۔ بچوں سے مادری زبان چھین لی جائے تو وہ اپنی بنیاد سے کٹ جائے گا۔ سمینار کی صدارت کر رہے معروف افسانہ نگار مشتاق احمد نوری سابق سکریٹری بہار اردو اکیڈمی نے کہا کہ جب تک مادری زبان میں بچوں کی تعلیم نہ دی جائے ان کا مستقبل تابناک نہیں ہوسکتا۔ اس سے قبل سمینار کے کنوینر عبدالواحد رحمانی نے قومی کونسل اردو کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ مادری زبان اردو کے مسائل اور امکانات پر روشنی ڈالتے ہوئے روزنامہ انقلاب کے صحافی ڈاکٹر جاوید اختر نے کہا کہ مادری زبان کے فروغ کے لیے سبھوں کو آگے آنا ہوگا اور عملی اقدام کرنا ہوگا۔ سمینار میں پروفیسر عبدالرقیب الشمس ملیہ کالج اررِیا ڈاکٹر مجاہد حسین صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی کالج پورنیہ، پروفیسر ایوب نظامی تحفظ کالج آرہ، رضوان رشید، مدثر احمد قاسمی، مفتی انصار قاسمی، عفان احمد کامل، شاہجہاں شاد فاربس گنج و دیگر نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالقادر شمس کی سوانح 'وہ جو شمس تھا سر آسماں' کا اجرا کیا گیا۔ ان کی تعلیمی اور فلاحی خدمات کو یاد کیا گیا۔ مولانا محمد عارف قاسمی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور ادارے کا تعارف کرایا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 فروری 2022

مولانا مظہر الحق توسیعی خطبہ

دربھنگہ: نظیر اپنے خاص رنگ کی وجہ سے عوامی شاعر کے طور پر مشہور ہوئے۔ نظیر کی بہت بڑی خوبی ان کی وسیع النظری اور وطن پرستی ہے۔ نظیر کے یہاں انسانیت ایک بہت مضبوط شکل میں نظر آتی ہے۔ یہ باتیں جموں یونیورسٹی، جموں کشمیر کے صدر شعبہ اردو پروفیسر محمد ریاض احمد نے سی ایم کالج دربھنگہ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے منعقدہ مولانا مظہر الحق توسیعی خطبے میں کہیں۔ اس توسیعی خطبے میں بطور مہمان خصوصی للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے رجسٹرار اور معروف ادیب و شاعر پروفیسر مشتاق احمد نے شرکت کی۔ انھوں نے نظیر کی شاعری پر پرمغز خطاب کرتے ہوئے کہا کہ نظیر کے یہاں سچی شاعری نظر آتی ہے۔ نظیر نے بولی کو ادب کی زبان بنا کر شعری قالب عطا کیا ہے۔ اس خطبے کے مہمان اعزازی للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر محمد آفتاب اشرف نے کہا کہ نظیر عوامی شاعر رہا ہے۔ اس کی شاعری دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ توسیعی خطبے کی صدارت کرتے ہوئے سی ایم کالج دربھنگہ کے پرنسپل ڈاکٹر پھولوں پاسوان نے نظیر کی شاعری پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ ادب سماج کے ہر طبقے کے لیے ہوتا ہے۔ نظیر ایک جن کوی تھے اور انھوں نے سماج کے ہر طبقے کی نمائندگی کی اور اپنی شاعری میں مزدوروں، بے بسوں، لاچاروں کو موضوع بنایا۔ پروگرام کے آغاز میں سی ایم کالج کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر ظفر عالم نے استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ نظیر نے شاعری کے ذریعے دلوں پر حکومت کی ہے۔ انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت تعلیم کا اس توسیعی خطبے کے مالی تعاون فراہم کرنے پر شکریہ بھی ادا کیا۔ توسیعی خطبے کی نظامت کرتے ہوئے سی ایم کالج کے استاد عبدالحی نے مختصراً مولانا مظہر الحق اور نظیر کی خدمات پر گفتگو کی اور نظیر کو اپنے آپ میں منفرد شاعر بتایا۔ اس توسیعی خطبے میں سی ایم کالج کے تمام اساتذہ و اسٹاف کے ساتھ ساتھ ملت کالج کے پرنسپل کے ساتھ علاقے کے سرکردہ افراد بھی شامل تھے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 13 مارچ 2022

جدید مواصلاتی وسائل اور اردو مسائل و امکانات

بیگوسرائے: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی اور آدرش پری کلپنا بیگوسرائے کے زیر اہتمام جدید مواصلاتی وسائل اور اردو مسائل و امکانات موضوع پر ریاستی

سطح کا سمینار پوکھریا کے ضلع اقلیتی ہاسٹل میں منعقد کیا گیا۔ سمینار کی صدارت ایل این ایم یو دربھنگہ کے شعبۂ اردو کے سابق ایچ او ڈی پروفیسر ظفر حبیب اور نظامت اردو اسکالر عبدالواحد رحمانی اور استقبال آدرش پری کلپنا کے سکریٹری محمد عارف حسین نے کی۔ بی آر ایم کالج مونگیر کالج کے شعبۂ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر زین شمسی نے کہا کہ اردو تہذیب کی زبان ہے، نئی نسل سے گزارش کرتا ہوں کہ اردو کو اپنائیں۔ سرکاری دفاتر میں اپنی عرضیاں اردو میں دیں۔ بی آر ایم کالج مونگیر کے شعبۂ ہندی کے صدر ڈاکٹر ابھے کمار نے کہا کہ زبان کو کسی بھی مذہب کے چشمے سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ زبان انسان کی سوچ کو واضح کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اردو ہندوستان کی قدیم زبان میں سے ایک ہے۔ جی ڈی کالج میں شعبہ اردو کی صدر پروفیسر ڈاکٹر سحر افروز نے کہا کہ اردو زبان سیکھنا تہذیب کے سیکھنے کے برابر ہے۔ صدر جمہوریہ ایوارڈ یافتہ مفتی محمد خالد حسین قاسمی نیموی نے کہا کہ اس جدید ٹکنالوجی کے دور میں اردو کی ترقی اور اس کا فروغ بہت آسان ہوگیا ہے۔ یہ زبان بہت ہی خوبصورت، پیاری، ثقافتی اور تاریخی زبان ہے۔ مفتی عین الحق امینی قاسمی نے کہا کہ اردو کی تعلیم و تدریس کے لیے اب ہمیں نہ صرف کثرت سے مواد فراہم ہو رہے ہیں بلکہ مواد و نصاب کے لحاظ سے دنیا بھر میں جاری طریقہ و تدریس کے ذریعے ہم فائدہ اٹھا کر جدید مواصلاتی مسائل سے اپنے طلبا کو کم وقت میں باصلاحیت بنا سکتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 مارچ 2022

شبنم کمالی کی حیات و خدمات

مدھوبنی: شبنم کمالی بہار کی تعلیمی اور ادبی تاریخ کا ایک سنگ میل بلکہ ایک مینارۂ نور ہیں۔ ان خیالات کا اظہار 6 مارچ بروز اتوار کو یہاں جے این یو، نئی دہلی کے پروفیسر اور ورلڈ اردو ایسوی ایشن کے صدر ڈاکٹر خواجہ اکرام نے یہاں ایک قومی سمینار سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ وہ مشہور شاعر، مصنف، استاد اور جید عالم دین علامہ شبنم کمالی کی حیات و خدمات پر الخیر ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ (مدھوبنی) کے قومی سمینار میں خطبہ صدارت پیش کر رہے تھے۔ انھوں نے مولانا شبنم کمالی کی شعری و ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے کلام کو سنجیدگی سے پڑھنے، سمجھنے اور معاشرے کی یادداشت کا حصہ بنانے پر زور دیا جب کہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر افضل مصباحی نے علامہ شبنم کمالی کی غزل گوئی پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی غزلوں میں بڑی شاعری کا ہر رنگ جلوہ گر ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر فیاض احمد وجیہ نے شبنم کمالی کی شاعری میں روایت، ترقی پسندی اور جدیدیت کے مختلف رنگوں کا تفصیل سے جائزہ پیش کیا جبکہ مولانا امام الدین نے ان کی شاعری میں تصوف کے رنگ پر روشنی ڈالی اور مولانا مظہر الحق یونیورسٹی (پٹنہ) کے ڈاکٹر اکرم رضا نے مولانا شبنم کمالی کی سماجی زندگی کا جائزہ لیا اور بتایا کہ ان کے سماجی روابط کتنے مضبوط تھے۔ مشہور صحافی و مصنف احمد جاوید نے مولانا شبنم کمالی کے اسلوب تعلیم و تربیت کے موضوع پر اپنے ذاتی تجربات اور تفصیلی مطالعے کا خلاصہ پیش کیا۔ افتتاحی کلمات ڈاکٹر محمد قمر ثاقب نے پیش کیے۔ سمینار کے سرپرست پروفیسر فاروق احمد صدیقی کا مقالہ پڑھ کر سنایا گیا۔ سمینار کی نظامت مولانا عارف اقبال مصباحی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 مارچ 2022

مولانا آزاد: احوال، افکار اور عصر جدید

کریم نگر: دو روزہ بین الاقوامی سمینار بہ عنوان 'مولانا آزاد: احوال، افکار اور عصر جدید' شعبۂ اردو جامعہ ساتاواہانا یونیورسٹی کریم نگر، تلنگانہ میں 23,24 / مارچ 2022 کو منعقد ہوا۔

افتتاحی اجلاس کا شعبۂ اردو کی طالبات کی بہترین آواز میں 'ترانۂ ہندی' سے آغاز ہوا۔ اس افتتاحی اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب پروفیسر سنکا سلا ملیش، وائس چانسلر، ساتاواہانہ یونیوسٹی، شریک رہے، صدارت کی ذمہ داری پروفیسر سید عبدالشکور نے انجام دی۔ کلیدی خطبہ پروفیسر محمد نسیم الدین فریس (مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، حیدر آباد) نے پیش کیا۔ مہمان اعزازی کی حیثیت سے پروفیسر مشتینا وراپرساد، ڈاکٹر ونالا رمیش، پروفیسر ایم گوناناٹک، ڈاکٹر محمد جعفر جری، شرکت کی، مہمان ذی وقار کے طور پر پروفیسر سید فضل اللہ مکرم، ڈاکٹر رفیع الدین شریک ہوئے۔ سمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ناظم الدین منور رہے اور معاون سمینار ڈائرکٹرس ڈاکٹر محمد ابرار الباقی اور ڈاکٹر حمیرہ تسلیم رہے۔ معزز مہمانان نے مل کر شمع روشن کی۔

جناب ڈاکٹر جعفر جری صاحب نے مہانوں کا تعارف پیش کیا۔ سمینار کا افتتاحی خطبہ مہمان خصوصی جناب پروفیسر سنکا سلا ملیش نے پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خطبہ میں مولانا آزاد کی ہم جہت شخصیت اور ان کے اہم پہلوؤں پر بہترین انداز میں روشنی ڈالی۔

افتتاحی اجلاس کے بعد اس دو روزہ بین الاقوامی سمینار میں پانچ تکنیکی اجلاس منعقد ہوئے جن میں 30 مقالے پڑھے گئے۔ دوپہر 12:00 بجے پہلا تکنیکی اجلاس کا آغاز ہوا۔ جس میں چھے مقالے پڑھے گئے۔ پہلے سیشن کی صدارت ڈاکٹر رفیع الدین (وزیٹنگ پروفیسر تاجکستان یونیورسٹی، تاجکستان) نے کی۔ مقالات پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر محمد منظر حسین، (کولکاتا) نے 'مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت' پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ سید علیم اللہ حسینی بیجاپور نے 'مولانا آزاد کے افکار و نظریات' پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر محمد عمادالدین کا مقالہ 'مولانا آزاد کا نظریہ تعلیم' پر تھا۔ ڈاکٹر محمد فضل اللہ شریف نے 'مولانا آزاد بحیثیت ادیب تفرد و امتیاز' پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ محترمہ ام سلمیٰ نے 'تحریک آزادی میں مولانا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کی ہم آہنگی' پر بات کی۔ ڈاکٹر پیراں نے 'مولانا آزاد کی صحافت' کے عنوان پر مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر رفیع الدین نے اپنے صدارتی خطبہ میں پیش کیے گئے مقالوں کا جائزہ لیا۔

دوپہر 2:30 بجے دوسرا تکنیکی اجلاس شروع ہوا، جس میں چھے مقالے پڑھے گئے۔ دوسرے سیشن میں پرفیسر نثار احمد، ظہیر دانش کڈپہ، جناب انور ہادی کڈپہ، نیہا نوری، ڈاکٹر نشاط احمد، سیدہ فاطمہ النساء اسماء نے مقالے پڑھے۔ اس نشست کی صدارت پرفیسر سید فضل اللہ مکرم نے کی۔

دوپہر 3:45 بجے تیسرا تکنیکی اجلاس شروع ہوا، جس میں چھے مقالے پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر محمد جعفر، ڈاکٹر محمد ابرار الباقی، ڈاکٹر حمیرہ تسلیم، ڈاکٹر ناظم الدین منور، جناب کلیم محی الدین، ڈاکٹر پدماوتی نے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر پروفیسر نسیم الدین فریس (ڈین، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی) نے کی۔

دوسرے دن 10.30 بجے چوتھے سیشن کا آغاز ڈاکٹر جہانگیر احساس کے

مقالے 'مولانا آزاد بحیثیت شاعر' سے شروع ہوا۔ محترمہ فردوس سلطانہ نے مولانا آزاد کی صحافت پر گفتگو کی۔ محترمہ فرحت انجم نے 'ہندوستان کی آزادی میں مولانا کے نظریات' پر مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر موسیٰ اقبال نے 'مولانا آزاد ایک عہد ساز شخصیت' پر بات کرتے ہوئے ان کے مختلف افکار اور متعدد خیالات کے حوالے سے عمدہ انداز میں گفتگو کی۔ پروفیسر رفیع الدین صاحب نے 'مولانا آزاد کی ادبی خدمات' کے حوالے سے مدلل گفتگو کی۔ جناب اطیع اللہ نے 'مولانا آزاد کے ذہنی ارتقاء' پر مقالہ پیش کیا۔ سیشن کی صدارت پروفیسر محمد نثار احمد کی۔

11.40 بجے پانچویں سیشن کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر رفیع الدین اور فیسر سید عبدالشکور اس سیشن کے صدور رہے۔ ڈاکٹر عبدالقوی نے 'مولانا آزاد غبار خاطر کے حوالے سے' مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر پردیپ راج نے انگریزی میں مولانا آزاد اور ہندوستان کے عنوان پر مقالہ پیش کیا۔ اسری تسنیم، ڈاکٹر عبدالرب منظر، ڈاکٹر محمد کاشف، ڈاکٹر لکشمی نارائنا نے اس سیشن میں اپنے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر رفیع الدین نے صدارت کی۔

دوسرے دن دوپہر 2:30 بجے اختتامی اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر جعفر جری نے انجام دیے۔ ڈاکٹر ناظم الدین منور نے شکریہ کی رسم ادا کی۔

پریس ریلیز: محمد نثار احمد، چیئرمین بورڈ آف اسٹڈیز، شعبۂ اردو، ایس وی یونیورسٹی، تری پتی، آندھراپردیش، 28 مارچ 2022

شمس الرحمٰن فاروقی: شخص اور عکس

حیدرآباد: شمس الرحمٰن فاروقی ایک بڑے نقاد، ادیب اور دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ اردو زبان وتہذیب کے قابل فخر پیامبر بھی تھے۔ انھوں نے ہمیں اردو زبان و ادب کے تخلیقی وتہذیبی ورثے پر فخر کرنا سکھایا۔ مغربی ادبیات کا انھوں نے غائر مطالعہ کیا تھا، لیکن وہ اس سے مرعوب نہیں تھے۔

ان خیالات کا اظہار ممتاز نقاد پروفیسر ارتضیٰ کریم نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے منعقد ہونے والے سہ روزہ قومی سمینار بعنوان 'شمس الرحمٰن فاروقی: شخص اور عکس' میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ بحیثیت صدر خطاب کرتے ہوئے پروفیسر سید عین الحسن، شیخ الجامعہ، مانو نے کہا کہ شمس الرحمٰن فاروقی اپنے آپ میں ایک مکمل ادارہ تھے۔ ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ جلسے کے مہمان خصوصی ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر محمد زماں آزردہ نے کہا کہ ہمیں فاروقی کے افکار ونظریات سے روشنی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ جلسے کے مہمان اعزازی پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ فاروقی تخلیق کو تنقید پر فوقیت دیتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عمر کے آخری حصے میں تخلیق پر زیادہ توجہ دی۔ 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' اور 'قبضِ زماں' جیسے ناول انھیں زندہ رکھیں گے۔ صدر شعبۂ اردو، مانو اور سمینار ڈائرکٹر پروفیسر فاروق بخشی نے مہمانوں کا استقبال کیا اور بتایا کہ شعبۂ اردو کو اس بات پر فخر ہے کہ فاروقی صاحب پر ایک بڑے سمینار کا انعقاد ہوسکا اور یہ ممکن نہ ہوتا اگر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کا تعاون نہ ملا ہوتا۔ اس موقعے پر پروفیسر سید عین الحسن کے ہاتھوں پروفیسر فاروق بخشی کی تازہ کتاب 'تفہیم وترسیل' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ جلسے میں سمینار کوآرڈینیٹر ڈاکٹر ابوشہیم خاں نے سمینار کی تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ اجلاس کی نظامت اور اظہار تشکر کا فریضہ شعبے کے استاد پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی نے ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 مارچ 2022

محی الدین عبدالقادر زور توسیعی خطبہ

مدراس: شعبہ عربی، فارسی واردو مدراس یونیورسٹی میں قومی کونسل کے تعاون سے 14 اور 15 مارچ 2022 کو ڈاکٹر زور توسیعی خطبے مدراس یونیورسٹی کے پلاٹنم جوبلی آڈیٹوریم میں منعقد ہوے جس میں بڑی تعداد میں شعبہ اردو کے فارغین اور دیگر سامعین نے شرکت

نے کی۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی حبیب احمد، ڈائرکٹر مرینا کیمپس نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر امان اللہ اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو مدراس یونیورسٹی نے انجام دیے۔ پروفیسر شافع قدوائی، صدر شعبہ ترسیل عامہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے 'سرسید کی معنویت عہد حاضر میں' کے عنوان پر توسیعی خطبہ پیش فرمایا جس میں انھوں نے سرسید کی حیات وخدمات کو اجاگر کرتے ہوئے سماج کی فلاح و بہبودی اور تعلیمی میدان میں سرسید کی گراں قدر خدمات کا اعتراف کیا اور فرمایا کہ سرسید کی معنویت عہد حاضر میں زیادہ اس لیے ہے کہ سرسید نے ولیم میور کی کتاب کا جواب 'خطبات احمدیہ' سے دے کر یہ ثابت کر دکھایا کہ کتاب کا جواب کتاب ہے کتاب جلانا نہیں۔ اسی طرح ایک اور توسیعی خطبہ پروفیسر عبدالحق، پروفیسر امریطس، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی نے 'معراج رسول فکر اقبال کا محرک تخلیق' کے عنوان سے ایک بسیط لیکچر پیش فرمایا۔ قومی اردو سمینار کے موقع پر منعقدہ ان دونوں توسیعی خطبات میں کثیر تعداد میں اردو کے شائقین موجود رہے۔ شرکاء میں جناب علیم صبا نویدی، ڈاکٹر پروین فاطمہ سابق صدر شعبہ اردو، کوئن میریس کالج چنئی، ڈاکٹر حیات افتخار، سابق صدر شعبہ اردو، قائد ملت کالج میڈواکم، پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، پروفیسر قمر الہدی فریدی کے نام قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر امان اللہ ایم، مدراس یونیورسٹی، 15 مارچ 2022

بہادر شاہ ظفر فن اور شخصیت

برہانپور: شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج، برہانپور (ایم پی) کے زیر اہتمام وانتظام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے ایک روزہ صوبائی سمینار بعنوان بہادر شاہ ظفر فن اور شخصیت کا عمل میں آیا، جس میں صوبہ مدھیہ پردیش کے مختلف شہروں

کے سرکاری، نیم سرکاری اور نجی کالجوں کے پروفیسر حضرات اور اسکولوں کے اساتذہ نے بہادر شاہ ظفر سے متعلق متنوع موضوعات پر اپنے گراں قدر مقالے پیش کیے، جن سے باذوق سامعین اور طلبا و طالبات محظوظ ہوئے۔ اس میں بہادر شاہ ظفر کی زندگی، شاعری اور خدمات سے متعلق بھی مختلف عنوانات پر پرچے پڑھے گئے۔ کلیدی خطبہ مدھیہ پردیش کے معروف و معمر شاعر و ادیب، ڈرامہ نگار اور متعدد کتابوں کے مؤلف و مصنف نیز بہادر شاہ ظفر پر اہم تحقیقی و تنقیدی کام کر چکے جناب رشید انجم نے پیش کیا۔

پروگرام کا افتتاح گورنمنٹ مادھو کالج، اجین کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر غلام حسین صاحب کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ محمد افضال انصاری عرف وقار آصفی اور نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس سمینار کے مہمانِ خصوصی کے طور پر سیوا سدن کالج برہانپور کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر ایس ایم شکیل، گورنمنٹ کالج نیپا نگر کے پرنسپل ڈاکٹر راجو سپکالے، گورنمنٹ کالج، برہانپور کے سابق پرنسپل ڈاکٹر سوشیل سوم ونشی اور سرونج سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر اور ادبی شخصیت جناب فرمان ضیائی نے پروگرام اور افتتاحی اجلاس کو وقار بخشا۔ افتتاحی اجلاس کے تحت مہمانانِ خصوصی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل اور سمینار کے میزبان ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری نے مہمانان، مندوبین اور تمام شرکا کے لیے استقبالیہ کلمات کہے۔

سمینار کا پہلا ادبی سیشن دوپہر 12 بجے شروع ہوا جس کی صدارت پروفیسر غلام حسین (اجین) اور پروفیسر عثمان انصاری (برہان پور) نے مشترکہ طور پر فرمائی اور نظامت سمینار کے کنوینر اور مہمان پروفیسر جناب محمد رفیق انصاری نے کی۔ اس اجلاس میں کل نو مقالے پڑھے گئے، مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر فہمیدہ منصوری (اندور)، ڈاکٹر صبیحہ اختر (بھوپال)، ڈاکٹر صبیحہ آفاق (بھوپال)، ڈاکٹر نصرت سلطانہ (دیواس)، ڈاکٹر تبسم خان (شیو پور)، ڈاکٹر روبینہ عرشی (اجین)، جناب فرمان ضیائی (سرونج)، ڈاکٹر وسیم انور (ساگر) اور ڈاکٹر محمد صادق (کروائی، ودیشہ) کے نام اہم ہیں۔ مقالہ خوانی کے بعد صدر محترم نے تمام مقالوں پر جامع تجزیہ پیش کیا اور حشو و زوائد کی نشاندہی کی۔

دوسرے ادبی سیشن کا آغاز ڈاکٹر عارف انصاری کی نظامت سے ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر فہمیدہ منصوری (اندور) نے فرمائی۔ اس میں کل چھ مقالے پیش کیے گئے۔ اہم مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر نازنین منصوری (اندور)، ڈاکٹر ظفر محمود (اجین)، اور برہان پور سے ڈاکٹر عارف انصاری، جناب جاوید رانا، جناب الطاف انصاری اور محترمہ فرزانہ انصاری کے نام اہم ہیں۔ اس ادبی سیشن کا اختتام صدر محترمہ کے بسیط تبصرے کے ساتھ ہوا۔

پریس ریلیز: اسرار انصاری، مہاراشٹر، 9 مارچ 2022

نئی تعلیمی پالیسی اور ترقیاتی مشن کے حصول میں اردو میڈیم تعلیم کا کردار

بھوپال: 'نئی تعلیمی پالیسی 2020 اور ترقیاتی مشن کے حصول میں اردو میڈیم تعلیم کا کردار' پر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے علاقائی مرکز بھوپال نے دو روزہ سمینار کا انعقاد کیا۔ یہ سمینار قومی کونسل برائے فروغ اردو کے مالی تعاون سے منعقد کیا گیا۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر خطاب کرتے ہوئے جناب منوج کمار شریواستو اے ایس ایڈیشنل چیف سکریٹری سبکدوش حکومتِ مدھیہ پردیش نے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی 2020 ملک کی آزادی کے بعد تعلیم کے میدان میں ایک انقلابی قدم ہے۔ یہ مادری زبان میں تعلیم پر زور دیتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ سائنسی انقلاب جن ممالک میں آیا وہاں مادری زبان میں تعلیم کا نظم اعلیٰ درجات تک مستحکم ہے۔ جب اپنی زبان میں پڑھیں گے تب ہی ملک ترقی کرے گا اور ہم علمی و سائنسی میدان میں پیش رفت کر سکیں گے۔ افتتاحی

تقریب کی صدارت کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے پروفیسر ماہر لسانیات ڈاکٹر اے آر فتیحی نے فرمایا کہ نئی تعلیمی پالیسی میں بہت سی اہم تبدیلیاں کی گئی ہیں اور امید ہے کہ ان کے بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔ مدھیہ پردیش مدرسہ بورڈ کے سابق صدر اور اندور کے کئی تعلیمی اداروں کے روحِ رواں پروفیسر حلیم خان نے بحیثیت مہمان ذی وقار خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تعلیمی پالیسی پر غور و خوض کرنے، نیز اس کے فوائد کا مطالعہ کرنے کے لیے اس سمینار کے حل و عقد نے بہترین قدم اٹھایا ہے جو قابلِ تعریف اور قابلِ تقلید ہے۔ ابتدا میں سمینار کے کنوینر اور ڈائرکٹر ریجنل سینٹر مانو پروفیسر محمد احسن نے سمینار کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہماری یونیورسٹی اس طرح کے موضوعات پر کام کر رہی ہے اور کرتی رہتی ہے تاہم NCPUL کے ذریعے سنجیدہ علمی و تعلیمی موضوعات پر سمینار کا انعقاد کرنے کے لیے مالی تعاون ایک اہم قدم ہے۔ اگر اس طرح کے سرکاری ادارے نہ ہوں تو ملک بھر میں سمینار کروانے میں دشواری ہوگی۔ پروگرام کے شروع میں مہمانوں کی گل پوشی کی گئی۔ نظامت کے فرائض اقبال مسعود نے بحسن و خوبی انجام دیے، شکریہ کے فرائض سمینار کے کوآرڈینیٹر پروفیسر نوشاد حسین نے ادا کیے۔

اس دو روزہ سمینار میں کل چھ سیشن ہوئے، تین آف لائن اور تین آن لائن۔ پہلا سیشن 14 مارچ 2022 کو آف لائن ہوا، اس سیشن کی صدارت پروفیسر ساجد جمال، شعبہ تعلیم و تربیت، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کی۔ نظامت ڈاکٹر آفاق ندیم خان نے کی اور رپورٹیر کی ذمے داری ڈاکٹر تملیذ فاطمہ نقوی نے سنبھالی۔ دوسرا سیشن 15 مارچ 2022 کو آن لائن ہوا، اس سیشن کی صدارت پروفیسر محمد فاروق انصاری اور پروفیسر ڈی ایچ خان، شعبہ تعلیم NCERT نے فرمائی۔

اس دو روزہ سمینار میں کل 39 مقالے چھ سیشن میں پیش کیے گئے۔ اختتامی تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر، پروفیسر، اے آر فتیحی اور پروفیسر ساجد جمال نے فرمائی۔ آخر میں پروفیسر محمد احسن، ریجنل ڈائرکٹر مانو، ریجنل سینٹر بھوپال نے کلمات تشکر ادا کیے۔

پریس ریلیز: محمد احسن، ریجنل ڈائرکٹر، ریجنل سینٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، بھوپال، 4 اپریل 2022

اردو کے فروغ میں ریاست ٹونک کا حصہ

جودھپور: اردو کے فروغ میں ریاست ٹونک کا حصہ کے موضوع پر یک روزہ قومی سمینار کا انعقاد منار ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے کیا۔ یہ سمینار مدرسہ مدینۃ العلوم، آہو، پھلودی، جودھپور، راجستھان میں 9 مارچ 2022 بروز بدھ ہوا۔ ڈاکٹر عزیز احمد خان، سکریٹری، منار ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی نے سوسائٹی کی گزشتہ کارکردگی کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا کہ اردو کے فروغ میں ریاست ٹونک نے جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں، انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت حکیم عبدالمجید قاسمی، صدر، مدرسہ مدینۃ العلوم نے کی۔ کلیدی خطبہ مولانا عبدالستار ندوی نے پیش کیا۔ سمینار کے پہلے سیشن میں ڈاکٹر عزیز احمد خان نے 'حافظ محمود شیرانی محقق اول' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر رشی کمار شرما، ڈاکٹر پرویز احمد، تبریز عالم، مولانا محبوب الٰہی قاسمی، ڈاکٹر عبدالرب، ڈاکٹر مطیع اللہ خان، ڈاکٹر عبدالحمید، ڈاکٹر صغیر احمد، عبدالحلیم، ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا رحمت اللہ قاسمی سمیت دیگر مقالہ نگاران نے اپنے مقالات پیش کیے۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر عزیز احمد خان نے تمام شرکا، مقالہ نگار اور خاص طور سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 مارچ 2022

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

سرکاری کاموں میں مادری زبان کا استعمال ہونا چاہیے: وینکیا نائیڈو

هریدوار: نائب صدر جمہوریہ وینکیا نائیڈو نے 19 مارچ ہفتہ کو اتراکھنڈ میں دیو سنسکرت وشو ودیالیہ، ہریدوار کا دورہ کیا اور نئے قائم کردہ جنوبی ایشیائی امن اور مفاہمت انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ سرکاری کاموں میں مادری

زبان کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ نائب صدر جمہوریہ نے آج ایشیا کے پہلے بالٹک سینٹر کا بھی معائنہ کیا۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے جناب نائیڈو نے کہا کہ ہماری قدیم ویدک ثقافت اور مادری زبان کی تشہیر کی جانی چاہیے اور نئی نسل کو اپنی روایات اور جڑوں سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔ نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ تعلیم کسی شخص کے معیار زندگی کو بلند کرتی ہے اور یہ خود کو پہچاننے اور زندگی میں کامیاب ہونے میں بہت زیادہ تعاون کرتی ہے۔ نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی میں مادری زبان کو فروغ دینے کے لیے مزید چیزیں شامل کی گئی ہیں، جبکہ ہندوستان میں آزادی کے بعد سے لاگو تعلیمی نظام میکالے کی تعلیم کے غلبے کو ظاہر کرتا ہے، جو ہمیں اپنی ثقافت اور روایات سے دور کرتا جارہا تھا، اب نئے تعلیمی نظام میں ان تضادات کو دور کرتے ہوئے طلبا کو اپنی ثقافت اور ورثے کو پہچاننے کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔ مادری زبان کے سرکاری کاموں اور عام رواج میں استعمال پر زور دیتے ہوئے جناب نائیڈو نے کہا کہ اسے انتظامی کاموں اور عدالتی کاموں میں بھی زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ مادری زبان، اپنی ثقافت اور ورثے کو پہچاننے کے ساتھ ساتھ نئی نسل کو قدرت سے جوڑنا چاہیے، قدرت سے جڑ کر ہی ہم صحت مند ذہنیت اور اعلیٰ معیار زندگی کو بلند کرسکتے ہیں۔ انھوں نے کورونا کی وبا کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اس کا اثر ان علاقوں میں زیادہ ہوا ہے جہاں شہروں میں ہریالی کم تھی اور آبادی بہت زیادہ تھی، جب کہ جہاں درختوں اور پودوں کی کثرت تھی وہاں اس بیماری کا اثر کم تھا۔ ماحول اور فطرت کا بھی ہماری زندگیوں پر بڑا اثر ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایشیائی ممالک کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات قدیم زمانے میں بہت اچھے تھے اور وہاں ہندوستانی ثقافت کا کافی اثر تھا۔ اس موقعے پر ریاست کے گورنر گرمیت سنگھ نے بھی اجتماع سے خطاب کیا۔ دیو سنسکرت وشو ودیالیہ کے وائس چانسلر چنمے پانڈیا نے نائب صدر کا استقبال کیا اور انھیں یادگاری تحفے کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 مارچ 2022

تین روزہ بین الاقوامی غالب تقریبات

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی میں 11,12,13 مارچ 2022 کو سہ روزہ بین الاقوامی غالب تقریبات کا انعقاد کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس 11 مارچ کو شام پانچ بجے ہوا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے سمینار کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ذہن وضمیر کی آزادی ہی معاصر اردو ادب کی شناخت ہے۔ افتتاحی اجلاس کے مہمان خصوصی اور دہلی کے سابق لیفٹیننٹ گورنر عالیجناب نجیب جنگ نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ اردو کے سب سے فعال اداروں میں سے ایک ہے۔ مجھے یہاں منعقد ہونے والے سمیناروں کے عنوانات دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ان سمیناروں کے موضوعات محض روایتی نہیں ہوتے۔ اس اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ہندی کے نامور ادیب ودانشور پروفیسر وشوناتھ ترپاٹھی نے کہا کہ معاصر ادب کی جو خوبی مجھے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں تجربات کی طرف میلان زیادہ ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی کوشش رہتی ہے کہ ایسی کتابیں شائع ہوں اور ایسے مذاکرے منعقد ہوں جن میں محض دہرائی ہوئی باتوں کا چال نہ ہو۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ اس سال 'معاصر اردو ادب میں نئے تخلیقی رویے' کے موضوع پر سمینار منعقد کر رہا ہے۔ ہم نے ملک اور بیرون ملک کے بہترین اردو دانشوروں کو اس موضوع پر اظہار خیال کے لیے جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس موقع پر غالب انسٹی ٹیوٹ کی نئی ویب سائٹ کا اجرا بھی عالیجناب نجیب جنگ کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی نئی مطبوعات غالب کی شاعری میں نفی واثبات (پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی)، مرزا دبیر: عہد اور شعری کائنات (ڈاکٹر ادریس احمد)، مضامین مولوی مہیش پرشاد (ڈاکٹر عبدالسمیع)، غالب ہندی ادیبوں کے درمیان (ڈاکٹر نوشاد منظر)، ذکر حافظ (سجاد ظہیر)، غالب نامہ کے دو شمارے اور ڈائری، کلینڈر 2022 کی رونمائی بھی ہوئی۔ افتتاحی اجلاس کے بعد شام غزل کا انعقاد ہوا جس میں مشہور ومعروف غزل سنگر محترمہ رادھیکا چوپڑا نے اپنے مخصوص انداز میں غالب اور دیگر شعرا کا

کلام پیش کیا۔ 12 مارچ کو صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک 4 اجلاس ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد زماں آزردہ نے کی۔ پروفیسر خالد جاوید نے 'عتیق اللہ: وجود کی متبادل جمالیات کا شاعر'، پروفیسر فاروق بخشی نے 'اکیسویں صدی میں اردو غزل رجحانات اور امتیازات'، ڈاکٹر نریش نے 'عصری اردو ادب: ایک مطالعہ' اور ڈاکٹر عمیر منظر نے 'جدید غزل کے تخلیقی رویوں کا تنوع' کے عنوان پر مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر خالد علوی نے کی۔ پروفیسر قدوس جاوید نے 'اکیسویں صدی میں اردو غزل کے تنقیدی رویے'، پروفیسر شہباز نبی نے 'اردو ہندی نظموں کا تقابلی جائزہ' اور ڈاکٹر معید رشیدی نے 'جدید عصری اردو ادب' کے عنوان پر اپنے مقالات پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے کی۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے 'معاصر غزل'، پروفیسر سراج اجملی نے 'شاعری کا بالکل نیا اور منفرد انداز'، پروفیسر احمد محفوظ نے 'کلاسیکی غزل کی تفہیم کا معاصر رویہ'، اور پروفیسر انیس اشفاق نے اپنے مقالے پیش کیے۔ چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کی۔ پروفیسر طارق چھتاری نے 'خالد جاوید کے ناول نعمت خانہ کا جائزہ'، خورشید اکرم نے 'اشعر نجمی کے ناول اس نے کہا تھا'، اور اشعر نجمی نے 'ناول کا نیا منظر نامہ' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ اسی روز شام 6 بجے بین الاقوامی غالب مشاعرے کا انعقاد ہوا جس میں ملک و بیرون ملک کے ممتاز شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر نریش نے کی اور روزنامہ انقلاب کے گروپ ایڈیٹر ودود ساجد اور روزنامہ راشٹریہ سہارا کے مدیر عبدالماجد نظامی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی اور نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔

13 مارچ کو غالب سمینار کے آخری روز کے پہلے سیشن کی صدارت ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کی۔ پروفیسر شافع قدوائی نے 'تعزیری نظام کے خلاف مزاحمت کا استعارہ: اللہ میاں کا کارخانہ'، لندن سے تشریف لائے جاوید کا کرو نے ' Contemporary Relevance Challenges And Prospects For Promotion of Urdu Language' ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے 'اردو افسانے کے رجحانات' کے عنوان پر اپنے مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شہزاد انجم نے کی۔ جب کہ پروفیسر خالد اشرف نے 'اردو زبان کا بدلتا ہوا منظر نامہ اور چند اہم ناول'، پروفیسر ابن کنول نے 'اردو افسانہ عہد حاضر میں'، پروفیسر ثروت خان نے 'ماضی کی بازیافت: اردو کے چند نئے ناولوں کے آئینے میں' کے عنوان پر اپنے مقالات پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کی جب کہ پروفیسر غضنفر نے 'اردو ناول کی تجدید اور پیغام آفاقی'، پروفیسر صغیر افراہیم نے 'اردو ناولوں میں تہذیبی بازیافت'، اور ڈاکٹر نفیس عبدالحکیم نے 'اردو افسانہ اور نئی حقیقت نگاری' کے عنوان پر مقالات پیش کیے۔ سمینار کے آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کی اور پروفیسر علی احمد فاطمی کا مقالہ ڈاکٹر نفیس عبدالحکیم نے پیش کیا۔ ڈاکٹر عرفان عارف نے 'اردو افسانے کے نئے تخلیقی رویے اور رجحانات'، ڈاکٹر الطاف انجم نے 'فارنگ رنج کا بیانیاتی جائزہ' کے عنوان پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی، اس موقع پر انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ تمام شرکا نے بڑی محنت سے مقالے لکھے۔ پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر انیس اشفاق نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کے اختتام پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے تمام صدور، مقالہ نگار اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر یونیورسٹیز کے ریسرچ اسکالرز کو سرٹیفکیٹ اور کتابوں کا تحفہ بھی پیش کیا گیا۔ شام میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی ثقافتی شاخ 'ہم سب ڈرامہ گروپ' کی جانب سے اردو ڈرامہ 'مشاعرۂ رفتگاں' تحریر و ہدایت کار ڈاکٹر محمد سعید عالم پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے تین دن کے کتابی میلے کا بھی اہتمام کیا گیا۔

پریس ریلیز: مظفر رضا، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 30 مارچ 2022

دھلی

فارسی تہذیب پر ہندوستانی تہذیب کے اثرات

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کی طرف سے بنیاد فارسی ہند اور آئی جی این سی اے اور آئی ایس ایس آر نیز ایشیا ریسرچ سینٹر تہران کے باہمی اشتراک سے آزادی کے امرت مہوتسو کے 75 ویں سال کی یاد میں ایک دو روزہ بین الاقوامی سمینار 'فارسی تہذیب پر ہندوستانی تہذیب کے اثرات' کے عنوان سے انعقاد پذیر ہوا۔ صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی پروفیسر راجندر کمار نے اپنے افتتاحی کلمات میں شعبے کے گزشتہ صدور خاص طور سے پروفیسر امیر حسن عابدی کی خدمات کا ذکر کیا اور ان کے مختلف منصوبہ جات خاص طور سے ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ کی تدوین وغیرہ کا ذکر کیا۔ پروفیسر رمیش بھاردواج (صدر شعبۂ سنسکرت، دہلی یونیورسٹی) نے اپنے خطاب میں ہندو ایران تہذیب و تمدن کے اشتراک پر مفصل روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہند و ایران کی تاریخ کے بغیر 'تاریخ عالم' تشنہ اور نامکمل ہے۔ اس کے بعد ایران کے سفیر ڈاکٹر علی چگینی نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہمیں اپنی گزشتہ تاریخ اور تہذیب پر گفتگو کرتے رہنا چاہیے تا کہ ماضی کی تاریخ ہمیشہ تازہ رہے۔ ایران کے مہمان خصوصی پروفیسر کاظم کہدوئی (یزد یونیورسٹی) نے بھی ہندوایران کی تہذیب پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ہندوستانی تہذیب و زبان نے بھی فارسی زبان و ادب پر اتنے ہی اثرات مرتب کیے جتنے فارسی تہذیب و زبان نے کیے۔ انھوں نے فارسی ممالک میں رائج کچھ ہندی کلمات کی نشاندہی بھی کی۔ اس موقعے پر شعبۂ فارسی سے شائع ہونے والے سالنامہ تحقیقی مجلہ 'تحقیقات فارسی' اور دودیگر کتابوں کی رونمائی بھی کی گئی۔ کلیدی خطبہ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر یوگیش سنگھ نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج کے سمینار کا موضوع بدلتی ہوئی دنیا کے پیش نظر نہایت اہم ہے۔ انھوں نے 'داراشکوہ' کی شخصیت کو تاریخ کی سب سے اہم کڑی بتلایا۔ آخر میں ڈاکٹر علی اکبر شاہ نے اپنے مخصوص علمی انداز میں سمینار میں پیش کیے گئے خطبات کا خلاصہ پیش کیا۔ نظامت پروفیسر علیم اشرف نے کی۔ پہلا تعلیمی سیشن پروفیسر بھاردواج اور ڈاکٹر احسان اللہ شکراللہی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروفیسر راجندر کمار نے تحقیقی مقالہ بعنوان 'پنچ تنترا کے فارسی ادب پر اثرات' پیش کیا۔ ڈاکٹر بلرام شکلا نے 'سنسکرت نحوی روایت کے اثرات عربی نحو پر' کے عنوان سے عالمانہ مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر مہتاب جہاں نے 'ہندوستانی فارسی صحافت کے اثرات ایرانی صحافت پر' کے عنوان سے شاندار تحقیقی مقالہ پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 مارچ 2022

دہلی کی تہذیبی وراثت

نئی دھلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک خصوصی خطبہ بعنوان 'دہلی کی تہذیبی وراثت' کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام میں بحیثیت خطیب ڈاکٹر ذاکر حسین دلی کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر ریاض عمر اور مہمان ذی وقار کے طور پر پروفیسر مظہر احمد نے اور پروگرام کی صدارت معروف نقاد پروفیسر ابوبکر عباد نے شرکت کی۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر شمیم احمد، استاذ سینٹ اسٹیفنس کالج نے انجام دیے۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ اردو ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر نجمہ رحمانی نے مقرر خصوصی

کا استقبال گلدستہ پیش کر کے کیا۔ ڈاکٹر ریاض عمر نے اپنے خصوصی خطبے میں کہا کہ اس پروگرام میں آکر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہاں طلبہ و اساتذہ زیادہ تر دہلی کے باہر کے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ بالکل نہیں ہے کہ آپ جن شہروں اور علاقوں سے آئے ہیں ان کی اہمیت کچھ کم ہے۔ پروگرام میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا و طالبات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 10 مارچ 2022

طب یونانی اور موجودہ صحت کے مسائل

نئی دہلی: جامعہ ہمدرد، نئی دہلی کے شعبہ تحفظی و سماجی طب، اسکول آف یونانی میڈیسن اینڈ ریسرچ کے ذریعے طب یونانی اور موجودہ صحتی مسائل پر دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ یہ کانفرنس قومی ماحولیاتی سائنس اکادمی کے اشتراک اور ڈپارٹمنٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے تعاون سے عمل میں آ رہی ہے۔ کانفرنس کا عنوان موجودہ صحتی مسائل میں طب یونانی کا کردار اور لائف اسٹائل بیماریوں کا تدارک وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس کے تحت ملک اور بیرون ممالک کے تقریباً 120 مندوبین نے شرکت کی۔ افتتاحی اجلاس جامعہ ہمدرد کے کنونشن ہال میں منعقد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر عاصم علی خان، ڈائرکٹر جنرل، سینٹرل کاؤنسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، وزارت آیوش نے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اپنے بیان میں ڈاکٹر عاصم علی خان نے کاؤنسل کے طب یونانی کے فروغ کے لیے کیے جانے والے کارناموں پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر عارف زیدی، ڈین اسکول آف یونانی میڈیسن نے مہمانان کا استقبال کیا اور کانفرنس کی اہمیت کے بارے میں بتایا۔ پروگرام کے مہمان اعزازی ڈاکٹر مختار احمد قاسمی، ایڈوائزر یونانی، وزارت آیوش نے جامعہ ہمدرد کو طب یونانی کا مرکز امتیاز حاصل کرنے پر مبارکباد دی۔ اس پروگرام میں بین الاقوامی مندوبین میں جرمنی کی ڈاکٹر کلاڈیا پریکل، ایران کے ڈاکٹر مجاحدی، سری لنکا کے ڈاکٹر رئیس الدین اور امریکہ سے آئے ہوئے ڈاکٹر رام کرشنا شاہ، صدر گلوبل یونانی میڈیسن اینڈ ریسرچ فاؤنڈیشن خصوصی طور پر شامل تھے۔ ڈاکٹر شاہ نے طب یونانی کے فروغ میں اطبا کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا، ساتھ ہی بلا تفریق مذہب و ملت قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنے پر خصوصی زور دیا۔ ڈاکٹر جاوید احمد، پریسیڈنٹ، نیشنل انوائرنمنٹ سائنس اکادمی نے جامعہ ہمدرد کی ترقی میں شیخ الجامعہ کے نمایاں کردار کی تعریف کی ساتھ ہی شیخ الجامعہ پروفیسر افشار عالم کو 'اکیڈمک ایکسیلنس ایوارڈ' سے نوازا۔ ساتھ ہی کانفرنس کے روح رواں پروفیسر محمد اکرم کو اعزازی سند سے بھی نوازا۔ اپنے صدارتی خطبے میں شیخ الجامعہ پروفیسر افشار عالم نے موجودہ دور میں طب یونانی کی افادیت پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 30 مارچ 2022

اتر پردیش

اردو ادب میں طنز و مزاح

میرٹھ: طنز و مزاح سے اگر ہم اصلاح کا پہلو نکال دیں تو یہ صرف ایک تضحیک بن کر رہ جائے گا۔ قدیم داستانوں میں طنز و مزاح ملتا ہے، لیکن اس کے بعد اسداللہ خاں کے کلام میں طنز و مزاح کی اچھی مثالیں ملتی ہیں اور غالب نے ہی اپنے خطوط کے ذریعے نہ صرف طنز و مزاح نگاری کو ایک نئے مزاج سے آشنا کیا بلکہ ہمارے ادب کو ایک نیا اسلوب اور نیا موڑ بھی عطا کیا۔ بعد ازاں سر سید، شبلی اور ڈپٹی نذیر کے یہاں بھی طنز و مزاح کے عمدہ نمونے نظر آتے ہیں۔ یہ الفاظ تھے راشٹریہ سہارا اردو کے سابق ایڈیٹر اور معروف طنز و مزاح نگار اسد رضا کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیر اہتمام 24 مارچ 2022 کو منعقد 'اردو ادب میں طنز و مزاح' موضوع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر میں آن لائن ادا کر رہے تھے۔ اس ادب نما پروگرام کی سرپرستی پروفیسر اسلم جمشید پوری اور صدارت عارف نقوی، جرمنی نے فرمائی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم، مہمان خصوصی کا تعارف ڈاکٹر ارشاد سیانوی، نظامت ڈاکٹر فرح ناز اور شکریے کی رسم سیدہ مریم الٰہی نے انجام دی۔

پریس ریلیز: پروفیسر اسلم جمشید پوری، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، 24 فروری 2022

مولوی محمد باقر

مراد آباد: مہاراجہ ہریش چندر ڈگری کالج میں شعبہ اردو اور آرٹس کی جانب سے محمد باقر کے 200 سالہ یوم شہادت کے موقعے پر ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ کالج کے منیجر ڈاکٹر کاویہ سوربھ رستوگی نے شمع روشن کر کے پروگرام کا آغاز کیا۔ کلیدی مقرر کی حیثیت سے معروف آرٹسٹ اور کالج کے شعبہ آرٹ کے صدر ڈاکٹر نریندر سنگھ نے کہا کہ ہم ہر موضوع کے لکھنے والوں کو پڑھتے اور جانتے ہیں۔ ہندی کے ادیبوں کو ہندی والا اور اردو اور دیگر زبانوں کے ادیبوں کو ان کی زبان کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن محمد باقر ایک ایسے مجاہد کا نام ہے جو پوری ہندوستانی تاریخ میں اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ محمد باقر نے حق اور سچائی کے لیے انگریزوں سے لڑتے لڑتے اپنی جان دے دی، اور اردو صحافت میں دہلی اردو اخبار کے نام سے سچ سماج کے سامنے لاتے رہے۔ اس موقعے پر کالج کے طلبہ و طالبات نے تحقیقی مقالوں کے ذریعے مولوی محمد باقر کی شخصیت اور کام پر روشنی ڈالی جس میں عالمہ انجمی نبیہ، رحمان، صائمہ پروین، یاسمین، شمائلہ، ندیم اسرار احمد وغیرہ شامل تھے۔ مہمان خصوصی کے طور پر جن منشا کے ایڈیٹر راج کمار وج نے تمام طلبہ و طالبات کو محمد باقر کی شخصیت اور تاریخ صحافت سے روشناس کرایا۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر سدھیر کمار اروڑا نے شعبہ اردو اور شعبہ فائن آرٹ کو محمد باقر پر پروگرام کا انعقاد کرنے پر مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 31 مارچ 2022

پریم چند کی کہانیوں میں سماجی سروکار

لمہی، وارانسی: پریم چند اردو اور ہندی کے نمائندہ فکشن نگار تھے۔ دونوں زبانوں کے ادب میں ان کی خدمات مشترک ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ اردو کے ہی کہانی کار ہیں۔ ان کی افسانہ و ناول نگاری نے محروم و مظلوم طبقے میں نہ صرف بیداری پیدا کی ہے بلکہ ذات اور امتیازی سلوک کے خاتمے میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی یکجہتی ایوارڈ یافتہ ممتاز ہندی ادیب اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس بنارس ہندو یونیورسٹی پروفیسر وجے بہادر سنگھ نے پریم چند ریسرچ سینٹر لمہی کے زیر اہتمام 'پریم چند کی کہانیوں میں سماجی سروکار' کے موضوع پر منعقد سمینار میں کیا۔ اس سمینار کی صدارت معروف ہندی ادیب و سابق صدر شعبۂ ہندی بنارس ہندو یونیورسٹی پروفیسر رادھے شیام دوبے نے کی۔ اپنے صدارتی کلمات میں انھوں نے پریم چند کی روایت اور وراثت دونوں پر مفصل روشنی ڈالی۔ ساتھ ہی کہا کہ ملک، سماج اور زبان و ادب پر پریم چند کا بڑا احسان ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ پروفیسر شری پرکاش شکل نے پریم چند کی حقیقت پسندی کا بھرپور احاطہ کیا اور کہا کہ پریم چند کی تمام کہانیاں اپنے عہد کی ترجمان ہیں۔ وہ ایک عظیم فنکار تھے۔ اس موقعے پر صدر شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، ڈاکٹر رام سدھار سنگھ، پروفیسر دیا شنکر سنگھ و دیگر مقررین نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر بنارس ہندو یونیورسٹی کے اساتذہ بالخصوص پروفیسر رنگ ناتھ پاٹھک، پروفیسر لال جی، ڈاکٹر راجیش سرکار، ڈاکٹر اشک کمار جیوتی، ڈاکٹر ستیہ پرکاش، ڈاکٹر محمد قاسم انصاری، ڈاکٹر احسان حسن ڈاکٹر کنکشن

پٹیل ودیگر کالجوں کے اساتذہ موجود رہے۔ بڑی تعداد میں اسکالرز، سماجی کارکنان اور مقامی لوگوں نے پریم چند کو یاد کیا۔ پروگرام کی نظامت شعبہ سنسکرت بنارس ہندو یونیورسٹی ڈاکٹر شلپا سنگھ نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 مارچ 2022

حسرت موہانی کی ادبی خدمات

رامپور: گورنمنٹ گرلز پوسٹ گریجویٹ کالج، رامپور میں شعبۂ اردو کی جانب سے آزادی کے 75ویں سال امرت مہوتسو کے جشن میں جنگ آزادی میں حسرت موہانی کی ادبی خدمات کے موضوع پر شاندار سمینار کا

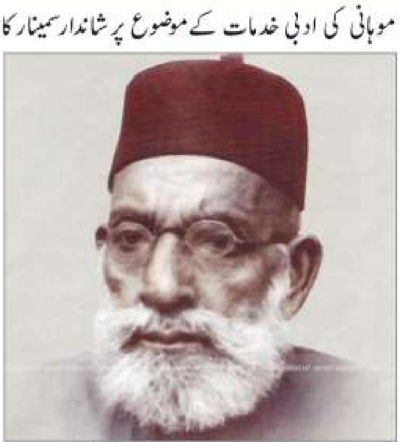

انعقاد کالج کے آڈیٹوریم میں کیا گیا، جس کی صدارت کالج کے پرنسپل پروفیسر اتل شرما نے کی۔ انھوں نے کہا کہ مجھے خوشی ہورہی ہے کہ طالبات نے مجاہدین آزادی کے حالات زندگی اور ان کی ادبی خدمات پر بہترین انداز میں اپنے مقالات پیش کیے۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر رضیہ پروین نے پروگرام اور سمینار کے موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پروگرام کے مہمان خصوصی، کیئر ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے سکریٹری نے کہا کہ اس طرح کے سمینار سے ہمارے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس پروگرام کی جج شعبۂ ہندی کی صدر ڈاکٹر نشاط بانو نے سمینار میں پڑھے گئے مقالوں پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے طالبات کے روشن مستقبل کی دعا کی اور امید کی کہ اسی طرح طالبات دوسرے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گی، چیف پراکٹر ڈاکٹر صبیحہ پروین نے کہا کہ طالبات نے جس طرح سے حسرت موہانی کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی، وہ ان کے لیے سچا خراج عقیدت ہے۔ طالبات نے 'جنگ آزادی میں حسرت موہانی کی ادبی خدمات' کے موضوع پر اپنے اپنے مقالات پیش کیے جس میں ذکریٰ توفیق (بی اے سال سوم) نے پہلی، رشدہ رحمان (ایم اے سال اول) نے دوسری اور مبشرہ (بی اے سال اول) نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ اس موقعے پر طالبات نے حسرت موہانی کے مشہور ومقبول اشعار پیش کیے۔ ذکریٰ نے ایسے جانباز شاعر کو سلام پیش کیا جس نے دیش کو انقلاب زندہ باد جیسے جوشیلے نعرے دیے۔ پروگرام میں امتیازی پوزیشن حاصل کرنے والی طالبات کے علاوہ ظاہرہ، طوبیٰ، زرفشاں، شبینہ، ثمرہ ظفر، گل بہار، حفظہ وغیرہ نے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر افتخار احمد قادری اور ڈاکٹر محمد قاسم نے کہا کہ حسرت جیسے عظیم شاعر کو بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے، جو ہماری ہندوستانی تہذیب کے لیے بے مثال ہیں۔ سمینار کے انعقاد میں ثمرہ ظفر، اقرا، بشریٰ اور شبینہ کا اہم رول رہا۔ ڈاکٹر سنیتا نے طالبات کی حوصلہ افزائی کی اور پرنسپل ڈاکٹر اتل شرما نے شعبۂ اردو کو اس شاندار سمینار کے لیے مبارکباد پیش کی۔ آخر میں ڈاکٹر افتخار احمد قادری نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر کالج کے تمام اساتذہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 مارچ 2022

پریم چند جین اور ان کی یادیں

نجیب آباد: پروفیسر کوی پریم جین کے یوم وفات کے موقعے پر 'پریم چند جین اور ان کی یادیں' عنوان پر منعقدہ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے مقررین نے کہا کہ پریم چند جین ایک شخص ہی نہیں بلکہ ایک شخصیت تھے۔ ہم ان کے تعلیمی اور زندگی جینے کے مشن پر چل کر اپنی زندگی کو سنواریں۔ اس موقعے پر ان کی زندگی پر دانش سیفی کے ذریعے مرتب کی گئی کتاب 'اتہاس ہوا ایک ادھیا یک' کا بھی اجرا کیا گیا۔ اگروال دھرم شالہ میں منعقدہ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے مقررین ڈاکٹر سوریہ منی رگھوونشی، محمود ظفر، ڈاکٹر دیوراج، ڈاکٹر اے کے متل، اندر دیو بھارتی، ڈاکٹر ہیم لتا، ڈاکٹر آفتاب نعمانی، شکیل رضا، پردیپ ڈیزی، آشا جین نے کہا کہ پریم چند جین نے اپنے شاگردوں کو سچی راہ دکھانے اور سنوارنے کا کام کیا۔ انھوں نے پہلے خود عمل کیا پھر اپنے ساتھیوں اور شاگردوں کو سچی راہ پر چلنے کا پیغام دیا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے درد کو اپنا درد سمجھتے تھے۔ ان کے اندر پریم کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ان کے اندر کبھی بھی کسی کے لیے کوئی تعصب نہیں رہا۔ آج ہزاروں شاگردان کے نام کو روشن کررہے ہیں۔ وہ علم کے ایک ایسے سمندر تھے جس کی اونچائی ہمالیہ سے بھی اونچی ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 17 مارچ 2022

ساحر لدھیانوی کی شخصیت اور ادبی خدمات

رامپور: اترپردیش اردو اکادمی کے ذریعے نزل ورگ

سیوا سمیتی کے زیر اہتمام افروز میرج ہال میں یک روزہ اردو سمینار کا اہتمام بہ عنوان 'ساحر لدھیانوی کی شخصیت اور ادبی خدمات' پر منعقد ہوا۔ سمینار کی صدارت معروف محقق عتیق جیلانی سالک نے کی۔ جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر عالمی شہرت یافتہ ناظم مشاعرہ منصور عثمانی نے شرکت کی۔ کلیدی خطبہ سابق صدر شعبہ اردو گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے پیش کرتے ہوئے کہا کہ دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں، جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں۔ یہ شعر اس ساحر لدھیانوی کی میراث ہے جس کی شخصیت اور ادبی خدمات کے تعلق سے اس سمینار کا انعقاد کیا گیا ہے۔ منصور عثمانی نے کہا کہ ساحر کی شخصیت سے ہمیں سیکھنا چاہیے اور ہمیں ان کی شخصیت کو اپنی زندگی میں اتارنا چاہیے۔ صدر محفل عتیق جیلانی سالک نے کہا کہ ساحر کی شخصیت پر پڑھے جانے والے مضامین کو کتابی شکل دیا جانا چاہیے۔ اس موقعے پر صدر جمہوریہ ایوارڈ یافتہ ڈاکٹر معراج الحسن سہوانی، گورنمنٹ رضا پی جی کالج رضیہ پروین، صدر شعبہ اردو مرادآباد مسلم ڈگری کالج مرادآباد، ڈاکٹر شاکر اصلاحی، ڈاکٹر محمد آصف، شہپر شریف، گلناز صدیقی نے ساحر لدھیانوی کی شخصیت پر اپنے مقالات پیش کیے۔ آخر میں نریندر پرکاش راٹھور اور شوکت علی کنوینر سمینار نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت رباب انجم نے کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 21 مارچ 2022

اردو صحافت اور مولانا عبدالماجد دریابادی

لکھنؤ: اردو صحافت کے 200 سال مکمل ہونے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن لکھنؤ کے زیر اہتمام صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ کے اشتراک سے اسلامک سینٹر آف انڈیا عیدگاہ لکھنؤ میں ایک سمینار بعنوان 'اردو صحافت اور مولانا عبدالماجد دریابادی' ہوا۔ اس کی صدارت مولانا خالد رشید فرنگی محلی چیئرمین اسلامک سینٹر آف انڈیا نے

کی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی سابق صدر شعبۂ اردو ممتاز پی جی کالج لکھنؤ اور مقرر خصوصی پروفیسر محمد شافع قدوائی چیئرمین شعبۂ صحافت و ترسیل عامہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تھے۔ سیمنار میں نظامت کے فرائض عاطف حنیف نے انجام دیے۔ سید محمد شعیب نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی نے مولانا دریابادی کی صحافتی خوبیوں پر مدلل مقالہ پڑھا۔ روی بھٹ اور پروفیسر عباس مہدی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر عائشہ قدسی قدوائی نے کلمات تشکر ادا کیے۔ ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی نے اپنے خطاب میں مولانا دریابادی کی صحافت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک صاحب نظر صحافی تھے۔ انھوں نے صحافیوں کو مشورہ دیا کہ وہ مولانا دریابادی کی طرح خبر و نظر کے جامع بنیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا کے جرائد سچ، صدق اور صدق جدید حقیقت و صداقت کے ترجمان تھے۔ پروفیسر محمد شافع قدوائی نے اپنے خطاب میں مولانا دریابادی کی صحافت کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مولانا کا افتتاحی کالم 'سچی باتیں' ان کے مخصوص نصب العین یعنی اخلاقی قدروں کی بازآفرینی، مذہب کی سربلندی اور احیا کے جذبہ کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ سید محمد شعیب نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں کہا کہ اردو صحافت کے حوالے سے مارچ کا مہینہ نہایت اہم ہے۔ آج سے ٹھیک 200 سال قبل 27 مارچ 1822 کو ہری ہردت نے کلکتہ سے اردو کا پہلا اخبار 'جام جہاں نما' نکالا۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافت کی اس ابتدا کو پروان چڑھانے میں اس دور کے تمام صحافی پیش پیش رہے۔ مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی نے اپنے مقالے میں مولانا دریابادی کی صحافتی خصوصیات کا تذکرہ کیا۔ روی بھٹ نے اردو زبان و ادب کے حوالے سے دلچسپ تقریر کی۔ پروفیسر عباس مہدی نے اردو ادب و صحافت پر مختصر تقریر کی۔ مولانا خالد رشید فرنگی محلی نے اپنے صدارتی خطاب میں مولانا دریابادی کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا دریابادی کا علمائے فرنگی محل سے گہرا ربط و تعلق تھا۔ تحریک خلافت کے زمانے میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے ان کا مشورہ ہوتا تھا۔ مولانا فرنگی محلی نے تفسیر ماجدی کی خصوصیات بیان کیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 21 مارچ 2022

ملک زادہ منظور احمد: فن اور شخصیت

لکھنؤ: پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اردو زبان و ادب کے ایسے تہذیبی سفیر تھے جنھوں نے دنیا کے کونے کونے

میں اردو کی تہذیب کو پہنچایا۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے جنرل سکریٹری، اسلامیہ کالج کے منیجر اطہر نبی ایڈووکیٹ نے سدرئی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام و اتر پردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے منعقد سیمنار 'پروفیسر ملک زادہ منظور احمد: فن اور شخصیت' کی صدارت کرتے ہوئے اولڈ اردو اکادمی بلڈنگ، قیصر باغ میں کیا۔ اطہر نبی نے مزید کہا کہ وہ پوری زندگی اردو تحریک سے جڑے رہے۔ آل انڈیا اردو رابطہ کمیٹی کے ذریعے اردو زبان کی بقا اور تحفظ کے لیے انھوں نے جو کوششیں کی تھیں انھیں بھلایا نہیں جاسکتا۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ مشاعرے کی نظامت میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ ڈاکٹر احتشام احمد خان نے کہا کہ ملک زادہ منظور احمد میرے مربی اور سرپرست تھے، ملک زادہ بیک وقت استاد، شاعر، ناقد اور ناظم تھے۔ ملک زادہ جاوید نے کہا کہ والد محترم کے انتقال کا صدمہ صرف میرے خاندان کا صدمہ نہیں بلکہ پوری دنیا میں جہاں جہاں اردو والے ہیں یہ ان سب کا ذاتی صدمہ ہے۔ وہ اردو کے محاذ کے سب سے مضبوط سپاہی نہیں بلکہ جنرل کرنل کی حیثیت رکھتے تھے، مشاعروں کے اسٹیج سے وہ اردو کی حمایت جس جرأت سے کرتے تھے ویسا اب کوئی دوسرا کرنے والا نہیں ہے۔ محمد ضیاء اللہ صدیقی نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ استاد محترم پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اہل اردو ادب نے جتنا زیادہ ان کو یاد کیا ہے شاید ہی کسی اور ادیب و شاعر کے حصے میں یہ خوش قسمتی آئی ہو۔ پروفیسر آصفہ زمانی اور محسن خان نے کہا کہ ہمارے نزدیک ملک زادہ منظور احمد کا مرتبہ اس لیے بھی بلند ہے کہ انھوں نے مشاعروں میں سنسنی اور ہنگامی یا جذباتی قسم کی مقبول عام شاعری کے بجائے اپنے انفرادی لب و لہجے کو قائم رکھا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے نقادوں نے یہ بڑا ظلم کیا کہ مشاعرے میں اچھی اور اعلیٰ درجے کی شاعری سنانے والے شعرا کو اپنی فہرست خاص سے کاٹ دیا۔ اس موقعے پر مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کو سدرئی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کی جانب ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ نظامت ڈاکٹر سیما صدیقی نے کی۔ ابتدا میں استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے پرویز ملک زادہ نے سوسائٹی کے شکریہ کے ساتھ کہا کہ والد محترم ملک زادہ منظور احمد مشاعرے کے ان مشاعرہ باز شاعروں میں سے نہیں تھے جو صرف عوام کے جذبات کو ذہن میں رکھ کر شاعری کرتے ہیں بلکہ ملک زادہ نے مشاعرے کو بلند معیار دیا۔ ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی، ڈاکٹر مسیح الدین خان، ڈاکٹر یاسر جمال، ڈاکٹر خورشید جہاں، ڈاکٹر شجاع الحق ندوی، پروفیسر ارشاد احمد خان بیاروی، مولانا عبدالکریم ندوی، محمد راشد خان، نثار احمد ندوی، تبسم فاروقی، ضیاالله صدیقی، ڈاکٹر سیما صدیقی اور رفیع احمد وغیرہ نے اپنے مقالوں میں مشترکہ طور پر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ملک زادہ کی شاعری اور بالخصوص ان کی خودنوشت کی بھی تحسین کی۔ سیمنار میں ہمایوں چودھری، اویس سنبھلی، ڈاکٹر سید محمد صبیح ندوی، محمد یونس سلیم، کمال احمد ندوی نے بھی خطاب کیا۔ آخر میں مہمان، مقالہ نگاران اور سامعین کا شکریہ کنوینر پروگرام محمد ضیاء اللہ صدیقی نے ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 21 مارچ 2022

کلاسیکی متون کی فرہنگ: ضرورت اور اہمیت

رامپور: مہاراجہ ہریش چندر پی جی کالج کے زیر اہتمام کلاسیکی متون کی فرہنگ: ضرورت اور اہمیت کے عنوان پر پروفیسر محمد حسن میموریل لیکچر کا انعقاد عمل میں آیا۔ سیمنار کا افتتاح مہمان خصوصی ڈاکٹر کاویہ سوربھ رستوگی، پروفیسر سدھیر کمار اروڑہ، پروفیسر شریف احمد قریشی، اسسٹنٹ پروفیسر شہپر شریف اور صحافی صدام حسین فیضی نے شمع افروزی سے کیا۔ استقبالیہ خطبہ ناظم سیمنار ڈاکٹر عبدالرب نے پیش کرتے ہوئے کہا کہ محمد حسن یادگاری خطبات کا سلسلہ دو سال قبل شروع کیا گیا تھا۔ یہ اس سلسلے کا دوسرا خطبہ ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے کہا کہ محمد حسن کی خدمات اردو ادب میں ناقابل فراموش ہیں۔ وہ اپنے علمی و ادبی کارناموں کی بدولت ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ انھوں نے کلاسیکی متون کی فرہنگ کے متعلق بہت دلچسپ انداز میں لیکچر دیا اور کہا کہ فرہنگ نویسی بہت ذمہ داری کا کام ہے۔ مزید کہا کہ لغات کو سامنے رکھ کر فرہنگیں تیار

کردی جاتی ہیں جبکہ کلاسیکی متون کا مطالعہ کرتے ہوئے بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو اپنا تہذیبی سیاق رکھتے ہیں۔ ان تمام امور کو ملحوظ رکھ کر فرہنگ تیار کی جائے۔ آخر میں پرنسپل پروفیسر سدھیر کمار اروڑہ نے شریف احمد قریشی کے لیکچر کو طلبا اور اردو زبان و ادب سے شغف رکھنے والوں کے لیے معلوماتی اور اہم قرار دیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 24 مارچ 2022

جنگ آزادی میں اردو صحافت کا کردار

سہارنپور: جنگ آزادی کی لڑائی میں اردو صحافت کا کردار اور کارنامہ تاریخ آزادی کا ایک ایسا سنہرا باب ہے جس میں جھانکنے سے تمام چیزیں خود بخود روشن ہو جاتی ہیں اسی لیے آج بھی سبھی لوگ وہ چاہے کسی بھی مذہب کے ہوں، اپنی تمام تر تحریکوں اور مظاہروں میں اردو کے الفاظ خصوصاً انقلاب جیسے الفاظ کا برملا اظہار کرتے ہوئے اپنے تحریکی ساتھیوں میں نیا جوش اور نیا حوصلہ پیدا کرتے ہیں اس لیے اردو زبان کا جادو آج بھی سر چڑھ کر بولتا ہے۔ میں مبارکباد پیش کرتا ہوں ذمہ داران تنظیم کو جنھوں نے اردو صحافت کے 200 سال پورے ہونے پر پروگرام کا انعقاد کیا۔ مندرجہ بالا خیالات کا اظہار مشہور سماجی کارکن اور ممتاز صحافی مفتی محمد خبیر ندوی علیگ نے 'اردو صحافت کا جنگ آزادی میں کردار' کے عنوان سے منعقدہ تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ SBH سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب میں علمی، ادبی، سماجی اور صحافتی خدمات انجام دینے والی ممتاز شخصیات کو مومنٹو پیش کرتے ہوئے اعزازات سے نوازا گیا۔ تقریب میں مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا محفوظ قاسمی، مولانا شبیر مظاہری، سعید ہاشمی، عرفان منصوری، قاری محمد حلیم، سمیت دیگر حضرات نے خطاب کیا۔ اخیر میں سوسائٹی کے سکریٹری افضال حسین صدیقی کے کلمات تشکر پر تقریب کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 مارچ 2022

ادب میں محاوروں اور کہاوتوں کی اہمیت

رامپور: گورنمنٹ گرلز پوسٹ گریجویٹ کالج میں شعبۂ اردو کی جانب سے بعنوان 'ادب میں محاوروں اور کہاوتوں کی اہمیت' پر ایک ویبینار کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی اور مقرر خاص گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج رامپور کے سابق صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے مندرجہ بالا عنوان پر پر مغز خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ محاوروں اور کہاوتوں کا روزمرہ کی زندگی کے ساتھ ساتھ ادب میں بہت اہمیت ہے۔ محاوروں اور کہاوتوں کے ذریعے سے باتوں میں اثر اور وزن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ شعبۂ اردو کی صدر ڈاکٹر رضیہ پروین نے عنوان سے متعلق اہم گفتگو کی۔ شعبۂ اردو کے ڈاکٹر محمد قاسم نے بہترین انداز میں نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس موقعے پر کالج کے پرنسپل پروفیسر اٹل شرما نے اپنے صدارتی خطبے میں محاوروں اور کہاوتوں کے متعلق اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کو پیش کیا۔ آخر میں شعبہ اردو کے استاد پروفیسر افتخار احمد قادری نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ اس ویبینار میں ڈاکٹر نشاط بانو، ڈاکٹر سنیتا اور ڈاکٹر انکیتا نے اہم رول ادا کیا۔ اس موقعے پر کالج کی طالبات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مقرر خاص سے اہم سوالات کیے۔ اس پروگرام میں کالج کے سبھی اساتذہ نے حصہ لیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 مارچ 2022

ہندوستانی سماج کی تشکیل میں صوفیا کا کردار

دیوبند: حضرت شاہ ولایت تعلیمی اور سماجی بہبود سوسائٹی کے زیر اہتمام پروفیسر عنوان چشتی مرحوم کے قائم کردہ شاہ ولایت ماڈرن گرلز کالج میں 'ہندوستانی سماج کی تشکیل میں صوفیہ کا کردار' عنوان سے یک روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے بین الاقوامی شہرت یافتہ گورو شری مہامنڈلیشور شری سوامی کپل کٹی مہاراج (سربراہ ہری رام آشرم) نے کہا کہ صوفی سنت سماج میں ہمیشہ سے سفیر محبت و انسانیت ہیں، صوفیوں اور سنتوں کی وراثت پر ہی ہمارا سماج قائم ہے۔ سابق وزیر اتراکھنڈ سید حیدر علی زیدی نے کہا کہ صوفیائے کرام نے ہمیشہ انسانی یک جہتی پر زور دیا اور اپنی زندگی کے ذریعے اس کا عملی ثبوت پیش کیا۔ صدر جلسہ شاہ سیف الرحمان جمالی نے کہا کہ انسان دوستی کا دوسرا نام تصوف ہے۔ کمل دیوبندی نے تصوف کو اسلام کا حصہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس کا حاصل تزکیہ نفس ہے اور یہ شریعت میں مطلوب ہے کہ آدمی خود کو اوصاف رذیلہ سے پاک کرے اور اپنے اندر اوصاف حسنہ پیدا کرے۔ پروفیسر تنویر چشتی نے کہا کہ روحانی تجربے کی جمالیات کے اظہار کا نام ہی تصوف ہے اور یہ انسان کو زندگی گزارنے کا خوبصورت نقطہ نظر عطا کرتا ہے۔ اسلامیہ گروپ کے چیئرمین ڈاکٹر عظیم الحق نے کہا کہ صوفیوں نے سماج میں ہمیشہ ایکتا اور اتحاد کو فروغ دیا ہے۔ پروفیسر پنڈت لکشمن مہاراج نے کہا کہ صوفیوں اور سنتوں نے ہمیشہ شر پر خیر کو ترجیح دی ہے۔ ڈاکٹر قدسیہ انجم نے کہا کہ صوفیائے کرام نے ہمیشہ عدم تشدد کو فروغ دیا۔ اس دوران کپل منی اور کوثر کیرانوی نے اپنی روحانی نظم 'ماں' پیش کی۔

سیمینار و استقبالیہ کمیٹی کے سربراہ پروفیسر تابش جمال چشتی کے شکریہ پر سیمینار اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 مارچ 2022

جدید اردو غزل کے رجحانات

میرٹھ: زبانیں تہذیب و کلچر کی بقا کی ضامن ہوتی ہیں، وہ نفرتوں کو دور کر کے امن و آشتی اور اخوت و مساوات کا درس دیتی ہیں۔ زبان خواہ کوئی بھی ہو اس کی اصل روح یہی ہے۔ لہٰذا ادب اور زبانوں کی زمرہ بندی یا تقسیم کی بجائے انھیں مشترکہ تہذیب کی علامت کے طور پر فروغ دینا چاہیے۔ آج کے اس ماحول میں ادب اور زبانیں ہی بہتر مستقبل کی راہ ہموار کر سکتی ہیں۔ یہ الفاظ تھے مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ، وارانسی کے شیخ الجامعہ پروفیسر آنند کمار تیاگی کے جو شعبۂ انگریزی، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے سہ روزہ لٹریری فیسٹول کے دوسرے دن 'جدید اردو غزل کے رجحانات' موضوع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے ادا کر رہے تھے۔ صدارت کے فرائض صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی پروفیسر شبنم حمید نے انجام دیے۔ کلیدی خطبہ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے پیش کیا اور مقررین کی حیثیت سے شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر سرور ساجد، پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی، صدر شعبۂ انگریزی پروفیسر وکاس شرما، اسماعیل نیشنل پی جی گرلز کالج، میرٹھ سے ڈاکٹر ہما مسعود اور میرٹھ یونیورسٹی سے ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر آصف علی، نظامت آفاق احمد خاں اور شکریے کی رسم ڈاکٹر شاداب علیم نے انجام دی۔ اس موقعے پر سعید احمد سہارنپوری، ربا خان، اقصیٰ راؤ اور وارث وارثی نے غزلیں سنا کر خوب داد و تحسین حاصل کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 مارچ 2022

سید حامد کی شخصیت اور خدمات

مراد آباد: اردو صحافت کے دو سو سالہ جشن کا انعقاد زیر اہتمام روزنامہ 'آگ' لکھنؤ و شرم جیوی پتر کار یونین و ایم وائی فلکشہ سماج کلیان گرامین وکاس ایوم تر سکرت سماج کمیٹی بڑے جوش و خروش کے ساتھ منعقد کیا گیا۔ اس پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر زیبا ناز نے انجام دیے۔

پروگرام کا موضوع رہا 'سید حامد کی شخصیت اور خدمات'۔ مقررین نے ان کی خدمات اور شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے سرسید احمد خاں بانی علی گڑھ یونیورسٹی علی گڑھ کا ثانی بتاتے ہوئے کہا کہ ایسی شخصیات کا اب قوم میں فقدان ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں نے جو خواب اپنی قوم کے لیے دیکھا تھا وہ سید حامد علی مرحوم پورا تو نہ کرسکے حالانکہ وہ مراد آباد میں پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے اپنے تعلیمی مدارج مراد آباد کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طے کیے اور علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی بنے۔ اس عہدہ پر رہتے ہوئے انھوں نے اپنی قوم کے لیے بے پناہ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے خدمات انجام دیں۔ اس اجلاس کو خطاب کرنے والوں میں محمد رضی خاں، اسرار احمد خاں، غیاث الدین، الیس فضیلت، مرزا ارشد بیگ، ندیم راعی، الوک کھنہ، ماجد خاں، قاسم مرادآبادی، ڈاکٹر محمد آصف، ماسٹر مزمل، ماسٹر ظہیر حسین، ظفر اقبال، بہار سنبھلی، اشہر مرادآبادی، چاند مرادآبادی، خیال مرادآبادی، قاضی مسرت حسین ایڈوکیٹ وغیرہ تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 مارچ 022

اردو کی موجودہ صورت حال

پریاگ راج: رائج قول کے مطابق اردو کے اولین اخبار 'جام جہاں نما' سے شروع ہونے والے اردو صحافت کے دوسو سالہ سفر مکمل ہونے کے تعلق سے نوراللہ روڈ پر واقع شگن پیلس میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں اردو زبان اور صحافت پر ریسرچ اسکالروں اور مقررین نے سیر حاصل گفتگو کی اور بتایا کہ اردو صحافت سرفروشی، قربانی، ایمانداری اور صداقت سے عبارت ہے۔ جام جہاں نما کے بانی ہری ہر دت رائے اور ایڈیٹر منشی سدا سکھ نے اردو صحافت کے ذریعہ نئی سمت عطا کرنے کے ساتھ اردو زبان کے اثرات اور قوت کی بنیاد ڈالی۔ سماجی خدمت گار انجینئر فرید الحق و شاہد کمال خان کے اشتراک سے منعقدہ اس سیمینار کو پروفیسر صالحہ رشید صدر شعبہ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو شیرینی اور لطافت سے پرکشش زبان ہے۔ وہ اپنی طلسماتی خصوصیت کی وجہ سے ہی چاردانگ عالم میں مسلم الثبوت ہے اور یہ زبان تہذیب سے متعارف ہے۔ مواقع کے لحاظ سے بھی اس کے وسیع امکانات ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرس محمد ارشد، جاوید احسن و عمیر حسامی کی کتابوں کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس سے قبل ڈاکٹر آصف عثمانی، محمد گلفام کوشامبی اور طالبات تحسین بانو، شازیہ وزینت نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سید انوار صفی نے سیمینار کی نظامت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 مارچ 2022

بہار

فروغ اردو سیمینار

مدھے پورہ: اردو پیار اور محبت کی زبان ہے۔ اردو کی ترقی میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں سے میری گزارش ہے کہ وہ اردو کے فروغ کے لیے جدید ٹکنالوجی کا بھی استعمال کریں تاکہ اردو کی خوبصورتی کو سبھی طبقے کے لوگ محسوس کرسکیں۔ یہ باتیں ہفتہ کو ضلع ہیڈ کوارٹر واقع کلا بھون میں ضلع اردو سیل کے زیر اہتمام فروغ اردو سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے ضلع مجسٹریٹ شیام بہاری مینا نے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتی ہیں۔ پروگرام کی صدارت کررہے ضلع اردو سیل کے انچارج افسر وڈی پی او آئی سی ڈی ایس محمد کبیر نے کہا کہ کسی بھی زبان کے عروج و زوال کا انحصار عوام کے تعلقات سے ہے۔ جب تک زبان کا تعلق عوام سے ہوتا ہے زبان فروغ پاتی ہے جب اس کا تعلق عوام سے ختم ہوجاتا ہے تو وہ زبان دھیرے دھیرے اپنی اہمیت کھودیتی ہے۔ اس لیے اردو زبان سے تعلق قائم کرنا ضروری ہے۔ اس کی تعلیم کو اپنے گھروں میں رائج کرنا ضروری ہے۔ پروگرام کا افتتاح ضلع مجسٹریٹ، اے ڈی ایم، اردو سیل افسر سمیت دیگر مہمانوں نے شمع روشن کرکے کیا۔ پروگرام کی نظامت رضاء الرحمٰن مہرو نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 مارچ 2022

مہاراشٹر

تعلیمی ترقی

سولاپور: ملک کی یکجہتی اور سالمیت کے لیے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی ترقی ضروری ہے۔ یہ دونوں زبانیں ملک کے تقریباً سبھی علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ اس لیے ان دونوں زبانوں کی ترقی کے لیے خصوصی پہل ہونی چاہیے، ان خیالات کا اظہار جے این یو نئی دہلی کے پروفیسر ڈاکٹر شفیع ایوب نے کیا۔ ماہنامہ گل بوٹے، ممبئی ہفت روزہ اردو میلہ اور سوشل آرٹس اینڈ کامرس کالج، سولاپور کے زیر اہتمام بچوں کی تعلیمی ترقی کے لیے مشترکہ طور پر ایک قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔

سیمینار کی صدارت انجمن اسلام ممبئی کے نائب صدر ڈاکٹر شیخ عبداللہ نے کی۔ رئیس ہائی اسکول بھیونڈی کے چیئرمین ایڈوکیٹ یاسین مومن، ڈاکٹر اخلاق احمد وڈوان، ڈاکٹر اسداللہ خان، پرنسپل ڈاکٹر اقبال تمبولی، ماہنامہ گل بوٹے کے ایڈیٹر فاروق سید، جے این یو نئی دہلی کے ڈاکٹر شفیع ایوب، گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سربراہ ڈاکٹر ساجد حسین، بال بھارتی پونے کے اسپیشل آفیسر برائے اردو خان نوید الحق، مصنفہ سیدہ نوشاد بیگم، عدنان سرکھوت، بزم غالب کے صدر بشیر پرواز موجود تھے۔

ڈاکٹر ساجد حسین انصاری، خان نوید الحق، سیدہ نوشاد بیگم، عدنان سرکھوت، بشیر پرویز اور دیگر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی خوبصورت نظامت ڈاکٹر غوث احمد شیخ نے کی جب کہ ڈاکٹر زین الدین ملا نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: اقبال باغبان، مہاراشٹر، 15 مارچ 2022

اعزاز و اکرام

پروفیسر رام درش مشر کو سرسوتی سمان 2021

نئی دہلی: ہندی کے مشہور شاعر اور ادیب پروفیسر رام درش مشر کو سال 2021 کے سرسوتی سمان کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ کے کے برلا فاؤنڈیشن نئی دہلی سے جاری ایک پریس ریلیز کے مطابق پروفیسر رام درش مشر کو ان کے شعری مجموعے 'میں تو یہاں ہوں' کے لیے یہ ایوارڈ دیا گیا ہے۔ اس ایوارڈ کے تحت 15 لاکھ کی رقم، توصیفی سند اور مومنٹو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تمام ہندوستانی زبانوں میں اعلیٰ ادبی خدمات کے اعتراف میں دیا جاتا ہے۔ اب تک مختلف زبانوں کے ادیبوں کو اس ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے۔ اردو میں نیر مسعود اور شمس الرحمٰن فاروقی کو یہ ایوارڈ پہلے ہی مل چکا ہے۔

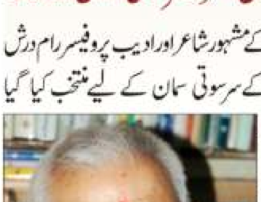

پروفیسر رام درش مشر کا تعلق گورکھپور کے ڈُمری گاؤں سے ہے۔ ان کا جنم 15 اگست 1924 کو ہوا۔ ہندی زبان وادب میں ان کی خدمات بہت اہم ہیں۔ دلی یونیورسٹی کے ہندی شعبے سے ان کی وابستگی رہی ہے اور وہیں سے وہ پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ اب تک تقریباً ان کے 32 شعری مجموعے، 15 ناول، کہانیوں کے 30 مجموعے اور 15 تنقیدی کتابیں

شائع ہوچکی ہیں۔ ایوارڈ یافتہ کتاب 'میں تو یہاں ہوں' 2015 میں شائع ہوئی تھی، جسے 2021 کے سرسوتی سمان کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ 98 سالہ مشر جی کی تخلیقات میں گاؤں کی روح بسی ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں گاؤں کی زندگی کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی ہے۔ شہر میں رہتے ہوئے بھی وہ دیہی دنیا سے جڑے ہوئے تخلیق کار ہیں۔ ان کی تخلیقات کی زبان سادہ اور سہل ہے۔ ان کا تخلیقی سفر آج بھی جاری ہے۔

پریس ریلیز: کے کے برلا فاؤنڈیشن، 4 اپریل 2022

ساہتیہ اکادمی کی سالانہ تقریب تقسیم ایوارڈ 2021

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کا سالانہ جلسہ تقسیم ایوارڈ 11 مارچ کو کمانی آڈیٹوریم میں شام پانچ بجے منعقد ہوا جس کی صدارت اکادمی کے چیئرمین پروفیسر چندر شیکھر

کمبار نے کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر مراٹھی کے ممتاز شاعر، ادیب ونقاد جناب بھال چندر نیماڈے نے شرکت کی۔ جناب نیماڈے نے اس موقعے پر کہا کہ ہندوستان کثرت میں وحدت کی مثال ہے اور یہ ملک کی مختلف تہذیب وثقافت، کھان پان، زبان اور کردار وغیرہ میں محسوس کرسکتے ہیں۔ تقریب کے آغاز میں اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے شری نواس راؤ نے اپنی تفصیلی خیرمقدمی تقریر میں اکادمی کی کارکردگیوں کو پیش کیا اور انعام یافتگان کو اکادمی کے جملہ اراکین کی طرف سے مبارکباد پیش کی۔ اکادمی کے چیئرمین پروفیسر چندر شیکھر کمبار نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ آزادی کے دوران ہندوستان کے دیہی علاقوں میں جو لوک ادب ہم نے رچا اس نے ہمارے عوام کو ابھی تک متاثر کیا ہوا ہے۔ انھوں نے کورونا وبا کے دوران بھی ساہتیہ اکادمی کو متواتر محرک رکھنے کے لیے کیے گئے کاموں کی پذیرائی کی۔ اکادمی کے وائس چیئرمین جناب مادھو کوشک نے اظہار تشکر پیش کیا اور کہا کہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ میں آپ ایک چھوٹے ہندوستان کو محسوس کرسکتے ہیں جس میں ہندوستان کے کونے کونے سے 24 زبانوں کے ادیبوں کو انعام سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ انعام یافتگان میں انورادھا شرما پجاری (آسامی)، براتیہ بسو (بنگالی)، موودائے گاہائے (بوڈو)، راج راہی (ڈوگری)، یلیش دوے (گجراتی)، دیاپرکاش سنہا (ہندی)، ولی محمد اسیر کشتواڑی (کشمیری)، سنجیو ویرینکار (کونکنی)، جگدیش پرساد منڈل (میتھلی)، جراح اونکو (ملیالم)، تھاک چام اپابھی سنگھ (منی پوری)، کرن گورو (مراٹھی)، چھوی لال اپادھیائے (نیپالی)، ہرشی کیش ملک (اڑیہ)، خالد حسین (پنجابی)، میٹھیس نرموہی (راجستھانی)، وندھیشوری پرساد مشر 'ونے' (سنسکرت)، ارجن چاؤلہ (سندھی)، امبئی (تامل)، مورٹی ونکنا (تیلگو) اور چندر بھان خیال (اردو) شامل تھے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 12 مارچ 2022

تقریب تقسیم اعزازات

بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکادمی، سنسکرتی پریشد، محکمہ ثقافت کے زیراہتمام 'تقریب اعزازات' کا انعقاد وزیر ثقافت اوشا ٹھاکر کی خصوصی موجودگی، سابق ایم پی آلوک سنجر کی صدارت اور ادیتی کمار ترپاٹھی: ڈائرکٹر سنسکرتی کی باوقار موجودگی میں اسٹیٹ میوزیم، شیاملہ ہلز، بھوپال میں ہوا۔ پروگرام کی مہمان خصوصی وزیر ثقافت اوشا ٹھاکر نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ اردو زبان ایک تہذیب یافتہ زبان ہے اور اس نے لفظوں کے وقار کو بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ پروگرام کے صدر اور سابق رکن پارلیمنٹ آلوک سنجر نے کہا کہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے ان تخلیق کاروں کی صلاحیتوں کو پہچانا اور انھیں اعزازات سے نوازا۔ تقریب اعزازات کے مہمان ذی وقار اور ڈائرکٹر سنسکرتی ادیتی کمار ترپاٹھی نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے جو بھی مشورے ملیں گے اردو اکادمی اور محکمہ ثقافت کی کوشش رہے گی کہ ان مشوروں پر عمل کیا جائے۔ تقریب اعزازات کی شروعات میں اکادمی کی ڈائرکٹر ڈاکٹر نصرت مہدی نے تمام مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ اس سال اردو اکادمی کے ذریعے چھ تخلیق کاروں کو ان کی کتب پر کل ہند اعزازات اور بارہ تخلیق کاروں کو صوبائی اعزازات سے نوازا جارہا ہے۔ اس سال سبھی اعزازات مدھیہ پردیش کے تخلیق کاروں کو ہی دیے جارہے ہیں۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے ذریعے جن 6 شخصیات کی تخلیقات پر کل ہند اعزازات دیے گئے ان میں ممتاز ادیب ومحقق ڈاکٹر مہتاب عالم کی کتاب تہذیب پر ابراہیم یوسف اعزاز، وفا صدیقی کی کتاب نقش تابندہ کے لیے میر تقی میر اعزاز، ڈاکٹر سیفی سرونجی کو سہ ماہی انتساب کی خدمات کے لیے حکیم قمرالحسن اعزاز، ڈاکٹر خالد محمود کی کتاب نقوش معنی کو جوہر قریشی، ڈاکٹر محمد نعمان خاں کی کتاب 'فلسفہ حیات' کو شاداں ندوی اعزاز اور ڈاکٹر عشرت ناہید اجین کی کتاب منزل بے نشاں کو حامد سعید خاں قومی اعزاز شامل ہیں۔ وہیں کوثر صدیقی کی قرطاس قلم کو ندا فاضلی اعزاز، قاسم رسا کی کتاب 'جستہ جستہ' کو سراج میر خاں سحر اعزاز، ڈاکٹر رضیہ حامد کی کتاب 'فہم و ادراک' کو سورج کلا سہائے اعزاز، ضیا فاروقی کی کتاب 'حسینہ منزل' کو نواب شاہجہاں بیگم اعزاز، کے کے راجپوت کمل کی کتاب 'رقص بسمل' کو شمبھو دیال سخن اعزاز، اقبال مسعود کی کتاب 'نعیم کوثر افسانوی کائنات' کو شعری بھوپالی اعزاز، ڈاکٹر محمود شیخ کی کتاب 'امیجری کا زوال' کو محمد علی تاج اعزاز، نفیسہ سلطانہ انا کی کتاب عکس خیال کو باسط بھوپالی اعزاز، کاروان ادب کے مدیر جاوید یزدانی کو نواب صدیق حسن خان اعزاز، صبیحہ صدف کی کتاب 'اردو قواعد و مضامین' کو جاں نثار اختر اعزاز، ڈاکٹر عارف انصاری کی کتاب 'پس پردہ' کو پنالال سریواستو نور اعزاز اور کوثر فرزانہ کو کیف بھوپالی صوبائی اعزاز سے سرفراز کر کے کیا گیا۔ تقریب اعزازات کی نظامت کے فرائض بدر واسطی اور سانیسا ہر نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر نصرت مہدی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 مارچ 2022

بزم صدف انٹرنیشنل ایوارڈ تقریب

حیدرآباد: 27 مارچ (یواین آئی) وزیر داخلہ تلنگانہ محمد محمود علی نے کہا کہ اردو مرنے والی زبان نہیں ہے بلکہ

ہمیشہ زندہ رہے گی۔ انہوں نے یہ بات بزم صدف انٹرنیشنل کی جانب سے ایوارڈ برائے 2019-20-21 اور جشن اردو صحافت دوصدی تقاریب کے پہلے دن منعقدہ تقریب سے بہ حیثیت مہمان خصوصی خطاب کرتے

ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کے لیے تعلیم ضروری ہے، کیونکہ علم سے پسماندگی دور ہوتی ہے۔ اگرچہ کہ ہم کو تمام زبانیں سیکھنی چاہیے لیکن اردو کو نہیں بھولنا چاہیے کیونکہ یہ ایک شیریں زبان ہے۔

اس موقعے پر وزیر داخلہ کے ہاتھوں ایوارڈز کی پیشکشی عمل میں آئی۔ بزمِ صدف انٹرنیشنل ایوارڈ 2019 پروفیسر مظفر حنفی کو دیا گیا (جوان کے بیٹے انجینئر فیروز مظفر کو پیش کیا گیا) 2020 کے لیے معروف ناول نگار پروفیسر غضنفر کو بین الاقوامی ایوارڈ پیش کیا گیا۔ بزمِ صدف نئی نسل ایوارڈ 2020 کے لیے پروفیسر ابوبکر عباد کو پیش کیا گیا۔ اردو زبان کی عمومی خدمات کے لیے محمد صبیح بخاری ایوارڈ برائے اردو تحریک (2019) پروفیسر محمد محمود الاسلام (بنگلہ دیش) کو دیا گیا۔ مشہور ناقد اور صاحب طرز ادیب حقانی القاسمی کو ضیاء الدین احمد شاہد جمال برائے ادبی صحافت 2021 دیا گیا۔ ڈاکٹر راہی فدائی (بنگلور) کو پروفیسر ناز قادری ایوارڈ برائے نعت گوئی، سہیل انجم (دہلی) کو اشرف قادری ایوارڈ بھی پیش کیا گیا۔ وزیر داخلہ نے کتابوں کی رسم اجرا بھی انجام دی۔

شہاب الدین احمد چیرمین بزمِ صدف انٹرنیشنل نے کہا کہ بزم کی سرگرمیاں 12 ممالک میں جاری ہیں۔ ساتھ ہی ہندوستان کی بیشتر ریاستوں میں اس کی مختلف کمیٹیاں کام کر رہی ہیں جو اردو اور مادری زبان سے محبت کرنے والوں کی کامیابی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بزم نے اردو ادب کے لیے حقیقی طور پر کام کرنے والوں کی نشاندہی کا کام بھی کیا گیا ہے۔ بزم سال بھر مشن کی طرز پر کام کرتی ہے، اس کے ہر رکن کا اس مشن میں برابری کا حصہ ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جس کو ماں سے محبت ہوگی اس کو اردو سے یقیناً محبت ہوگی اور اس بزم کا مشن بڑھتا ہی رہے گا۔

ڈائرکٹر بزمِ صدف انٹرنیشنل پروفیسر صفدر امام قادری نے بزم کا تعارف اور ایوارڈس کی تفصیلات سے واقف کرواتے ہوئے کہا کہ بزم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کی یہ تقریب اردو کے پہلے شہر حیدرآباد میں منعقد کی جارہی ہے۔

پروفیسر غضنفر علی نے کہا کہ اس تنظیم کی جانب سے ایسی شخصیات کا ایوارڈ کے لیے انتخاب کیا جاتا ہے جو واقعی انعام کے اہل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس ایوارڈ تقریب کے لیے شہر صدف کا انتخاب کیا گیا جو ساری دنیا میں گہوارہ گوہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسر ابوبکر عباد نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بزم میں شامل افراد کا اردو سے پیشہ وارانہ تعلق نہیں ہے کیونکہ اس میں شامل کوئی سائنسداں ہے، کوئی ڈاکٹر ہے تو کوئی تاجر ہے لیکن تمام کا مشترکہ جنون اردو ہے۔ پروفیسر محمود الاسلام پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی نے کہا کہ اردو کے پہلے گھر حیدرآباد سے اردو پڑھنے، پڑھانے اور تحقیق کا جذبہ ملا۔ انھوں نے اردو کے اپنے سفر کی تفصیلات سے واقف کروایا۔ مسعود حساس (کویت) نے کہا کہ ہموار راستوں پر چلنا تو سب کو آتا ہے لیکن خاردار پگڈنڈیوں پر چل کر منزل پر پہنچنے کا کام بزم صدف نے کیا ہے جو بہترین کام ہے۔

روزنامہ تاثیر کے چیف ایڈیٹر محمد گوہر نے کہا کہ اردو کو گھر گھر پہنچانے کی کوشش کی جارہی ہے جو قابل ستائش قدم ہے۔ جناب عظیم عباس نے کہا کہ حیدرآباد شہر سے اردو مشاعرے، سمینار کبھی جدا نہیں ہوسکتے۔ اردو کے حوالے سے کوششوں میں قطر کو ایک مضبوط مرکز بنایا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کئی غیر مسلم اصحاب بھی اردو کے سفر سے جڑے ہیں جو ایک اچھی بات ہے۔ قطر میں گنگا جمنی تہذیب کا ماحول بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ انہوں نے دعوی کیا کہ اردو قطر میں محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

ڈاکٹر ندیم ظفر گیلانی نے صدارتی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو والوں کی ہمت افزائی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں بزم کا تجربہ کامیاب رہا ہے۔ انھوں نے بیرونی ممالک میں اردو کو فارین لینگویج کے طور پر پڑھانے کی وکالت کی۔ انھوں نے کہا کہ بزم کی جانب سے آن لائن اردو کلاسز کا کامیاب تجربہ کیا گیا اور دیگر ممالک میں بھی اردو تناور درخت کی شکل اختیار کر رہی ہے۔ انھوں نے اردو میں بچوں کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے تصاویر کے ساتھ کہانیوں کی کتابوں کی سفارش کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو ہمیں بچانا ہے تو اردو پڑھانے کی ضرورت ہے۔ حقانی القاسمی، سہیل انجم، راہی فدائی نے بھی خطاب کیا۔ محترمہ رفعت جہاں نے شکریہ ادا کیا۔

بحوالہ: یو این آئی وخ، 27 مارچ 2022

ممتاز شخصیات کو ایوارڈ

دیوبند: سماجی تنظیم 'نظر فاؤنڈیشن' کی جانب سے جامعہ اشرفیہ دارالعلوم کے تعاون سے ایک اعزازی تقریب منعقد کی گئی۔ اس اعزازی تقریب کی صدارت مولانا قاری ابوالحسن نے کی جبکہ نظامت کے فرائض جامعہ اشرفیہ دارالعلوم کے مہتمم مولانا سالم اشرف اور تنظیم کے چیئرمین انجم عثمانی نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر معروف مصنف و تاریخ داں ڈاکٹر عبید اقبال عاصم نے شرکت کی جبکہ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے نعیمیہ بک ڈپو کے مالک محمد انس صدیقی موجود رہے۔ تنظیم عثمانی نے تنظیم کا تعارف، مقاصد اور پروگرام کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تنظیم کا مقصد غریب اور ضرورت مند طالب علموں کی تعلیمی ضروریات میں مدد کرنا اور ایسے افراد کی حوصلہ افزائی کرنا ہے جو خدمت خلق کے لیے مختلف زاویوں سے نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اعزازی تقریب کے معاون و کنوینر اور جامعہ اشرفیہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا سالم اشرف نے کہا کہ نظر فاؤنڈیشن اور نظر اکیڈمی کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ غریب و بے سہارا نیز یتیم و مسکین طالب علموں کو تعلیمی حصول میں مدد اور آگے بڑھنے کا سہارا و حوصلہ بخشا جائے۔ اعزازی تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر عبید اقبال عاصم نے کہا کہ میرے لیے یہ انتہائی فخر کی بات ہے کہ جس مقصد کے تحت مجھے یہاں بلایا گیا ہے وہ مقصد بہت اعلیٰ اور انسانیت کو نفع پہنچانے والا ہے۔ کتب خانہ کے چیئرمین محمد انس صدیقی نے نظر فاؤنڈیشن کے ذمہ داران و کارکنان کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ تنظیم کے کاموں سے وہ بے حد متاثر ہیں۔ اس دوران پروگرام میں شریک ممتاز شخصیات کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں نمایاں خدمات کے صلے میں ڈاکٹر عبید اقبال عاصم کو 'شان ادب و صحافت ایوارڈ' مولانا سالم اشرف قاسمی کو وقار تدریس و خطاب ایوارڈ، اشاعت علم کے لیے زریں خدمات انجام دینے کے صلے میں محمد انس صدیقی کو 'اشاعت علم ایوارڈ 2022' ٹیکنیکل ایجوکیشن کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرنے والے سید محمد نجم کو 'سماجی و ٹیکنیکل ایجوکیشن ایوارڈ' اور سماجی و قانونی خدمات کے لیے محمد معین صدیقی ایڈووکیٹ کو 'سماجی و قانونی تعلیم ایوارڈ' سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 مارچ 2022

ممتاز احمد

دیوبند: جرنلسٹ یونین آف انڈیا کے ذریعے سہارنپور میں واقع اگروال دھرم شالہ میں ہولی ملن پروگرام اور اعزازی تقریب کا انعقاد کیا گیا، جس میں ضلع کے متعدد صحافیوں کو ان کی صحافتی خدمات کے لیے اعزازات سے نوازا گیا۔ پروگرام کے دوران دیوبند کے سینئر صحافی ممتاز احمد کو ان کی طویل صحافتی خدمات کے اعتراف میں 'گنیش شنکر ودیارتھی' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ تقریب کے دوران جرنلسٹ یونین آف انڈیا کے قومی صدر اشوک شرما اور

خازن انجم صدیقی کے ذریعے ممتاز احمد کو شال، مومنٹو اور سپاس نامہ دے کر عزت افزائی کی گئی۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 22 مارچ 2022

تقسیم انعام واعزاز

جلگاؤں: انعام انعام ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت مسلم ہوتی ہے۔ جب یہ مستحق ہاتھوں میں پہنچتا ہے تو معتبر ہو

جاتا ہے۔ ان زریں خیالات کا اظہار بزم اردو ادب جلگاؤں کے زیر اہتمام منعقدہ جلسہ تقسیم انعام و اعزاز میں معروف شاعر، ادیب، صحافی و محقق شمیم طارق نے اپنے کلیدی خطبے میں کیا۔ جلسے کے محرک عبدالکریم سالار نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ جب تک ہم اپنے قلمکاروں کی حوصلہ افزائی و پذیرائی نہیں کریں گے ان کی قلمی تحریک کو جلانہیں ملے گی۔ قبل ازیں عبدالعزیز سالار، مشتاق سالار، معین الدین عثمانی، رشید قاسمی اور آصف پٹھان نے مہمانان کی گلپوشی کی۔ اس موقعے پر سال 2021 کے لیے علامہ اقبال، میر تقی میر، پریم چند اور میر اصغر جامعی ایوارڈ بالترتیب عزمی عادل آبادی، شوق جلگانوی، قاضی مشتاق احمد اور مشتاق کریمی کو تفویض کیے گئے۔ یہ ایوارڈ نقد 11 ہزار روپے کیسہ زر، یادگار اور سپاس نامے پر مشتمل تھے۔

پریس ریلیز: مشتاق کریمی، مہاراشٹر، 13 مارچ 2022

پروفیسر ولی اختر ندوی ایوارڈ

نئی دهلی: عالمی تخلیقی تنظیم برائے امن (لندن) کے ہندوستان میں موجود دفاتر کے صدر کی طرف سے پروفیسر ولی اختر ندوی مرحوم سے موسوم سالانہ ایوارڈ شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی کے اشتراک سے فیکلٹی آف آرٹس کے کمرہ 22 سمینار ہال میں 'پروفیسر ولی اختر ندوی شخصیت اور کارنامے' پر منعقد دو روزہ قومی سمینار میں بی اے اور ایم کے ٹاپر طلبہ کو دیا گیا۔ شعبہ عربی ذاکر حسین دلی کالج (دلی یونیورسٹی) کے بی اے کے طالب علم مصباح الاسلام اور ایم اے کے طالب علم عبدالرحیم خان کو یہ ایوارڈ دیا گیا، ایوارڈ میں پانچ ہزار روپے نقد، مومنٹو اور توصیفی سند شامل ہے۔ واضح رہے کہ تنظیم کی بانی وصدر ڈاکٹر وفا عبدالرزاق اور ہندوستان میں موجود تنظیم کے دفاتر کے صدر پروفیسر مجیب الرحمٰن نے یہ اعلان کیا تھا کہ پروفیسر ولی اختر ندوی سے موسوم سالانہ ایوارڈ ہر سال بی اے اور ایم اے کے ٹاپر طلبہ کو دیا جائے گا۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 30 مارچ 2022

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر

دیوبند: دارالعلوم وقف کے استاذ اور معروف ادیب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کو علامہ حبیب الرحمٰن خان شیروانی میموریل سوسائٹی لکھنؤ کی جانب سے 'ملک زادہ منظور ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔ مولانا محمد عالم ندوی کی کتب 'اجلے دھندلے نقوش' کی رسم اجرا کے موقعے پر پروفیسر محسن عثمانی ندوی اور آکسفورڈ لندن سے تشریف لائے ڈاکٹر محمد اکرم ندوی کے ہاتھوں ایوارڈ دیا گیا۔ منعقدہ پروگرام سے ممتاز انٹر کالج ڈالی گنج لکھنؤ میں منعقدہ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر محسن عثمانی نے کہا کہ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر دیگر موضوعات اور عنوانات پر لکھنے کے ساتھ ساتھ خاکہ نگاری میں بھی اپنی ایک خاص شناخت اور پہچان رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اکرم ندوی نے کہا کہ میں نے مولانا کی خاکہ نگاری کی کوئی کتاب نہیں پڑھی لیکن اپنے حلقے کے لوگوں سے ان کی خاکہ نگاری کی خوبیوں اور خاصیتوں کے بارے میں کافی کچھ سنا ہے۔ جس کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ملک زادہ منظور ایوارڈ ان کے کاموں اور خدمات کا بہترین اظہار ہے۔ پروگرام کے کنوینر مولانا فیروز خان ندوی نے کہا کہ میں نے مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کی کتابیں پڑھیں، بہت اچھی لگیں، خاکہ نگاری کا لطف آگیا، زبان اور روانی اور آمد کا بہترین نمونہ پایا۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 30 مارچ 2022

ڈاکٹر منصور حسن خاں

لکھنؤ: سینٹ روز پبلک اسکول، گڑھی پیر خاں، ٹھاکر گنج، میں ایک تہنیتی جلسہ اسکول کی پرنسپل مسز نغمہ پروین کی صدارت میں منعقد ہوا جس کی نظامت اسسٹنٹ ڈائرکٹر نغمہ صبا نے کی۔ اس موقعے پر اسکول کی ٹیچرس اور طلبہ و طالبات کی طرف سے اسکول کے منیجر ڈاکٹر منصور حسن خاں کو ان کی بیش بہا ادبی، ملی وسماجی خدمات کے اعتراف میں 'تاباں شفیقی ایوارڈ 2022' ملنے پر اظہار مسرت کے بعد مشترکہ طور پر گلپوشی کے بعد شال اوڑھا کر اعزاز کیا گیا۔ واضح رہے کہ یہ ایوارڈ پنڈت ہنومان پرساد عاجز ماتوی اکادمی (بارہ بنکی) کے زیر اہتمام معروف شاعر مولانا اسرار وارثی کی یادوں کے نام ایک شام کے تحت ہونے والے مشاعرے میں دیا گیا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 26 مارچ 2022

نور نگر اسکول کی 33 طالبات انعامات سے سرفراز

نئی دهلی: اردو اکادمی کے تعلیمی مقابلوں میں نور نگر میں واقع اسکول 'ایس کے وی' کی طالبات نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ نور نگر اسکول کی طالبات کی شاندار کامیابی کا اندازہ اس سے بخوبی ہوجاتا ہے کہ مختلف طرح کے 33 انعامات انھوں نے حاصل کیے ہیں۔ طالبات نے کہا کہ ان کی اس کامیابی میں اسکول کی پرنسپل مدثر جہاں کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کا بے حد اہم رول ہے۔ وہ ان کا حوصلہ اس بات کے لیے بڑھاتی رہتی ہیں کہ مقابلوں کو جیتنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں۔ دہلی اردو اکادمی کے تقسیم انعامات کا جو پروگرام ایوان غالب میں منعقد کیا گیا تھا، اس میں نور نگر اسکول 'ایس کے وی' کی طالبات کا جلوہ رہا۔ انھوں نے ڈراما، بیت بازی میں مشترکہ انعام حاصل کیے، وہیں خوش خطی، مضمون نویسی، تقریر اور پینٹنگ میں بھی انفرادی انعام حاصل کیے۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 13 مارچ 2022

اجرا

خوابوں کا اک جزیرہ

آرہ: آرہ شہر کی ثقافتی و ادبی تنظیم ادارہ تزئین ادب کے زیر اہتمام معروف شاعر سرفراز اشہر کا شعری مجموعہ 'خوابوں کا اک جزیرہ' کے اجرا کی تقریب احمد کدہ ملکی محلہ آرہ میں منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت معروف شاعر شوکت صبا کیفی اور قربان آتش نے مشترکہ طور پر کی۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے الہ آباد سے تشریف لائے طنز و مزاح کے مشہور شاعر مجاہد لائبین الہ آبادی اور بزم کیف کے جنرل سکریٹری قسیم سہرامی نے بزم کو رونق بخشی۔ نظامت پٹنہ سے تشریف لائے معروف افسانہ نگار ڈاکٹر قیصر زاہدی نے کی۔ اس کے بعد معتمد ادارہ امتیاز احمد دانش نے شہر آرہ کی ادبی تاریخ اور ادارے کی کارکردگی کا مختصر جائزہ پیش کیا۔ تقریب میں تشریف لائے تمام احباب کی گل پوشی کی گئی اور سرفراز اشہر کی عزت افزائی کرتے ہوئے انھیں ایک اونی شال پیش کی گئی۔ دوسری جانب پرنسپل اعزاز احمد نے بھی مبارکباد پیش کرتے ہوئے انھیں شال سے نوازا۔ اس موقعے پر ایک شاندار مشاعرے کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں مقامی اور مختلف مقامات سے تشریف لائے شاعروں نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 23 مارچ 2022

طلعت جہاں، تبسم ناڈکر اور آفتاب اجمیری کی کتابوں کا اجرا

دیوبند: اداکار گروپ کے زیراہتمام انبالہ روڈ پر واقع راج محل کے ہال میں رسم اجرا کی ایک تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ صدارت براؤن ووڈ پبلک اسکول کی ڈائرکٹر صبوحی افتخار نے اور اسٹیج سکریٹری کے فرائض اداکار گروپ کے روح رواں جاوید خان سروہا نے انجام دیے۔ تقریب میں دردصحرا، کاوش طلعت، روح تبسم، عکس تبسم اور کرنیں آفتاب کی کتابوں کا اجرا ہوا۔ دردصحرا اور کاوش طلعت سہارنپور کی علمی شخصیت مرحوم مسرور خان سروہا کی بیٹی طلعت جہاں سروہا کی تحریر کردہ ہے، جب کہ روح تبسم اور عکس تبسم مہاراشٹر ممبئی کی خاتون شاعرہ سیدہ تبسم ناڈکر کے شعری مجموعے ہیں، کرنیں آفتاب کی مہاراشٹر ممبئی کے معروف شاعر آفتاب اجمیری کی تخلیق ہے۔ کتابوں کا اجرا صوفی چاند صابری قادری اور دیگر مہمانان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اداکار گروپ کی جانب سے تینوں شعرا کو سپاسنامہ، شال اور ٹرافی دے کر اعزاز سے نوازا گیا۔ اداکار گروپ کے صدر معروف ڈرامہ نگار اور ہدایت کار جاوید خان سروہا نے نظامت کرتے ہوئے سہارنپور کے ادبی منظرنامے پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے مولانا غریب اور مرزا عزیز بیگ وغیرہ کے اردو ادب کے لیے کیے گئے کاموں کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ شاعر دانش کمال نے بھی سہارنپور کے ہندو مسلم شعرا کا ذکر کرتے ہوئے ان کا منتخب کلام سنایا۔ اسلامیہ انٹرکالج کے سابق پرنسپل جلال عمر نے اپنے صدارتی خطاب میں تینوں شعرا کو ان کی کتابوں کے اجرا پر مبارکباد دی۔ سابق پرنسپل منالال ڈگری کالج ڈاکٹر نیلا نجنا کشور نے کہا کہ اردو محبت کی زبان ہے۔ جب کوئی اردو میں بات کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہر لفظ دل پر اثر کر رہا ہو۔ دہلی سے چشمہ فاروقی، نسیم بیگم، عزیزہ مرزا، پنجاب سے طارق فاروقی، راؤ ریحان خان ذاکر حسن، راؤ محبوب علی آصف شمسی، کمل دیوبندی، رما وششٹ، شکیل احمد طارق فاروقی، ذاکر حسین وغیرہ موجود تھے۔ اس موقعے پر ساز و آواز کی محفل میں دل بہار ملک، سنجیو جھنگرن، ششی کانت تیاگی اور شاہنواز صابری نے شاعرہ اور افسانہ نگار طلعت جہاں، تبسم ناڈکر اور آفتاب اجمیری کی غزلیں اپنی خوبصورت آواز میں پیش کرکے داد و تحسین پائی، مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے صبوحی افتخار نے صاحب کلام شاعرات اور شاعر کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اس طرح کی محفلیں ہمارے لیے روح کی تسکین کا سامان ہوتی ہیں۔ اداکار گروپ کے سکریٹری وکرانت جین نے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 24 مارچ 2022

اجلے دھندلے نقوش

سلطانپور: مہاراشٹر کالج ممبئی سے سبک دوش پروفیسر عالم ندوی کی خاکوں پر مشتمل کتاب 'اجلے دھندلے نقوش' کی رسم اجرا حنیف نگر میں اقبال ویلفیئر اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی کی طرف سے منعقدہ ایک پروگرام میں کرناٹکا سے تشریف لائے جماعت اسلامی ہند کے رکن احمد ایاز کے بدست ہوئی۔ مولانا عالم ندوی کا تعارف کراتے ہوئے عامل صدیقی نے بتایا کہ مولانا نے یہیں سلطانپور جامع اسلامیہ سے حصول تعلیم کی ابتدا کرتے ہوئے ندوۃ العلما لکھنؤ پھر لکھنؤ یونیورسٹی اور بعد میں گنپت سہائے پی جی کالج سلطانپور سے تعلیم حاصل کی اور بعد میں ممبئی کالج مہاراشٹر میں اردو لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کا آغاز کرتے ہوئے پروفیسر تک کا سفر طے کیا۔ مولانا کے خاکوں کے مجموعے 'اجلے دھندلے نقوش' کے شائع ہونے سے پہلے ادبی و دینی موضوعات پر تین کتابیں بھی منظرعام پر آچکی ہیں نیز شعری مجموعہ بھی زیر طبع ہے۔ 'اجلے دھندلے نقوش' نو خاکوں پر مشتمل ایک کتاب ہے جس میں مولانا نے اپنے والد گرامی کا عکس بھی نہایت سعادت مندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 14 مارچ 2022

غیاث احمد گدی: تخلیقی سیاق وسباق

نئی دھلی: اصغر راز فاطمی کا خلوص اور ان کی محبت غیر مشکوک ہے۔ وہ اعلیٰ قدروں کے حامل ہیں۔ انھوں نے غیاث احمد گدی کے حوالے سے جس قدر محنت اور یکسوئی کے ساتھ یہ تحقیقی اور تنقیدی کتاب لکھی ہے، اس کو یقیناً گدی شناسی میں حوالے کا درجہ حاصل ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار فورم فار انٹلکچول ڈسکورس کے زیر اہتمام ای-57، جماعت اسلامی ابوالفضل انکلیو یونٹ میں اصغر راز فاطمی کی کتاب 'غیاث احمد گدی: تخلیقی سیاق وسباق' کی رسم اجرا میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر خالد محمود نے کیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ اصغر راز فاطمی کا ادبی شعور اور علمی انہماک لائق تحسین ہے۔ مہمان اعزازی حقانی القاسمی نے مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ایک حاشیائی علاقے سے تعلق رکھنے والے ادیب اصغر راز فاطمی نے ایک حاشیائی برادری کے فکشن نگار کو اپنی تحقیق و تنقید کا موضوع بنایا، ان کا یہ کارنامہ قابل قدر ہے۔ مذاکرے کے ناظم ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ سنہ اشاعت سے قطع نظر اس کتاب کا سنہ تصنیف اس کو گدی شناسی کی تاریخ میں اولیت کا درجہ بخشتا ہے۔ استقبالیہ کلمات میں ڈاکٹر نعمان قیصر نے کہا کہ اصغر راز فاطمی کی بے نیاز طبیعت نے ان کی ادبی شناخت کو متاثر کیا ہے۔ فورم فار انٹلکچول ڈسکورس کے جنرل سکریٹری منظر امام نے کہا کہ مصنف نے جس طرح گدی اور ان کی تخلیق کو پیش کیا ہے اس سے ہمیں فکشن کی سماجی اور سیاسی وابستگیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ماہنامہ یوجنا کے مدیر عبدالمنان نے کہا کہ گدی شناسی سے متعلق یہ پانچویں کتاب ہے لیکن ماقبل چاروں کتابوں پر بھاری ہے۔ اگنو کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر احمد علی جوہر نے کہا کہ غیاث احمد گدی کے فکشن کی تفہیم میں اصغر راز فاطمی کی یہ کتاب نہایت معاون ثابت ہوگی۔ محکمۂ تعلیم حکومت دہلی سے وابستہ ڈاکٹر فیضان شاہد نے کہا کہ اصغر راز فاطمی کی زبان ایک تحقیقی و تنقیدی زبان ہے اور وہ ژولیدگی سے پاک ہے۔ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی نے کہا کہ اصغر راز فاطمی نے غیاث احمد گدی کی شخصیت اور سوانح کو جس جزرسی اور دقت نظر کے ساتھ ترتیب دیا ہے وہ تحقیق کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ مشہور ویب سائٹ 'ادبی میراث' کے بانی مدیر ڈاکٹر نوشاد منظر نے کہا کہ صاحب کتاب نے غیاث احمد گدی کے فکشن کا محاکمہ

تمام معروف تحقیقی و تنقیدی اصولوں کے پیش نظر کیا ہے۔ این سی ای آر ٹی سے وابستہ ڈاکٹر امتیاز احمد علیمی نے مصنف کی پذیرائی کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے گدی کے تخلیقی سیاق کو سمجھنے کے لیے ان کی شخصیت اور زندگی کو بجا طور پر پیش نظر رکھا ہے۔ حاضرین میں ڈاکٹر جاوید

حسن، ڈاکٹر زاہد ندیم احسن، ڈاکٹر واثق الخیر، سفیر صدیقی، جمیل سرور اور ابوالاشبال وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر خالد مبشر، شعبۂ اردو، اسسٹنٹ پروفیسر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 11 مارچ 2022

سنسکرت اردو گرامر

مالیگاؤں: سیکھنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی، سنسکرت جیسی مشکل زبان پر 5 سال کڑی محنت کر کے حافظ جلال الدین قاسمی نے اس زبان پر اپنی حکومت قائم کی ہے۔ ان جملوں کا اظہار ماہر سنسکرت پنڈت کشور پرشو رام لیے نے، اسکس ہال میں منعقدہ، سنسکرت گرامر پر 'سنسکرت اردو گرامر' کی تقریب اجرا کے صدارتی خطاب میں کیا۔ آپ نے کہا کہ اردو جاننے والوں کے لیے ایک ایسا انتہائی حیرت انگیز اور اہم کام منظر عام پر آیا ہے، جس کے بارے میں وہم وگمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اس کتاب کا اندراج ہو یا نہ ہو، مگر یہ کام بھارتیوں کے دلوں میں ضرور اپنے نقوش چھوڑ جائے گا۔ قبل اس کے، لتا ڈھونڈے صاحبہ (ڈی وائے ایس پی مالیگاؤں) نے کہا کہ اللہ نے اپنے چنیدہ بندوں کو ایسے اچھے کاموں کے لیے منتخب کر رکھا ہے جن سے دنیا والوں کو خوب خوب فائدہ پہنچ سکے۔ محمد رضا نے اپنی گفتگو میں کہا کہ اس کتاب کو پڑھنے سے نہ صرف سنسکرت زبان سے آشنائی ہوگی بلکہ ہماری اردو زبان بھی کافی حد تک درست ہو جائے گی۔ معروف صحافی امتیاز خلیل نے کہا کہ اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے ادبی وعلمی دنیا میں شہر کا نام اور قد مزید اونچا ہوا ہے۔ محترمہ شلپا راہل دیشمکھ نے کہا کہ کوشش کرنے والوں کی کبھی ہار نہیں ہوتی کیونکہ مولانا حافظ جلال الدین قاسمی نے راہ کی رکاوٹوں کی پرواہ کیے بغیر یہ کام کیا ہے۔ پروفیسر کھیر نار نے بھی اس کام کو ایک عظیم اور نیک مقصد سے تعبیر کیا۔ جناب اویس انصاری (پونہ) نے سنسکرت کے اشلوک اور آیتوں کے ساتھ دعوتی اسلوب میں سامعین سے خطاب کیا۔ ابھے شاہ، پی کے شکلا ویدی، پی کے اجولا ویدی ودیگر نے بھی سنسکرت اردو گرامر نامی اس کتاب کے حوالے سے اپنے خیالات پیش کیے۔ صاحب کتاب حافظ جلال الدین قاسمی صاحب نے کتاب کی وجہ تالیف بیان کی اور کہا کہ زبانوں سے تہذیبوں کا ملن ہوتا ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کام سے ہندوستان کی دو بڑی قوموں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملے گا۔ اخیر میں حافظ جلال الدین قاسمی صاحب کی مزید دو کتابوں تدمیث الصرف اور تدمیث النحو کا اجرا بھی بالترتیب مولانا خیر اللہ سراجی اور جناب سہیل خان (وانی) کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: ربانی ڈی اسکالر، مہاراشٹر، 9 مارچ 2022

ٹوٹے سپنوں کا کرب

رامپور: ایسٹ پبلک اسکول شاہ بادگیٹ پر سابق چیئرمین فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش ڈاکٹر حسن احمد نظامی کی زیر سرپرستی سینئر افسانہ نگار ایس فضیلت کی تخلیق 'ٹوٹے سپنوں کا کرب' کی تقریب اجرا عمل میں آئی۔ ڈاکٹر محمود علی خاں صدر صولت پبلک لائبریری کے زیر صدارت منعقدہ تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے سابق ڈپٹی رجسٹرار جامعہ ملیہ اسلامیہ رضوان لطیف خان نے شرکت کی۔ تقریب کے دوران علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر فرحت اللہ خاں کو بعد از مرگ ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں 'رامپور رتن' ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ ایس فضیلت نے سپاس نامہ بھی پیش کیا۔ یہ ایوارڈ مرحوم کی صاحبزادی زیبا خان نے وصول کیا۔ تقریب رسم اجرا کے پہلے سیشن میں مشہور محقق ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس مجموعے میں شامل اگر تمام افسانوں کا تجزیہ کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ دوسرے دور کے پروگرام کی صدارت ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی نے کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر تنویر احمد وصیف سابق ضلع جج، مولانا زمان باقری، ڈاکٹر شگفتہ غزل، محمد زبیر شمسی، بابر خان موجود رہے۔ تعارفی خاکہ عائشہ انور نے پیش کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 مارچ 2022

افسانچہ اور افسانچہ نگار

میرٹھ: آج کے مشینی دور میں افسانچے کا مستقبل انتہائی تابناک ہے اور اب اسے صنف کا درجہ حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے مختلف اصناف کے ذریعے قاری کو متاثر ہی نہیں کیا بلکہ وہ ایک ایسے نور کی مانند ہیں جو آج کے تاریک ماحول میں چمک رہا ہے اور قاری کو صحیح راہ دکھا رہا ہے۔ یہ الفاظ تھے عالمی شہرت یافتہ ادیب عارف نقوی، جرمنی کے جو تحریک بقائے اردو، جموں کے ذریعے منعقد نئی نسل کے معروف فکشن ناقد اور افسانہ نگار ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی نئی کتاب 'افسانچہ اور افسانچہ نگار' کی رسم اجرا میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے اظہار خیال کے دوران ادا کر رہے تھے۔ اس سے قبل پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے استقبالیہ کلمات جاوید انور، بنارس اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر عرفان عارف نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی نے کہا کہ پروفیسر اسلم جمشید پوری کی کتاب 'افسانچہ اور افسانچہ نگار' سے یہ اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب افسانچہ نگاری کی تاریخ میں مددگار ثابت ہوگی۔ معروف ڈراما نگار اقبال نیازی نے کہا کہ آج کل سوشل میڈیا پر بحث ہو رہی ہے کہ افسانچہ کتنا طویل ہو۔ ہم افسانچوں کو سطروں میں کیوں قید کر رہے ہیں۔ آخر میں اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ بہت سے افسانچوں کے گروپ سوشل میڈیا پر چل رہے ہیں۔ ان گروپس میں بہت سے افسانچے بھی تحریر کیے جا رہے ہیں۔ پروگرام میں شہر کے معزز افراد شریک تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 مارچ 2022

خمسہ نظامی

نئی دھلی: اسلامی جمہوریہ ایران کے سفیر ڈاکٹر علی چگینی نے ہندوستان اور ایران کی تاریخی مماثلت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے برہمن اور ایران کے حکما ایک ساتھ مل جائیں تو بہت سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ ایران اور ہندوستان کے شعرا اور ادبا نے ایسا ثقافتی سرمایہ چھوڑا ہے جو پوری انسانیت کے درد کا علاج ہے۔ سفیر موصوف ایران کلچر ہاؤس میں انٹرنیشنل نور مائکرو فلم سینٹر، کلچر ہاؤس کے زیر اہتمام حکیم نظامی کے حوالے سے منعقدہ ثقافتی اور ادبی نمائش کو خطاب کر رہے تھے۔ ہندوستان اور ایران کے مابین قدیمی تمدنی وثقافتی روابط کو آشکار کرنے کے مقصد سے منعقد کی گئی نمائش میں ایران کے معروف شاعر حکیم نظامی کے نہایت قدیمی اور نفیس قلمی نسخہ 'خمسہ نظامی' کا اجرا عمل میں آیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 2022

پیکر انسانیت

نئی دھلی: قومی راجدھانی کے لودھی روڈ پر واقع انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے وسیع ہال میں ایک ثقافتی تقریب آراستہ کی گئی جس میں جاوید حسین اور ان کی ٹیم نے صوفیانہ کلام پیش کیا۔ اس دوران کاروان خلوص امروہہ کی کتاب 'پیکر انسانیت' بھی مہمانان کو پیش کی گئی۔ کاروان خلوص کے صدر محبوب حسین زیدی، نائب صدر پنڈت بھون شرما اور نواب مراد علی خاں نے جسٹس شیو کیرتی سنگھ اور جسٹس شبیہ الحسنین شاستری اور آئی اے ایس علی رضا رضوی ودیگر مہمان کو مذکورہ کتاب پیش کی۔ ڈاکٹر خلیل اللہ، پدم شری ڈاکٹر محسن ولی، پدم شری اختر الواسع، پروفیسر شاہد مہدی، پولس کمشنر اجے چودھری، پروفیسر نیر جلالپوری، سینئر آئی پی ایس آصف ابراہیم نے کتاب کی پذیرائی کی۔

اس دوران ڈاکٹر سبھاش چندر، ڈاکٹر زویا علی، جسٹس شبیہ الحسنین شاستری کو فخرِ ہند اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 مارچ 2022

تاریخ خیرآباد و تذکرہ علماء دانشوران

خیرآباد مئوناتھ بھنجن: مدرسہ منبع العلوم خیرآباد میں 'تاریخ خیرآباد و تذکرہ علماء دانشوران' کی تقریب اجرا کا انعقاد کیا گیا، جمعیۃ علماء اترپردیش کے صدر مولانا عبدالرب اعظمی، مشرقی زون اترپردیش کے صدر مولانا حافظ عبدالحی مفتاحی اور ڈاکٹر الیاس اعظمی و دیگر علمائے کرام کے بدست اجرا عمل میں آیا۔ اس میں پہلی کتاب 'تاریخ خیرآباد' جس کو مولانا عبداللہ خالد قاسمی اور دوسری کتاب 'تذکرہ علمائے دانشوران' کو مولانا ضیاء الحق قاسمی نے ترتیب دیا ہے۔ پروگرام کی صدارت حافظ عبدالحیٔ مفتاحی اور نظامت مولانا ضیاء الدین قاسمی ندوی نے کی۔ اس موقعے پر مولانا حافظ عبدالحیٔ مفتاحی نے دونوں کتابوں کے مصنفین کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ انھوں نے اہم موضوعات پر کتابیں لکھ کر ایک ایسا معلوماتی خزانہ لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے جس سے لوگ ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں گے۔ ڈاکٹر الیاس اعظمی نے کہا تاریخ خیرآباد ایک اہم اور بڑا کارنامہ ہے جس نے خیرآباد کی تاریخ وتمدن اور تہذیب کو آئندہ نسلوں کے لیے دستاویز بنا کر محفوظ کر دیا ہے۔ مولانا عبدالرب اعظمی صدر جمعیۃ علما اترپردیش نے مؤلفین کو اس عظیم کارنامے پر مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ وہ نوجوان ہیں جو اسی قصبہ کے ہیں، اسی مدرسہ منبع العلوم کے تربیت یافتہ ہیں، آج ان کا علمی و ادبی دنیا میں ایک مقام و مرتبہ ہے۔ انھوں نے خاص کر ڈاکٹر ابواللیث خیرآباد پروفیسر انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی ملیشیا کی سرگزشت حیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج پوری اسلامی دنیا میں ڈاکٹر صاحب ایک معتبر و موقر شخصیت مانے جاتے ہیں، ان کی عالمی حیثیت ہے ان کا بھی تعلق خیرآباد سے ہے۔ وہیں ڈاکٹر مولانا ابواللیث خیرآبادی نے ملیشیا سے ورچول خطاب کیا۔ اجرا کمیٹی کے ارکان نے مؤلفین کتاب اور نگراں و سرپرست اور صدر اجلاس کو مومنٹو اور شال پیش کر کے اعزاز سے نوازا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 مارچ 2022

عصری افسانچہ

نئی دھلی: گرین ٹریز پبلک اسکول شاہین باغ، جامعہ نگر میں 'آل انڈیا ادب اطفال سوسائٹی نئی دہلی' اور 'ادب جزیرہ' کے باہمی اشتراک سے ایک ادبی نشست و رسم اجرا کی تقریب کی گئی جس میں صدارت پروفیسر خالد محمود سابق صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ و سابق وائس چیئرمین اردو اکادمی، دہلی نے کی اور نظامت چشمہ فاروقی نے بحسن خوبی انجام دی۔ اس موقعے پر فلم اسکرپٹ رائٹر ممبئ انور مرزا کے 'عصری افسانچہ' کی بھی رسم اجرا عمل میں آئی۔ تقریب کے روح رواں محمد سراج عظیم جنرل سکریٹری آل انڈیا ادب اطفال سوسائٹی نے ادبی نشست کے مدعوئین کا تعارف پیش کیا اور تنظیم کے اغراض و مقاصد مختصر طور پر بیان کیے۔ اس تقریب میں مہمان خصوصی پروفیسر سلیم محی الدین پربھنی، ایڈیٹر اثبات اشعر نجمی ممبئ، مہمان اعزازی ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے رسالہ تمثیل کے ایڈیٹر رضوان الدین فاروقی نے شرکت کی۔ پروگرام کے باضابطہ آغاز سے قبل ملک کے دور دراز صوبوں سے تشریف لائے مہمان ادیبوں کا استقبال کرنے والوں میں پروفیسر یعقوب خان کشمیری، ادیب و صحافی حبیب سیفی، ادیب و نثر نگار طہ نسیم، ڈاکٹر نبیل صدیقی وغیرہ شامل تھے۔ اس موقعے پر پروفیسر خالد محمود نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ادب اطفال کے لکھنے والے ہی اردو زبان کے اصل محافظ ہیں، نئی نسل اردو زبان سیکھے گی تو اردو پھلے پھولے گی۔ اشعر نجمی ایڈیٹر اثبات نے کہا کہ ایسی ہی ادبی نشستوں میں نئے لکھنے والے پیدا ہوتے ہیں، یہ نشستیں ہی اصل میں اردو زبان و ادب کے فروغ اور اس کی ترویج کا حصہ بنتی ہیں۔ نشست میں دہلی کی معروف ادبی شخصیات ڈاکر نعیمہ جعفری پاشا، رضوان الدین فاروق، انور مرزا پروفیسر سلیم محی الدین نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر نبیل صدیقی، شارق اعجاز عباسی، ڈاکٹر منور حسن کمال، حبیب سیفی، ذاکر فیضی، عزیزہ مرزا، رضیہ حیدر خان، ترنم جہاں شبنم، سنیتا بنسل، کرشنا دامنی و دیگر شرکا نے بلا قید و بند اصناف ادب، افسانہ، افسانچہ، اشعار، نظم، طنز و مزاح کی شاعری سے محظوظ کیا۔ خیر مقدمی کلمات ناصر عزیز ایڈوکیٹ نے پیش کیے۔ اظہار تشکر وائس پریسیڈنٹ کشمیر چیمبر آل انڈیا ادب اطفال سوسائٹی پروفیسر یعقوب خان کشمیری نے ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 مارچ 2022

دھوپ کا سفر

لکھنؤ: نسیم اختر صدیقی اکادمی نے پھر ایک شخصیت سے متعارف کرایا۔ پھر محفل غزل سجی اور ہوئی ادبی گفتگو۔ موقع تھا 'دھوپ کا سفر' نامی کتاب کی رسم اجرا کا۔ فریضہ صدارت ممتاز افسانہ نگار و صحافی احمد ابراہیم علوی نے انجام دیتے ہوئے کہا کہ خواجہ توصیف الدین توصیف کا سفر دلچسپ ہے۔ ان کے اشعار فکر و فہم کے دریچے وا کرتے ہیں اور بار بار پڑھنے اور سننے کو دل آمادہ ہوتا ہے۔ ان کی شاعری سلیقہ، شعور اور ہنرمندی کی عکاس ہے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے کہا کہ خواجہ توصیف گمنام مگر نیک نام شاعر ہیں۔ ان پر کام کی مزید ضرورت ہے۔ سید اطہر نبی ایڈوکیٹ نے کہا کہ خواجہ نے الگ انداز کی غزلیں اور پرتاثیر نظمیں کہی ہیں۔ رحمت لکھنوی نے باقاعدہ مقالہ پیش کیا۔ بعدہ مشاعرے کا اہتمام وانصرام زیر صدارت رحمت لکھنوی ہوا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 27 مارچ 2022

چاند پگھلتا رہا

گلبرگہ: 29/مارچ (راست) ممتاز ادیب و شاعر سینئر صحیفہ نگار جناب حامد اکمل (ایڈیٹر روزنامہ ایقان ایکسپریس

گلبرگہ) نے نئی نسل کے ادبا اور شعرا کو مطالعے کے ذوق کو فروغ دینے کا مشورہ دیا ہے۔ ان کے بقول مطالعہ کے بغیر کوئی ادیب و شاعر اپنے منصب سے انصاف نہیں کر سکتا وہ گلبرگہ کے تاج فنکشن ہال میں ذہن جدید کے زیر اہتمام 26/مارچ کی شب منعقدہ تقریب میں نئی نسل کے نمائندہ شاعر انجینئر یوسف شیخ کے مجموعۂ کلام 'چاند پگھلتا رہا' کی رسم اجرا انجام دے رہے تھے۔

تقریب اجرا کی صدارت پروفیسر قاری عبدالحمید اکبر صدر شعبۂ اردو خواجہ بندہ نواز یونیورسٹی نے کی۔ انھوں نے ابھرتے ہوئے شاعر یوسف شیخ کے فنی محاسن اور تخلیقی صلاحیتوں کی ستائش کرتے ہوئے انھیں نئی نسل کے فنکاروں کے لیے نمونہ تقلید قرار دیا۔ اس موقعہ پر نامور وکیل اور عوامی قائد سعادت حسین استاد مرحوم کی یاد میں بین الریاستی مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر غضنفر اقبال، کرناٹک، 29 مارچ 2022

محمد ہاشم قادری کی دو کتابوں کا اجرا

جمشیدپور: ہاجرہ رضویہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ جمشید پور کے چیئرمین و مسجد ہاجرہ رضویہ کے خطیب و امام اور مشہور قلمکار الحاج حافظ محمد ہاشم قادری صدیقی مصباحی کی تصنیف کردہ دو کتابوں 'پانی بچاؤ زندگی بچاؤ' اور 'نکاح

عدیل زیدی کے شعری مجموعہ 'قرضِ جاں' پر مذاکرہ

کا اسلامی تصور' کا اجرا علمائے کرام اور پروفیسران حضرات کے ہاتھوں ہوا۔ 'پانی بچاؤ زندگی بچاؤ' کتاب میں پانی کی اہمیت وافادیت اور پانی کے بچاؤ کے طریقوں کو بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ پانی کی فضول خرچی ہرگز نہ کریں، قرآن کریم میں پانی کی بہت اہمیت بتائی گئی ہے۔ دوسری کتاب 'نکاح کا اسلامی تصور' میں ملک میں پھیلے ہوئے جہیز کے ناسور کے خلاف اور مسلمانوں کی شادیوں میں فضول خرچیوں اور بے جا رسم و رواج پر اور نکاح کے نام پر ایک سنت کے ادا کرنے پر سیکڑوں خرافات کرنے والی قوم کی ہدایت کے لیے چند سبق آموز باتیں دلنشیں انداز میں تحریر کی ہیں۔ دونوں کتابیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 28 مارچ 2022

قرضِ جاں

نئی دہلی: عدیل زیدی کا اردو سے کوئی پیشہ ورانہ تعلق نہیں ہے، ان کا اردو سے وہی رشتہ ہے جو ماں کے دودھ سے ہوتا ہے، یہی چیز میرے نزدیک ان کو محترم بناتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز دانشور پروفیسر اختر الواسع نے ہوٹل ریور ویو میں منعقد 'قرضِ جاں' پر مذاکرے کی ایک تقریب میں کیا۔ مذاکرے میں گفتگو کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر شعبہ انگریزی پروفیسر انیس الرحمٰن نے کہا کہ عدیل زیدی نے بہت خوبصورت پیکر میں شاعری کو ڈھالا ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ عدیل زیدی کی شاعری بہت معنی خیز ہے۔ حقانی القاسمی نے کہا کہ عدیل زیدی کا اردو سے معاش کا نہیں محبت کا رشتہ ہے۔ وہ تجارت سے وابستہ ہیں مگر اردو کی تجارت نہیں کرتے۔ ڈاکٹر خالد مبشر اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے عدیل زیدی کے شعری مجموعے کی ستائش کرتے ہوئے ان کے متنوع موضوعات اور اسلوب پر روشنی ڈالی اور عدیل زیدی کو موجودہ شعری منظرنامے کا ایک معتبر نام قرار دیا۔ ڈاکٹر تالیف حیدر نے اردو سے ان کے مضبوط رشتے کے حوالے سے مختصر گفتگو کی۔ ڈاکٹر سالم سلیم نے کہا کہ عدیل زیدی کی شاعری میں رشتوں کی پامالی اخلاقی زبوں حالی کا بیانیہ بہت خوبصورت ہے۔ ڈاکٹر محمد عارف استاذ ہمدرد پبلک اسکول نئی دہلی نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ قرضِ جاں ان کے جذبات اور احساسات کی بہترین نمائندہ ہے۔ 'قرضِ جاں' میں انھوں نے اپنی مٹی کا قرض ادا کیا ہے۔ تقریب کی نظامت کے فرائض معروف شاعر اور ناظم مشاعرہ معین شاداب نے انجام دیے۔ اس موقعے پر 'قرضِ جاں' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 مارچ 2022

آب آئینہ

گلبرگہ: 28 مارچ (راست) ڈاکٹر شائستہ یوسف برصغیر ہندو پاک یا بنگلہ دیش ہی کی نہیں بلکہ ساری اُردو دنیا کی ایک منفرد شاعرہ ہیں۔ دنیا بھر میں جہاں جہاں اُردو کے

تخلیق کار موجود ہیں وہاں شائستہ یوسف ایک اہم شاعرہ کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز ادیب شاعر و صحافی جناب حامد اکمل (ایڈیٹر روزنامہ ایقان ایکسپریس گلبرگہ) نے کیا وہ 23 / مارچ کو محفل نساشاخ گلبرگہ کے زیر اہتمام گلشن اطفال اسکول میں منعقدہ جلسہ میں محترمہ شائستہ یوسف کے شعری مجموعہ آب آئینہ کی رسم اجرا انجام دے رہے تھے۔

ممتاز افسانہ نگار شاعر و دانشور پروفیسر حمید سہروردی (سابق صدر شعبۂ اُردو گلبرگہ یونیورسٹی) نے اپنے صدارتی خطاب میں شائستہ یوسُف کے فکر و فن کے گہرے تجزیے کے ذریعہ اُن کے تخلیقی مقام کے تعین پر زور دیا۔ رسم اجرا کے بعد ڈاکٹر رُخسانہ سُلطانہ نے آب آئینہ کا سیر حاصل تجزیہ کیا۔ بنگلور کی مہمان ڈاکٹر فریدہ رحمت اللہ ایڈیٹر زرین شعاعیں اور ڈاکٹر زبیدہ بیگم نائب صدر محفل نسا بنگلور نے بھی آب آئینہ پر اظہار خیال کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر غضنفر اقبال، کرناٹک، 28 مارچ 2022

لفظوں کی سازش

آسنسول: 20 مارچ کو نسوانی جذبات کی بہتر ترجمانی کرنے والی منفرد لب ولہجہ کی شاعرہ شازیہ نیازی بنت تسلیم نیازی مرحوم کے اولین شعری مجموعہ 'لفظوں کی سازش' کا اجرا آسنسول کے ماہی بینکویٹ ہال میں ہوا۔ مشتاق دربھنگوی کے علاوہ الحاج نذیر احمد یوسفی، احسان ثاقب، الحاج انجینئر خورشید غنی، الحاج ڈاکٹر عشرت بیتاب، ڈاکٹر

صابرہ خاتون حنا، سید انجم رومان، سید محمد اقبال، احمد اللہ خان، ماسٹر محمد نعمت اللہ، اشرف آزاد، خورشید اقبال، شاہد برنپوری، سلیم سرفراز، وقیع منظر، پرویز عالم قاسمی و دیگر نے خصوصی طور پر شریک ہوکر محفل کے وقار میں اضافہ کیا۔ برنپور کا معروف سماجی ادبی ادارہ یوتھ سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ اس پُروقار تقریب کی صدارت بزرگ استاد محمد انوار عالم نے کی جبکہ نظامت کے فرائض جناب امتیاز احمد انصاری نے اپنے مخصوص لب ولہجہ میں انجام دیے۔

سہ ماہی عالمی فلک کے مدیر و شاعر جناب احمد نثار، مسرت حسین عازم، سردار رب نواز صارم، معراج احمد معراج نے شازیہ نیازی کے شعری مجموعے اور اُن کی شاعری پر تفصیلی گفتگو کی۔

پریس ریلیز: مشتاق دربھنگوی، دربھنگہ، 24 مارچ 2022

اردو شاعری میں محبت کا نقصان

نئی دہلی: معروف مصنف و ریختہ فاؤنڈیشن کے قومی صدر سنجیو صراف کی تحریر کردہ کتاب 'اردو شاعری میں محبت کا نقصان (لو لونگنگ لوس این اردو پوئٹری)' معروف گلوکار جاوید اختر اور معروف فلساز ڈاکٹر مظفر علی کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔ امپیسڈ رہوٹل میں منعقد تقریب میں پربھا کھیتان فاؤنڈیشن کی ایگزیکٹوٹرسٹی محترمہ اندیتا چٹرجی نے سبھی مہمانان کا تعارف کرایا اور استقبال کیا۔ بتا دیں کہ ریختہ بک کی جانب سے شائع کردہ اس کتاب میں اردو کے عظیم شاعروں کے 1200 بہترین اشعار انگریزی میں دوبارہ پیش کیے گئے ہیں۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر شریک بالی ووڈ کے نغمہ نگار جاوید اختر نے کہا کہ اردو کو سب سے زیادہ نقصان وطن تقسیم سے ہوا ہے، یقینی

طور پر اردو زبان کے ساتھ جو ظلم ہوا ہے، اسے بیان نہیں کیا جاسکتا ہے۔ سنجیو صراف نے بتایا کہ یہ کتاب خاص طور پر اردو کی شاعری کو غیر اردو قارئین کے قریب لانے کے لیے لکھی گئی ہے۔ انگریزی میں لکھی گئی اس کتاب میں اردو کے مشہور شاعروں جیسے میر، غالب، مومن، داغ، فیض اور بہت سے دوسرے بزرگ شعرا کے اشعار کی خوبصورت نقلیں شامل ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ کتاب ایک معشوق کے احساسات کے مختلف مراحل کی ایک شاعرانہ تشکیل ہے جن سے ایک عاشق گزرتا ہے۔ سنجیو صراف نے کہا کہ اردو شاعری کی صداقت، روانی اور روح کو برقرار رکھتے ہوئے اسے انگریزی میں منتقل کرنا سب سے بڑا چیلنج تھا، جسے غیر مقامی اردو قارئین کتاب پڑھتے ہوئے محسوس کر سکتے ہیں۔ ادیب و دانشور محترمہ ہما خلیل نے پروگرام کی نظامت کی۔

اہم شرکا میں پدم شری ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید، جے ایم آئی کے سابق وی سی ڈاکٹر سید شاہد مہدی، دہلی کے سابق ایل جی نجیب جنگ، سابق ایم پی شاہد صدیقی، پروفیسر مینو بخشی، جشن بہار کی روح رواں ڈاکٹر کامنا پرساد دیگر کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 مارچ 2022

شب آویز

ممبئی: 25 مارچ کو اسلام جمخانہ، ممبئی میں معروف شاعر قمر صدیقی کے شعری مجموعے 'شب آویز' کی تقریب اجرا

تزک و احتشام کے ساتھ منعقد ہوئی۔ اس تقریب کی صدارت ایس ٹی کالج کی پرنسپل ڈاکٹر مسرت صاحب علی نے فرمائی۔ کتاب کا اجرا روزنامہ 'انقلاب' کے ایڈیٹر شاہد لطیف کے ہاتھوں ہوا۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد علی پاٹنکر تھے اور ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد مہمان اعزازی تھے۔ 'شب آویز' پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر خان ذاکر نے کہا کہ قمر صدیقی کی شاعری اپنے عصر کی ترجمان ہے۔ پرنسپل ضیاء الرحمٰن انصاری نے قمر صدیقی کی ایک غزل کا تجزیہ پیش کیا اور اس کے فنی محاسن پر روشنی ڈالی۔ دانش جاوید نے قمر صدیقی کے منتخب اشعار کے حوالے سے ان کی فنی خصوصیات کو اجاگر کیا۔ حامد اقبال صدیقی نے ممبئی کے ادبی منظرنامے اور قمر صدیقی کے ادبی سفر پر مفصل گفتگو کی۔ ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد نے قمر صدیقی کی شخصیت پر دلچسپ پیرائے میں اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر قاسم امام کا خاکہ 'قمر صدیقی کو غصہ کیوں آتا ہے؟' اس ادبی جلسے کی جان تھا۔ شاہد لطیف نے قمر صدیقی کی مدیرانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے پرچے 'اردو چینل' کو ہند و پاک کا ممتاز جریدہ قرار دیا۔ ڈاکٹر محمد علی پاٹنکر نے قمر صدیقی کو مبارکباد دیتے ہوئے ایسے ادبی جلسوں کے انعقاد پر زور دیا۔ ڈاکٹر مسرت صاحب علی نے قمر صدیقی سے اپنے گھریلو مراسم کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ مرحوم پروفیسر صاحب علی قمر صدیقی کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ انھوں نے قمر صدیقی کو صاحب اسلوب شاعر قرار دیا۔ فاروق سید کی شاندار نظامت سے یہ تقریب مزید پرشکوہ ہوگئی۔ اس تقریب میں شہر ممبئی کے علمی، ادبی اور سماجی حلقے کی ممتاز شخصیات نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: محمد علیم اسماعیل (اسسٹنٹ ٹیچر)، وارڈ نمبر 15، نندورا، مہاراشٹر، 31 مارچ 2022

'ہم عصر شعری جہات' کی رسم رونمائی

اڈیشہ: معروف شاعر و ناقد بدر محمدی کی تازہ تصنیف 'ہم عصر

شعری جہات' کا اجرا مدرسہ مدینۃ العلم کٹک (اڈیشہ) کے وسیع و عریض ہال میں ڈاکٹر سید مشیر عالم سکریٹری اڈیشہ اردو اکیڈمی کے ہاتھوں ہوا۔ کٹک کے فعال ادبی ادارہ 'فیضان ادب' کے زیر اہتمام منعقدہ اس بزم کی صدارت نامور شاعر و ادیب سعید رحمانی نے فرمائی۔ افتتاحی کلمات ناظم تقریب سید نورالہی ناطق نے پیش کیے۔ سعید رحمانی نے اپنے صدارتی خطبے میں بدر محمدی کو ہمہ جہت شخصیت کا مالک قرار دیا اور ان کی تنقید میں غیر جانبداری اور میانہ روی کی حمایت کی۔ سید مشیر عالم نے بدر محمدی کی تحریروں سے متعارف و متاثر ہونے کا برملا اظہار کیا اور انھیں باہنر قلم کار بتایا۔ راونشا یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر محمد رحمت اللہ اشرف نے شعر و سخن کی تفہیم و تعبیر میں بدر محمدی کے بالغ نظر ہونے کی دلیل دی اور 'ہم عصر شعری جہات' کو نئی نسل میں شعر فہمی کا شعور پیدا کرنے میں معاون ہونے کی وکالت کی۔ محمد مجیب اللہ خاں پرواز ٹکنیکل ڈائریکٹر ایس سی آئی بھونیشور نے 'ہم عصر شعری جہات' کی اشاعت کا خیر مقدم کرتے ہوئے بدر محمدی کو مبارک باد دی اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ سید نفیس دسنوی مدیر ادبی محاذ نے بہار کی کتاب کا اجرا اڈیشہ میں ہونے کو مستحسن قدم قرار دیتے ہوئے بدر محمدی کا رسالہ ادبی محاذ اور کٹک سے دیرینہ رشتہ ہونے کی وضاحت کی۔ عبدالمتین جامی نے کہا کہ بدر محمدی تنقید نگاری کی طرف زیادہ توجہ دیں تاکہ مستقبل کا قاری ان کو شاعر نہیں بلکہ ایک صاحب طرز نقاد کی حیثیت سے پہچانے۔ بدر محمدی نے اس تقریب رونمائی کو اپنی کتاب پر نقد و تبصرہ کا آغاز بتاتے ہوئے اس سلسلہ کے جاری رہنے کا استقبال کیا۔

'فیضان ادب' کے سکریٹری نورالہی ناطق کے اظہار تشکر پر رسم رونمائی کی یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

پریس ریلیز: سکریٹری، فیضان ادب، اڈیشہ، 30 مارچ 2022

وفیات

پروفیسر سیما صغیر

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ اردو کی سینئر فیکلٹی ممبر پروفیسر سیما صغیر کا 28 مارچ کو نئی دہلی کے ایک اسپتال میں مختصر علالت کے بعد انتقال

ہوگیا۔ اپنی زندگی اور کیریئر میں پروفیسر سیما صغیر ڈسپلن اور نظم و ضبط کی پابند رہیں۔ انھوں نے پندرہ سے زائد کتابیں تصنیف کیں اور معیاری جرائد میں ان کے متعدد مقالے شائع ہوئے۔ پروفیسر سیما کو یوپی اردو اکادمی ایوارڈ (2004)، یوپی اردو اکادمی ایوارڈ (2010)، بہار اردو اکادمی ایوارڈ (2011)، یوپی اردو اکادمی ایوارڈ (2012)، ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی۔ اردو ادب ایوارڈ (2013)، قرۃ العین حیدر ایوارڈ بنگلور (2014) اور یوپی اردو اکادمی کی طرف سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ (2016) سے نوازا گیا۔ انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور یو جی سی کے متعدد پروجیکٹوں پر کام کیا اور اے ایم یو گزٹ اور آرٹس فیکلٹی جرنل سے وابستہ رہیں۔ اردو افسانہ اور ترجمان کے بنیادی موضوعات تھے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 29 مارچ 2022

ساغر وارثی

شاہجہاں پور: معروف بزرگ شاعر ساغر وارثی نے مختصر علالت کے بعد 4 اپریل 2022 کو اپنے گھر میں آخری سانس لی۔ ان کی عمر 84 برس تھی۔ انھیں ایمن زئی

جلال نگر واقع پشتینی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ارشاد احمد خاں ساغر وارثی گزشتہ 6 ماہ سے علیل تھے۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ روشن آرا بیگم، تین بیٹے پرویز احمد، گلریز احمد، دلشاد احمد اور ایک شادی شدہ بیٹی فرح جبیں وغیرہ ہیں۔ ساغر وارثی یکم اگست 1938 کو ایمن زئی جلال نگر میں ضمیر احمد خاں کے یہاں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز 1956 میں کیا۔ وہ استاد عابد بینائی کے شاگرد تھے۔ ساغر وارثی کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے جن میں غزل کا مجموعہ ارتقا (2002)، آہنگ دل (2006)، نعتیہ مجموعہ نغمہ و نور (2015)، غزل کا مجموعہ فکر کی نقاشیاں (2018)، دیوان تنظیم حروف (2021) وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے کئی شاعروں کی غزلوں کے مجموعے بھی مرتب کیے۔ دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو کے علاوہ انھوں نے کئی آل انڈیا مشاعرے بھی پڑھے۔ اردو ادب کے لیے ان کی خدمات پر کئی تنظیموں کی جانب سے انھیں اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ ان کے انتقال پر شہر کی مقتدر شخصیات نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ روزنامہ'اودھ نامہ'5اپریل2022

سالک دھامپوری

نئی دھلی: دہلی کے بزرگ صحافی اور شاعر سالک دھامپوری کا دل کا دورہ پڑنے سے 11 اپریل کو الشفا

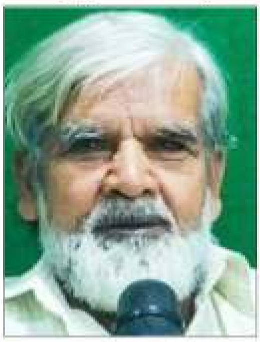

اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 72 سال کے تھے اور بہت سرگرم تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ 3 بیٹے اور 2 بیٹیاں شامل ہیں۔ تدفین شاہین باغ قبرستان میں 12 اپریل کو بعد نماز فجر ہوئی۔ سالک صاحب تقریباً 50 برسوں سے مسلسل لکھنے پڑھنے میں مصروف تھے۔ انھوں نے ہندی ہفت روزہ 'کانتی' سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا اور پوری زندگی ترجمہ نگاری، مراسلہ نگاری اور دیگر اصناف میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ انھوں نے درجنوں کتابوں کے ترجمے کیے اور کئی کتابیں تصنیف بھی کیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں چاندی بہو، چائے کی دوکان، آخری خط (شعری مجموعہ)، کلام زنداں (شعری مجموعہ)، سگریٹ کی راکھ (افسانے)، میڈم انجیلا، تکلف برطرف، جرم وسزا اور تفتیش، علاج و معالجہ وغیرہ شامل ہیں۔ سالک صاحب کا تعلق دھامپور (بجنور) سے تھا اور زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گزارا۔ وہ ایک عرصے تک ممبئی میں بھی رہے۔ ان کا اصل نام مشتاق احمد تھا اور سالک دھامپوری کے قلمی نام سے لکھتے رہے۔ سالک صاحب بزم احباب نامی انجمن کے سربراہ تھے اور ہر ماہ شعری نشست کرتے تھے۔ ان کی رحلت پر ڈاکٹر سید احمد خاں، سید منصور آغا، حامد علی اختر، سید اظہار احمد، جلال الدین اسلم، مودود صدیقی، ظفر انور، مولانا رحمت اللہ فاروقی، اشہر ہاشمی، محمد وسیم وغیرہ نے مرحوم کے درجات کی بلندی اور پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی۔ روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 12 اپریل 2022

ڈاکٹر سلیم قریشی

دیوبند: پہلی بھیت کی مشہور و معروف شخصیت، افسانہ نگار، شاعر، مدیر تحفظ ادبی معمے ڈاکٹر سلیم قریشی کا 65 سال کی عمر میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ نماز جنازہ بعد نماز عصر ادا کی گئی جس میں سیکڑوں افراد نے شرکت کی۔ تدفین قریشی قبرستان میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین لڑکیاں اور دو لڑکے محمد جازیب قریشی، اور محمد مائل قریشی شامل ہیں۔ ڈاکٹر سلیم قریشی انتہائی خوش مزاج اور ملنسار انسان تھے۔ وہ کئی ایک مذہبی، سماجی، اور ادبی تنظیموں سے وابستہ تھے۔ مرحوم کے انتقال کی خبر عام ہوتے ہی بلا لحاظ مذہب و ملت عوام، مذہبی، سماجی، ادبی، سیاسی جماعتوں سے وابستہ افراد نے مرحوم کے مکان پہنچ کر افراد خاندان کو تعزیت پیش کی۔

روزنامہ'اخبار مشرق' دہلی، 20 مارچ 2022

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................. بتاریخ.................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زر تعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

خسرو شناسی

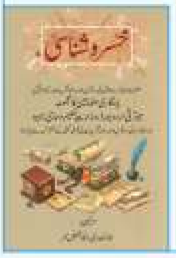

مرتبین: ظ انصاری، ابوالفیض سحر

پانچویں طباعت: 2021

صفحات: 347

قیمت 180 روپے

قطب مشتری

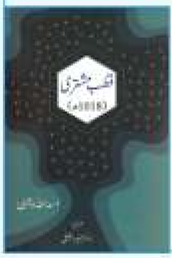

مرتبہ: ڈاکٹر حمیرا جلیلی

دوسری اشاعت: 2021

صفحات: 247

قیمت: 130 روپے

صارفیت اور صارفین کو قانونی تحفظ مع نظائر عدالت

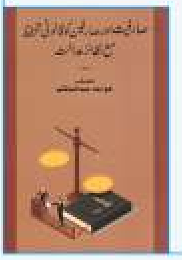

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 138

قیمت: 90 روپے

کشف الاعداد

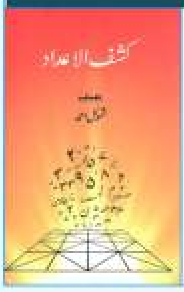

مصنف: شمول احمد

پہلی طباعت: 2021

صفحات: 190

قیمت: 110 روپے

علم البیان: اقسام نثر و نظم

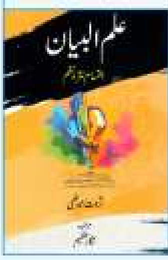

مصنف: ثروت میرٹھی، مرتب: نگار عظیم

پہلی طباعت: 2021

صفحات: 258

قیمت: 140 روپے

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

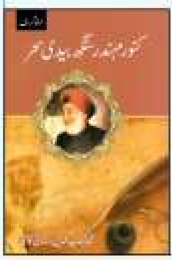

مصنف: محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 135

قیمت: 85 روپے

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم

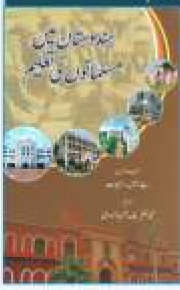

ترتیب و تدوین: جے ایس راجپوت

مترجم: محمد غطریف شہباز ندوی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 484، قیمت 245 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, मई-२०२२,वर्ष:२४, अंक:५
URDU DUNIYA Monthly, May-2022, Vol.24, Issue:05
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/04/2022
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in، پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6